بسم الله الرحمن الرحیم

فَمَن يُرِدِ اللّٰهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ
لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ
عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ
مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ:

پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کردیتا ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار کردیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہورہا ہو، وہ اسی طرح بے ایمانوں پر ان کی کثافت کو مسلط کردیتا ہے اور یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے آیات کو مفصل طور پر بیان کردیا ہے۔

(سورہ انعام: آیات ۱۲۵، ۱۲۶)

اسلامی علوم و معارف اور علمی و ثقافتی افکار و عقائد کا ترجمان

شمارہ: ۲۳۸، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۵ / ستمبر ۲۰۱۶ء تا اگست ۲۰۱۷ء

ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
فون : ۳۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲ ، فیکس : ۲۳۳۸۷۵۴۷
ichdelhi@gmail.com
http://newdelhi.icro.ir

شمارہ: ۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸/ ستمبر ۲۰۱۶ء تا اگست ۲۰۱۷ء

مشاورین علمی:

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر سید علی محمد نقوی

چیف ایڈیٹر	:	ڈاکٹر علی دہگاہی
ایڈیٹر	:	پروفیسر سید اختر مہدی رضوی
جوائنٹ ایڈیٹر	:	خان محمد صادق جونپوری
صفحہ آرائی	:	قاری محمد یاسین
تزئین جلد	:	عائشہ فوزیہ
ناظر اشاعت	:	حارث منصور
پریس	:	الفا آرٹ، نوئیڈا، یو۔پی۔

ISSN: 2349 – 0950

صرف غیر مطبوعہ مقالہ ہی ارسال فرمائیں۔

اگر ممکن ہو تو مقالہ، بذریعہ ای میل ichdelhi@gmail.com ارسال فرمائیں۔

مقالہ، ایران کلچر ہاؤس کے پتہ پر پوسٹ بھی کر سکتے ہیں۔

مقالے کی اشاعت کے لئے ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

مقالہ نگار افراد کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

اداریہ		۱
انسان کی حقیقت، عقل اور وحی کی نظر سے	مؤلف: ڈاکٹر محمد حسین طالبی مترجم: شبیہ عباس خان	۴
انسانی ارادہ اور مستقبل کی تعمیر۔ قرآن کے تناظر میں	مؤلف: فرشتہ سقا مترجم: مولانا نثار احمد زین پوری	۲۲
انسان اور خدا کا رابطہ، نہج البلاغہ کی رو سے	مؤلف: ڈاکٹر بخش علی قنبری مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی	۴۶
پیغمبر اکرمؐ کی محبوبیت	مؤلف: سید محمد طباطبائی مترجم: مولانا مقداد حیدر روحانی	۶۵
پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغی راہ و روش	مؤلف: ہاشم محمدی مترجم: ڈاکٹر مولانا رضوان حیدر	۸۸
پیغمبر عظیم الشانؐ کی انتظامی خصوصیات	مؤلف: ڈاکٹر جعفر تابان مترجم: مولانا جعفر زیدی	۱۱۷
مرسلِ اعظمؐ کی حکومتی روش میں پیغمبرانہ اقدار کی تجلی	مؤلف: محمد علی برزگر مترجم: مولانا نثار احمد زین پوری	۱۳۹
کرامت انسانی کے موانع و مشکلات کا تجزیہ	مؤلف: ڈاکٹر صمد بہروز مترجم: مولانا جعفر زیدی	۱۶۴
سماجی برائیوں پر قابو پانے میں مراتب دینداری کا رول۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں	مؤلف: ڈاکٹر محمد باقر آخوندی مترجم: مولانا عابد رضا نوشاد	۱۸۸

دین اسلام کا سیاسی رخ اور گلوبلائزیشن	مؤلف: ڈاکٹر غلام رضا بھروز لک مترجم: مولانا مہدی باقر خان	۲۱۶
اسلام میں دین و سیاست کا باہمی رابطہ	مؤلف: مہدی زحمتکش مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی	۲۳۵
ولایت فقیہ پر مبنی حکومت، امام خمینی کی نظر میں	مؤلف: محمد مہدی رشادی مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی	۲۶۴
روحانیت و معنویت، دور حاضر کی مشترکہ ضرورت	مؤلف: ڈاکٹر محسن قمی مترجم: مولانا احمد رضا رضوی زرارہ	۲۸۲
روحانیت و معنویت عصر حاضر کے گمشدہ عنصر	مؤلف: ڈاکٹر شمس اللہ مریجی مترجم: مولانا منہال حسین خیرآبادی	۲۸۶
روحانیت و سکون، دکھی دنیا کے لئے ادیان کا تحفہ	مؤلف: ڈاکٹر محمد جواد صاحبی مترجم: مولانا منہال حسین خیرآبادی	۳۰۴
ہستی کا تقدس، حکمت اسلامی کے آئینہ میں	مؤلف: ڈاکٹر حمید پارسانیا مترجم: مولانا منہال حسین خیرآبادی	۳۱۷
حکمت اور امام علی رضاؑ	پروفیسر سید فرمان حسین	۳۲۳
حکمت اور گفتگو۔ امام رضاؑ کی نظر میں	پروفیسر غلام یحیٰ انجم	۳۳۲
خواتین کے حقوق عامہ	ڈاکٹر طیب رضا	۳۴۲

نظم

انکسار حیدر کا	احمد شہریار	۳۵۳
نبی کی خو ہیں علی	شاہد کمال	۳۵۴
غدیر میں	مہدی باقر معراج	۳۵۶

اداریہ

جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ مادی لحاظ سے یقیناً انتہائی ترقی یافتہ دور ہے لیکن تمام مادی سہولتوں کے باوجود، آج کی انسانی زندگی سکون و چین سے عاری نظر آتی ہے۔ معاشرے میں ایک قسم کی بے چینی ہے اور انسان اپنی حیات میں ایک طرح کا خلا محسوس کر رہا ہے۔

اگر ماہرین نفسیات کی مانیں تو ساری پریشانیاں، مذہب سے دوری اور ذات حق تعالی پر بھروسہ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ آج کا انسان اپنی حقیقت کو بھول گیا ہے اور مقصد خلقت کو فراموش کر چکا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی غرض خلقت کیا ہے۔

انسان اگر اپنی حقیقت کو پہچان لے تو اس کی ساری پریشانیاں خود بخود دور ہو جائیں۔ انسان کے پاس عقل نظری اور عملی دونوں ہوتی ہے اور حقیقی انسان بننے کے لئے عقل عملی کو بروئے کار لانا ضروری ہے ورنہ قرآنی تعبیر کے مطابق وہ انسانی مقام و مرتبت سے تنزل کرتے ہوئے چوپایوں کی طرح ہو جائے گا۔ اس اہم موضوع کو ہم نے "انسان کی حقیقت، عقل و وحی کی نظر سے" مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مستقبل اور اس کی تعمیر میں انسان کا کردار ایک اہم موضوع ہے اور یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا انسان کے مستقبل کی تعمیر اس کے اپنے ارادے کی بنیاد پر ہوتی ہے یا اللہ تعالی کا ارادہ اور جبر اصل بنیاد ہے۔ قرآنی آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے البتہ اللہ تعالی اپنے ارادہ اور مشیت کی بنیاد پر انسانوں کی آرزوؤں کے پورے ہونے میں مدد کرتا ہے۔ ان ساری باتوں کو ہم نے "انسانی ارادہ اور مستقبل کی تعمیر۔ قرآن کے تناظر میں" مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خدا سے رابطہ ٹوٹ جانے کے سبب انسان تنہائی اور خالی پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان اور خدا کے رابطہ کی ماہیت کیا ہے اور ہم کس طرح اللہ تعالی سے تعلق استوار کر سکتے ہیں؟ اس مسئلہ کا سب سے بہتر جواب ہمیں نہج البلاغہ میں مل سکتا ہے۔ ہم نے " انسان اور خدا کا رابطہ، نہج البلاغہ کی رو سے" مقالہ میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس رابطہ کے مختلف اقسام کی تشریح کی ہے۔

انسان کو اپنی زندگی میں ہمیشہ سے کسی ایسے آئیڈیل کی ضرورت رہی ہے جس کے نقش قدم پر چل کر وہ معنوی اور مادی ترقی کے مراحل طے کرسکے۔قرآن نے رسول خداؐ کو اسوہ حسنہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے رسول خدا کی اطاعت کو معیار محبت قرار دیا ہے۔آپؐ کی ذات گرامی قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ اور چراغ ہدایت ہے جن کے نقش قدم پر چل کر ہم اپنے روحانی سفر کو کامیابی کے ساتھ طے کرسکتے ہیں۔ ان تمام موضوعات کا ہم نے "پیغمبر اکرمؐ کی محبوبیت" مقالہ میں جائزہ لیا ہے۔

کسی مشن کو آگے بڑھانے میں تبلیغ کااہم رول ہوتا ہے ۔انبیاء اور اولیائے الٰہی نے معارف دین کی تبلیغ کے لئے بڑی جانفشانیاں کی ہیں ۔ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے تمام اعمال وافعال اور سیرت و کردار کے ہر پہلو کو تبلیغی راہ وروش کے عنوان سے دیکھا جاتا ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں آپؐ کے ذریعہ استعمال کئے گئے طریقوں کو جاننا بہت ضروری ہے تاکہ ہم بھی آپؐ کے نقش قدم پر چل کر آپ کے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔ "پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغی راہ وروش" میں ہم نے انہیں موضوعات کااحاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشاورت و ہم فکری اسلامی حکومت کا بنیادی عنصر اور اسلامی معاشرہ کااہم ستون ہے۔قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس اہم موضوع کی وضاحت کی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت سے بھی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مشورہ کی ثقافت، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام مراحل میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اسی سیرت کو مد نظر رکھتے ہوئے امام خمینیؒ نے بھی حکومتی فیصلوں میں عوامی رائے کو معیار قرار دیا ہے اور عوام کی موجودگی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ہم نے ان تمام باتوں کا "پیغمبر عظیم الشان کی انتظامی خصوصیات" میں تجزیہ کیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کا ہر پہلو اسوہ حسنہ اور بہترین نمونہ ہے۔مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد آپؐ نے کس طرح معاشرہ کے مختلف طبقات کو یکجا کیا اور ان میں اتحاد و اخوت کا جذبہ پیدا کرکے ان کو ایک مقصد کی طرف گامزن کیا، یہ اپنی جگہ پر بہت اہم موضوع ہے۔ عدل پروری، جہاد و ظلم ستیزی، تعصب و نسل پرستی کے خلاف جنگ، عام لوگوں سے محبت ، تعلیم وتربیت کااہتمام وغیرہ جیسے امور آپ کی حکومتی سیرت کااہم جزء ہیں۔ہم نے "مرسل اعظمؐ کی حکومتی روش میں پیغمبرانہ اقدار کی تجلی" میں انہیں امور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

انسانی معاشرہ میں سماجی برائیاں ہمیشہ سے دانشوروں اور مصلحین کے لئے ایک مسئلہ رہی ہیں، انہوں نے اس مسئلہ پر تحقیقات کی ہے اور اس پر قابو پانے کے لئے مختلف طریقے بتائے ہیں لیکن سماجی برائیوں پر قابو پانے کا سب سے بہترین طریقہ دین کی پابندی ہے۔ تجربات اور تحقیقات کے مطابق جن کی تائید قرآنی آیات سے بھی ہوتی ہے، جتنی زیادہ دین کی پابندی ہوتی ہے، سماجی برائیوں میں بھی اتنی ہی کمی آتی ہے اور اس کے برخلاف دین کی پابندی میں کمی کے ساتھ ساتھ سماجی برائیوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دینداری کس طرح ہمیں برائیوں سے روکتی ہے۔ اس کا جواب ہم نے "سماجی برائیوں پر قابو پانے میں مراتب دینداری کا رول ـ قرآنی تعلیمات کی روشنی" مقالہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حکومت و سیاست بھی انسانی حیات کا اہم پہلو ہے اور اسی کے ذریعہ معاشرہ اور فرد میں نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں مختلف سیاسی نظام رائج ہیں اور ہر ایک کا یہ دعوی ہے کہ وہی سب سے بہتر طریقہ حیات پیش کرسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نظام انسانی معاشرہ اور عوام کی ضرورتیں پوری نہیں کرسکتا اور ایک عرصہ کے بعد ہر سیاسی نظام کے نقائص اور کمزوریاں سامنے آجاتی ہیں، لیکن اسلام ایسا جامع اور مدون دستور زندگی پیش کرتا ہے جس میں انسان و معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسلام صرف چند عبادتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ انسانی حیات کے جملہ گوشوں پر محیط ہے چنانچہ حکومت و سیاست بھی اسلامی تعلیمات کا اہم باب ہے۔

اسلام کی اسی جامعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے امام خمینیؒ نے نظریہ ولایت فقیہ کو جو اس وقت تک صرف نظریہ کی حد تک تھا، عوام کی مدد سے عملی طور پر نافذ کیا اور یہ ثابت کردیا کہ اسلام ہی وہ مکتب فکر ہے جو عوامی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں ایک بہتر معنوی و مادی زندگی کی طرف گامزن کرسکتا ہے۔ ان موضوعات کو ہم نے "دین اسلام کا سیاسی رخ اور گلوبلائزیشن"، "اسلام میں دین و سیاست کا باہمی رابطہ" اور "ولایت فقیہ پر مبنی حکومت امام خمینی کی نظر میں" مقالوں میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فصلنامہ راہ اسلام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ معارف اسلامی اور دینی تعلیمات کو بہتر سے بہتر انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرے تاکہ ہم سب مل کر اسلامی تعلیمات کے سایہ میں ایک باوقار زندگی اور اچھے معاشرہ کی تعمیر کرسکیں۔ امید ہے یہ اس راہ میں ایک مثبت اور تعمیری قدم ہوگا۔

انسان کی حقیقت، عقل اور وحی کی نظر سے

مؤلف: ڈاکٹر محمد حسین طالبی
مترجم: شبیہ عباس خان

انسان کی حقیقت کے سلسلے میں دانشوروں کے درمیان ایک مشہور عقیدہ یہ ہے کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ اُن کے نزدیک نظریاتی سمجھ، یعنی سوچنے اور سمجھنے کی قوت ہی ناطقیت ہے لہٰذا مشہور نظریہ کے مطابق، انسان ایک ایسا عاقل حیوان ہے جس میں سوچنے کی قوت ہے۔ اس مقالے کا ہدف اس بات کو ثابت کرنا ہے کہ انسانیت عام تصورات کو درک کرنے کہ ساتھ ساتھ خدا پر ایمان اور اس سے رابطہ میں بھی مضمر ہے۔ اس دعوے کی وضاحت قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں کی گئ ہے۔ للذا نہ صرف نظریاتی سمجھ کا ہونا، بلکہ عقل عملی اور اس کی پیروی بھی انسانی وجود کا جز ہیں۔ عقل عملی کی پیروی کرنے والا نیک کام انجام دیتا ہے اور نیک کام کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ قرب الٰہی مقصود نظر ہو۔ انسانیت ایک تشکیکی اور سیال حقیقت ہے۔ اس وجہ سے انسان فطری لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

انسان کی شناخت بشری زندگی کے ان اہم مسائل میں سے ہے جو عرصے سے دنیا کے دانشوروں کی توجہ کا مرکز ہے۔ انسان کی معرفت کی اہمیت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ بعض روایات میں اس معرفت کو خدائے متعال کی معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

انسانی ماہیت کی حقیقی شناخت کے لئے علم انسان شناسی سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ علم انسان شناسی سے متعلق مختلف علوم میں گفتگو ہوتی ہے۔ علم فلسفہ میں نفس سے متعلق موضوعات پر بحث ہوتی ہے۔ علم عرفان میں انسان اور انسان کے مقام اور مرتبے کے متعلق گفتگو ہوتی ہے۔ علم دین راہ اور رہنماشناسی کے متعلق اور علوم تجربی عوام شناسی سے متعلق ہیں۔ ان سارے علوم میں انسان اور انسان کے کسی ایک پہلو کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے لہٰذا انسان شناسی کی مختلف قسمیں ہیں جسے مختلف طریقوں سے سمجھا جا سکتا ہے:

❖ انسان شناسی فلسفی جو عقلی روش سے ممکن ہے۔
❖ انسان شناسی دینی جو نقلی روش یعنی کتاب وسنت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔
❖ انسان شناسی عرفانی جس کا ذریعہ کشف و شہود ہے۔
❖ انسان شناسی تجربی جس میں تجربہ کے ذریعے تحقیق کی جاتی ہے۔

چونکہ اس تحریر کا موضوع حقیقت انسان کو عقل اور وحی کی نظر سے طے کرنا ہے لہٰذا سب سے پہلے فلسفیانہ انسان شناسی کی تعلیمات سے مدد لیتے ہوئے بحث کا آغاز ہوا ہے اور انسان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں فلسفیانہ گفتگو کے دوران قرآنی شواہد کا بھی ذکر ہوا ہے۔ اس تحریر کے قارئین قرآن وسنت کی جانب سے عقلی مباحث کی تائید کو قبول کرتے ہیں لہٰذا اس مقالہ میں فلسفی اور دینی انسان شناسی کے امتزاج پر توجہ دی گئی ہے۔

فلسفی اور مذہبی انسان شناسی

فلسفی - مذہبی انسان شناسی ، فلسفی انسان شناسی اور مذہبی انسان شناسی کا مجموعہ ہے۔ فلسفی انسان شناسی سے مراد انسان کے سلسلے میں وہ عقلی معارف ہیں جو علم فلسفہ کی مدد سے عقلی دلائل کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان سے متعلق وہ معارف جو قرآن وسنت میں موجود نصوص سے حاصل ہوتے ہیں مذہبی انسان شناسی کہلاتے ہیں۔

صدیوں سے مسلمان فلسفیوں نے اپنے فلسفی آثار میں انسان کے نفس اور اس کی حقیقت اور قوّت و خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہاں پر اُنہیں مباحث پر اکتفا کی جائے گی جو ہمارے موضوع سے مرتبط ہیں۔ فلسفیانہ انسان شناسی سے مرتبط مواد میں تحقیق کا جو طریقہ ہے وہ استدلالی ہے۔ اسی طرح انسان کے سلسلے میں آنے والے مباحث کو مقبول بنانے اور اُن پر عمل درآمد کرنے کے لئے قرآن کریم کی آیات سے اثبات کے ساتھ ، مذہبی انسان شناسی میں نقلی طریقے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

انسان کی حقیقت عقل کی نظر سے

مسلمان فلسفیوں اور منطقیوں نے اپنے آثار میں انسان کی حقیقت کو پہچنوانے کے سلسلے میں زبردست کوشش کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے انسان کو حیوان ناطق بتایا ہے۔ حیوان بمعنی ایک نمو کرنے

والا جسم جس میں حواس ہیں اور اپنے ارادے سے حرکت کرنے کی اس میں صلاحیت ہے[۱]۔ ناطق سے مراد ایسا موجود جو مفاہیم کلی کو درک کر سکے لہٰذا حیوان ناطق ایک ایسا حیوان ہے جس میں کلیات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

ناطق یعنی عاقل

منطق دانوں نے ناطق کو انسان کی فصل بتایا ہے۔ فصل کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک قسم کے جنس کو دوسرے قسم کی اجناس سے الگ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان اپنے کچھ افعال میں حیوانات جیسا ہے کیونکہ انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک قسم کا حیوان ہے۔ کھانا پینا، اپنی خواہش سے حرکت، اور کلی علوم کا مالک ہونا اُن صفات میں سے ہیں جو انسان اور دوسرے قسم کے حیوانات میں مشترک ہیں۔ انسان کو دوسرے حیوانات سے جدا کرنے کے لئے اس کی حیوانیت کے ساتھ ساتھ اس کی سب سے ممتاز خصوصیت کو بھی اس کی تعریف میں شامل کرنا ہوگا۔ انسان کی اس ممتاز خصوصیت کو نطق کہتے ہیں۔ انسان صفت ناطقیت سے ہی دوسرے حیوانات سے الگ ہوتا ہے۔ لفظ ناطق ایک عربی لفظ ہے جو نطق سے لیا گیا ہے۔ لفظ نطق دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، بولنا اور سوچنا۔

ابن سینا اپنی کتاب شفا میں کہتے ہیں: نطق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اندرونی نطق جو وہی سوچ ہے اور انسان کے باطن میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔

۲۔ بیرونی نطق جو ظاہری تکلم ہے[۲]۔

سید شریف جرجانی بھی اپنی کتاب شرح شمسیہ کے حاشیے میں نطق کے دونوں معانی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس نکتے کا اضافہ کرتے ہیں کہ باطنی نطق معقولات کو سمجھنا اور درک کرنا ہے (نہ صرف معقولات پر سوچنا)[۳] لہٰذا حیوان ناطق ایک ایسا سمجھدار حیوان ہے جو معقولات اور کلی مفاہیم کو درک کر سکے۔ انسان کی اس طاقت کو جس سے وہ کلی مفاہیم کو درک کر پاتا ہے عقل کہتے ہیں۔ اس حساب سے انسان کو عاقل حیوان کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ جرجانی، سید شریف، الحاشیہ علی شرح الشمسیہ، ص ۴۷

۲۔ ابن سینا، حسین، الشفاء المنطق، ص ۲۰

۳۔ الحاشیہ علی شرح الشمسیہ، ص ۱۲

نتیجہ یہ کہ اوپر بیان کردہ تعریف کے حساب سے انسان کی ذاتی خاصیت تعقل یعنی مفاہیم کلی کو درک کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن مصنف کی نظر میں انسان کی یہ تعریف مکمل تعریف نہیں ہے۔ انسان کے عاقل ہونے کا ایک اور مطلب بھی ہے جو مفاہیم کلی کو درک کرنے والے معنی کو مکمل کرتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے جو اس مقالے کے اہداف میں سے ایک ہے، عقل کے معنی اور اس کے اقسام کو سمجھنا ہوگا ہے۔

عقل انسانی کا مفہوم اور اس کے اقسام

لغت میں عقل کے معنی ایک ایسی رسّی ہے جسے اونٹ کے گھٹنوں میں باندھ دیا جاتا ہے جس سے اس کے من مانے حرکات کو روکا جاسکے۔ انسان کی عقل بھی ایک غیر مادی حقیقت ہے جو اُس کے من مانے اور بہکانے والے حرکات کو روکنے کے لیے خلق ہوئی ہے اور اس کو فکری تاریکیوں اور عملی برائیوں سے بچاتی ہے۔

عقل دو قسم کی ہے : عقل نظری اور عقل عملی۔ مسلمان دانشوروں کے درمیان عقل کی اِن دونوں قسموں کی کارآمدگی کے فرق کو لے کر اختلاف ہے۔ عقل عملی میں درک کی صلاحیت بھی ہے اور ارادہ شدہ عمل بھی انجام دیتی ہے۔ اس لحاظ سے انسان جو ایک حیوان عاقل ہے، اپنی عقل عملی کے ذریعے ضروری اور غیر ضروری قسم کے کُلّی مفاہیم کو درک کر سکتا ہے اور اسی طرح اس سے نیک کام انجام دینے کا اور برے کاموں سے پرہیز کا ارادہ بھی سرزد ہو سکتا ہے اور اپنے اعضاء وجوارح کو حکم دے سکتا ہے کہ نیک کام کریں اور بُرے افعال سے خود کو بچائیں۔

نتیجہ یہ کہ انسان حیوان ناطق ہے اور حیوان ناطق کا مطلب حیوان عاقل ہوتا ہے۔ حیوان عاقل ایسا حیوان ہے جو عقل عملی اور عقل نظری دونوں کا مالک ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان حیوان بھی ہے اور ناطق (عاقل) بھی ہے یعنی ایک باارادہ متحرک جسم کا نام بھی ہے اور عقل نظری (موجود اور غیر موجود قسم کے کلی مفاہیم کو درک کرنے کی قوت) کا بھی مالک ہے اور ساتھ ہی عقل عملی (ضروری اور غیر ضروری قسم کے کلی مفاہیم کو درک کرنے کی قوت اور اُس کے ساتھ نیک کام انجام دینے اور برے امور سے پرہیز کے ارادے کی قوت اور اسی کے ساتھ اپنے ارادے کے تکمیل کے لئے اعضاء وجوارح کو حکم دینے کی طاقت) کا بھی مالک ہے لہٰذا انسان کی حقیقت کی اس تعریف کے مطابق بشر کی حقیقت مختلف اجزا کا مرکب

ہے۔ بشر کا مطلب ایک عاقل (نظری اور عقلی) باارادہ متحرک جسم ہے۔ یہ حقیقت مرکب اپنے کسی ایک جز کی کمی سے مکمل ہونے سے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر اس دنیا میں انسان کے جسم ہونے کو اس کی حقیقت سے نکال دیں تو بھی انسانیت باقی نہیں رہے گی، اگر عقل عملی یا اس کے کچھ حصے کو انسان سے سلب کرلیں تو بھی جس موجود میں عقل عملی کی کمی ہو یا اِس کے کچھ حصے کی کمی ہو تو وہ موجود بھی انسان نہ رہ جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں جس طرح اگر انسان سے حیوانیت یا اس کی حیوانیت کے کچھ حصے کو سلب کرلیں تو وہ موجود انسان نہ رہ جائے گا، اسی طرح انسان سے اس کی عقل کے پورے یا کچھ حصے کا فقدان اس کی انسانیت کے سلب ہونے کا باعث ہوگا لہٰذا آسانی سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ عقل عملی (اور اس سے پیروی) کا ہونا انسانی حقیقت کے لئے امتیازی شئے ہے۔ مختصر اور واضح بیان میں انسانیت کی حد نصاب عقل عملی کی پیروی ہے۔ مکمل عقل عملی یا اس کے کچھ حصے کا فقدان جہل کے برابر ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو بھی عقل عملی کی پیروی نہیں کرتا وہ جاہل ہے اور انسانیت کی حد نصاب کے لائق نہیں ہے، اگرچہ ممکن ہے عقل نظری کے عالی مراتب پر فائز ہو اور مختلف علوم میں صاحب نظر ہو۔

اس بنا پر حکمت متعالیہ میں اس بات پر تاکید کی جاتی ہے کی انسانوں کی نفوس ناطقہ موت سے پہلے مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ انسان کی نیت اور اس کے اعمال نفس کے کردار، مزاج اور اوصاف پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر انسان کی نیّات اور افعال نیک ہوں تو رفتہ رفتہ انسان بھی ملکات حسنہ کا مالک اور اخلاقی فضائل سے سرشار ہو جاتا ہے۔ جب انسان کا نفس نیک صفات کا مالک ہو جاتا ہے، تو بدن پر جو ہمیشہ اس کے ساتھ اور اس نفس کی حقیقت کو دکھانے والا ہوتا ہے، سیدھا اثر ڈالتا ہے اور انسان کی باطنی شکل اور اس کی حقیقت جو کہ ظاہری بدن کے ذریعے سے ہی قابل رویت ہے اور بھی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان ملکات حسنہ اور اخلاقی فضائل کے حصول کے بعد پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت حقیقت کا مالک ہو جاتا ہے۔[1]

اسی طرح اگر انسان نیک نیت اور نیک فعل انجام دینے کی جگہ ناپاک نیت اور برے کام انجام دے تو اُس کا بھی نفس ناطقہ پر نامناسب اثر پڑتا ہے اور بے حیائی میں تبدیل ہونے سے حقارت حقیقت انسان کا مظہر بن جاتی ہے اور ایسے نفس والے بدن کی شکل عام بدن کی شکل سے بھی زیادہ بدصورت ہو

۱۔ صدرالدین شیرازی، محمد، المبدا والمعاد، ص ۵۵۳-۵۵۲

جاتی ہے۔ یہاں تک کی انسان کی مثالی بدن کی شکل حیوان میں تبدیل ہو جاتی ہے اور رذائل کے زیر اثر وہ حیوان سے بھی بدتر موجود میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انسان نیک کاموں سے مسلسل دوری اور اپنی عقل عملی کے احکام سے بغاوت کرکے حیوان میں یا اُس سے بھی برے موجود میں تبدیل ہو جاتا ہے لہٰذا عقل عملی کی پیروی انسان کی حقیقت اور فطرت میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

انسان کی حقیقت وحی کی نظر سے

خدا ہر چیز کا خالق ہے من جملہ انسان کے۔ اشیاء کا خالق اپنے تمام موجودات پر وجودی احاطہ رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ علم انسان شناسی میں انسان اور دیگر مخلوقات کی تعریف کے لئے سب سے درست اور سب سے زیادہ قابل اعتماد ہوتے ہیں۔

قرآن کی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کچھ انسان بعض برے کام انجام دینے کی وجہ سے اپنی عقل عملی کھو دیتے ہیں اور انسانیت کے زمرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نما موجودات حیوانی سیرت یا حیوان سے بھی بدتر سیرت کے مالک ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے پاس آنکھ، کان اور دماغ ہوتا ہے اور اچھائی اور برائی کو بخوبی پہچانتے ہیں (یعنی اُن کی عقل نظری درک کرتی ہے) لیکن چونکہ ان اچھائیوں پر وہ عمل نہیں کرتے اور برائیوں سے دوری اختیار نہیں کرتے لہٰذا ان کی عقل عملی ضعیف ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی انسانی شناخت کھو دیتے ہیں اور چونکہ ان کے پاس عقل عملی نہیں ہوتی لہٰذا حیوانات کہ زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی نگاہ میں ایسے لوگ اندھے، بہرے اور عقل عملی سے یتیم ہوتے ہیں۔ قرآن کریم بعض انسان نما انسانوں کو اس طرح پہچنواتا ہے۔

کچھ آیات کہتی ہیں کہ بعض افراد عقل نظری ہونے کے باوجود اور اتمام حجت کے بعد بھی یعنی خدا کے دین کی حقانیت سے واقف ہونے کے بعد بھی کیونکہ خدا اور اس کے پیغمبر کی پیروی کے بجائے اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں اور خدا کی آیات کو جھٹلاتے اور نکارتے ہیں, لہٰذا انسانوں کے زمرے سے خارج ہیں۔ یہ افراد منزلت کے اعتبار سے حیوان یا حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ اس قسم کی آیات مندرجہ ذیل ہیں:

سورہ جمعہ کی آیت نمبر پانچ نے صدر اسلام کے یہودی علماء کو جو احکام الٰہی پر پابند نہیں تھے اور خدا کی آیات کو جھٹلاتے تھے، اُن گدھوں جیسا بتایا ہے جو بہت ساری کتابیں حمل کرتے ہیں۔ یہ افراد

پورے یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ کی رسالت اور آپ کا جاودانہ معجزہ یعنی قرآن بر حق ہے لیکن چونکہ ان کا انکار کیا اور جھٹلایا اس لئے اِنسانیت کے زمرے سے خارج ہو گئے۔

اسی طرح سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ اور ۱۷۶ میں بلعم باعورا نام کے یہودی عالم کے بارے میں بتایا گیا ہے جو حضرت موسیٰ کے دور میں زندگی بسر کرتا تھا اور شروع میں درگاہ الٰہی سے وابستہ افراد میں سے تھا لیکن چونکہ کچھ عرصے بعد استکبار اور دنیا طلبی کی وجہ سے خدا کے دین سے ہٹ گیا اور اس کا انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ سے سرکشی کرنے لگا لہٰذا قرآن کریم نے اس کو (اور اس کے جیسے لوگوں کو) جو خدا کی معرفت ہوتے ہوئے اس کا انکار کرتے ہیں، کتّا بتایا ہے:

> "اور انہیں اس شخص کی خبر سنایئے جس کو ہم نے آیتیں عطا کی اور پھر وہ ان سے بالکل الگ ہو گیا اور شیطان نے اس کا پیچھا پکڑ لیا تو وہ گمراہوں میں ہو گیا (۱۷۵) اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان ہی آیتوں کے سبب بلند کر دیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے خواہشات کی پیروی اختیار کر لی تو اب اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالتا ہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے ہے، یہ اس قوم کی مثال ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی تو اب آپ ان قصوں کو بیان کریں کہ شاید یہ غور و فکر کرنے لگیں۔"

یہ جو ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی مثال کتے جیسی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دائرہ انسانیت سے خارج ہو گیا ہے کیونکہ اس نے اپنی عقل عملی کی پیروی نہیں کی اور نیک کام (جو عقل عملی کا حکم تھا) انجام نہیں دیا بلکہ اپنی ہوائے نفس کی پیروی کیا۔

اسی لئے خداوند سبحان سورہ فرقان میں ارشاد فرماتا ہے:

> "کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا ہے؟ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے، ہرگز نہیں، یہ سب بس حیوانوں جیسے ہیں اور بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔"[۱]

سورہ اعراف کی آیات میں آگے اس طرح بیان ہوا ہے:

۱۔ سورہ فرقان، آیات ۴۳-۴۴

”اور یقیناً ہم نے جن وانس کی ایک کثیر تعداد کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل (عقل) ہے مگر سمجھتے نہیں ہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں۔ یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اور یہی لوگ اصل میں غافل لوگ ہیں (یعنی خدا سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور اس سے غافل ہوگئے ہیں ۔[۱] “

” جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی, ایسے بہرے اور گونگے ہیں جو تاریکی میں بسر کر رہے ہیں ۔[۲]“

” اے ایمان والوں خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور ان سے روگردانی نہ کرو جب کی تم سُن بھی رہے ہو اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ کچھ نہیں سن رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک بدترین, زمین پر چلنے والے وہ گونگے اور بہرے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ۔ “

خدائے خالق ایسے موجودات کو اندھا بہرا اور فہم و درک میں عاجز جانتا ہے، حالانکہ ایسے افراد کے پاس بظاہر دیکھنے اور سننے کی قوت اور عقل نظری ہے۔ خدا کی مراد یہ نہیں ہے کہ یہ افراد عقل نظری میں ضعف کی وجہ سے حق کو پہچاننے سے قاصر ہیں اور اس کی پیروی نہیں کرتے۔ اسی لئے اگلی آیت میں جہنم میں ڈالنا ایسے لوگوں کی جزا بتائی گئی ہے۔ حالانکہ یقیناً جس کی عقل نظری صحیح سے نہیں پہچان پاتی اور اس کا علم کم ہے وہ انسانیت سے خارج اور جہنم میں داخل نہیں ہے لہٰذا یہ پتہ چلتا ہے کہ ان آیات میں عقل سے مراد عقل عملی ہے۔

قرآن کریم کی کچھ آیات نے ان لوگوں کو جنہوں نے آگاہانہ طور پر اس کے دین سے منہ موڑا اور ساتھ اس سے جنگ کرتے ہیں اور خدا پر جھوٹے بہتان لگاتے ہیں، خدا کے دین کی تحریف کرتے ہیں اور لوگوں پر سعادت کے راستوں کو بند کرتے ہیں اور انہیں بھی اپنی طرح گمراہی تک لے جاتے ہیں، جانوروں سے بھی بدتر بتایا ہے۔ ان میں سے کچھ آیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹

۲۔ سورہ انعام، آیت ۳۹

"خدا اُن کافروں کے اعمال برباد کر دیگا جنہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا"۔ [۱]

"جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ (دنیا) کا مزہ اٹھا رہے ہیں اور جانوروں کی طرح کھا رہے ہیں، جب کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ [۲]

"اُن سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اپنے خدا پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں؟ یہ لوگ اپنے خدا کے سامنے پیش کئے جائیں گے تو گواہ (پیغمبر اور فرشتے) گواہی دیں گے کہ ان لوگوں نے اپنے خدا پر جھوٹے الزام لگائے، خدا کی لعنت ہو ظالموں پر جو (لوگوں) کو راہ خدا سے روکتے ہیں اور اس میں تحریف پیدا کرتے ہیں اور (یقیناً) یہ لوگ آخرت کے بارے میں کافر ہیں۔ یہ لوگ نہ روئے زمین پر خدا کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ ہی خدا کے سوا کوئی ناصر پائیں گے۔ خدا کا عذاب ان پر دوگنا کر دیا جائے گا، ان میں کبھی بھی سننے کی صلاحیت نہیں تھی اور کبھی بھی حق کو نہیں دیکھا" [۳]

اسی طرح، قرآن کریم کی بعض آیات نے پیغمبر اسلام (ص) سے عہد شکنی کو بھی مقام انسانیت سے تنزل کا سبب بتایا ہے۔ خدائے متعال سورہ انفال کی آیت نمبر ۵۵-۵۶ میں ارشاد فرماتا ہے:

" زمین پر چلنے والوں میں بدترین افراد وہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کر لیا، اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ وہ جن کے ساتھ آپ نے عہد کیا ہے وہ ہر بار اپنا عہد توڑتے ہیں اور اس کام سے باز نہیں آتے۔"

نتیجہ یہ کہ عقل اور وحی کے حساب سے انسان ہونے کے لئے عقل نظری کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ عقل عملی کا ہونا یعنی اس کی پیروی بھی انسانی جوہر کے اہم اجزا میں سے ہے۔ اگر عقل عملی کا کام اچھے اور برے کے درک تک ہی ہوتا تو خدائے متعال قرآن کریم میں اِن انسان نما حیوانات کو جن پر حجت پوری ہو چکی ہے اور اچھی طرح سے اچھائی اور برائی کو سمجھتے ہیں، بے عقل کیوں کہا ہے؟

۱۔ سورہ محمد، آیت ۱

۲۔ سورہ محمد، آیت ۱۲

۳۔ سورہ ھود، آیات 18-20

اسی طرح، ان عقلانی اور وحیانی دلائل سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ انسان عقل کی نظر سے اور قرآن کی نگاہ میں ایسا موجود ہے جس کی عقل عملی بھی کام کرے۔ چنانچہ جس کے پاس عقل عملی نہ ہو یا واضح الفاظ میں اگر کوئی اپنی عقل عملی کی پیروی نہ کرے تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شخص انسانی حقیقت اور شناخت کا مالک ہے لہٰذا اس نکتے سے عیاں ہے کہ عقل عملی کی پیروی انسان ہونے کا سب سے اہم جز ہے اور کسی میں یہ اہم جز نہ ہو تو وہ انسان نہیں ہے۔

مختصراً، اب تک جو گزرا اس سے یہ نتیجہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ حیوان ناطق کا مطلب حیوان عاقل ہے۔ عقل ایسی حقیقت ہے جسے خدا نے انسان کو عطا کی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے وہ سعادت تک پہنچ سکے لہٰذا عقل دو قسم کے فعل انجام دیتی ہے۔ عقل نظری کا کام حاضر و غائب سے مرتبط امور کو درک کرنا ہے، چاہے وہ آشکار ہوں یا تفکر سے حاصل ہوں۔ انسان کی عقل عملی کی شان یہ ہے کے پہلے وہ ضروری و غیر ضروری امور سے مرتبط امور کو درک کرے اور پھر انسان میں ارادہ پیدا کرکے اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دے کہ وہ نیک کام انجام دے اور برے کاموں سے بچے۔ اگر کسی کی عقل عملی اس کے لئے فائدہ مند واقع نہ ہو تو وہ انسانیت کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی موجود میں عقل نظری یا حیوانیت نہ ہو، تو بھی وہ انسان نہیں ہے۔

انسانوں میں فطری اختلاف

عقل عملی کی پیروی اور اس کے نتیجے میں کمالات کے حصول کے درجات مختلف ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بعض افراد دوسروں سے زیادہ اپنی عقل عملی کی پیروی کرتے ہیں اور نتیجے میں اور بھی زیادہ اخلاقی کمالات کے مالک ہو جاتے ہیں کیوں کہ کمالات کی مقدار انسانیت کے مقدار پر سیدھا اثر انداز ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان ہونے کے مختلف درجات ہیں، اس بنا پر سبھی انسان، انسان ہونے میں ایک دوسرے کے برابر نہیں ہیں بلکہ کچھ، دوسروں سے زیادہ انسان ہیں۔ لوگ جس قدر انسان کامل یعنی انسان کے لئے تصور کئے جانے والے رفیع ترین مقام سے نزدیک تر ہونگے، اُن کی انسانیت ایسے لوگوں سے زیادہ ہوگی جو انسان کامل کے مقام سے زیادہ دوری پر ہیں لہٰذا انسان ہونا تشکیکی امر ہے۔ اس کا آغاز عقل عملی کی پیروی کرکے انسانیت کے رفیع ترین درجہ یعنی انسان کامل تک پہنچنا ہے۔ حقیقی انسان وہ ہے جو مسلسل اِن دو لفظوں کے درمیان چلتا رہے۔ چونکہ انسان کا وجود ہر لحظہ جوہری حرکت میں ہے لہٰذا اس ذاتی حرکت کے مختلف مواقع سے بشر کا ذہن

جن فطرتوں کو خلاصہ کرتا ہے وہ ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوتی بلکہ بشری کمالات کے مالک ہونے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جس قدر انسان اپنی عقل عملی کی زیادہ پیروی کرے گا اتنا ہی زیادہ کمال حاصل کرے گا اور انسان کامل کے درجے سے جو کہ انسانیت کا نقط عروج ہے، قریب ہوگا اور انسان کامل سے شبیہ ہوگا۔ انسان کامل کے والا مقام کو قرآنی ادبیات میں خلیفہ الٰہی کا مقام کہا گیا ہے۔ اس والا مقام پر پہنچنا ہر انسان کے لئے نقطہ اوج سعادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرتاً یعنی اپنی ذات سے سبھی انسان اس والا مقام پر پہنچنے کے خواہاں ہیں۔

نیک کام کی تعریف

اب تک ہم نے جانا کہ عقل عملی انسان ہونے کا معیار ہے جس کا کام نیک کاموں کا حکم دینا اور بُرے کاموں سے پرہیز کرانا ہے۔ اسی طرح ہم نے یہ بھی پایا کہ عقل عملی کی پیروی یعنی نیک کام انجام دینا اور بُرے کاموں سے اجتناب کرنا انسان کی انسانیت کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ اب ہم کو یہ جاننا ہوگا کہ کن کاموں کو نیک کام کہا جاتا ہے، جس کو انجام دے کر انسان انسانیت کے معیار تک پہنچ سکتا ہے یا اپنی انسانیت میں اور اضافہ کر سکتا ہے۔

جواب میں کہنا ہوگا کہ نیک کام وہ ہیں جن کا کمال کے ساتھ ذاتی تعلق ہو۔ یوں کہا جائے کہ وہ کام نیک ہے جس کو انجام دینا عامل کے کمال میں اضافہ ہونے کا سبب بنے یا اس میں موجودہ کمال کی حفاظت کا موجب ہو لہٰذا یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ خدائے متعال بطور لا محدود سبھی کمالات کا واحد ذریعہ ہے، دنیا میں موجود ہر قسم کے کمال کا اِس سے براہ راست رابطہ ہے۔ واضح تر الفاظ میں جہاں کہیں بھی مخلوقات میں کمال موجود ہے وہ کمال خدا کی طرف سے مخلوق کو عطا ہوا ہے، اب چاہے مخلوق نے خود اپنی کوشش اور اختیار سے خدا کی اس کی عطا کے لئے پس منظر تیار کیا ہو یعنی نیک کام انجام دے کر خدا سے کمال حاصل کیا ہو یا یہ کی پیدائشی طور پر خدا کی طرف سے اس کو یہ کمال عطا ہوا ہو، لہٰذا نیک عمل ایک ارادی عمل ہے جسے موجود مختار (باارادہ اور باشعور) خدا سے قریب ہونے کے لئے انجام دیتا ہے۔ بس اسی صورت میں وہ عمل کمال کا حامل ہوگا۔ نتیجتاً نیک کام وہ ہے جو کمال کا حامل (حسن فعلی) ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے عامل کی نیت بھی قرب الٰہی (حسن فاعلی) ہو۔

لازم بہ ذکر ہے کہ اعمال میں حسن فعلی اور حسن فاعلی مسلسل ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں کیونکہ کسی بھی کام کا حسن فعلی وہ کمال ہے جو اس کام میں ہے اور چونکہ عمل کے ذریعے سے کمال تک پہنچنے کا راستہ کمالات کا منبع یعنی خدائے متعال سے ارتباط سے ہی ممکن ہے لہٰذا عمل اسی صورت میں حسن فعلی یعنی کمال و خیر سے آراستہ ہوگا جب وہ عمل حسن فاعلی یعنی خدا کے لئے انجام دینے کی نیت کے ہمراہ ہو۔

اس بنا پر اگر کسی عمل میں حسن فاعلی نہ ہو یعنی کام کو انجام دیتے وقت عامل کو خدا (کمالات کا منبع) سے قرب مقصود نہ ہو، یا اُس عمل میں بذات خود حسن فعلی نہ ہو، یعنی اس کے ساتھ کوئی کمال نہ ہو جیسے کے ظلم کی طرح کوئی بُرا کام ہو تو وہ عمل نیک نہیں ہوگا لہٰذا ہر نیک کام میں حسن فعلی اور حسن فاعلی دونوں پہلوؤں کا ہونا لازمی ہے، ورنہ وہ کام نیک شمار نہیں ہوگا اور اس کام کا عامل اس کام کو انجام دینے کی وجہ سے نیکوکار نہیں مانا جائے گا اور چونکہ عقل عملی کی پیروی یعنی عمل میں عاقل ہونا، نیک کام انجام دینے پر مشروط ہے، لہٰذا ایسے عمل کو انجام دینا جس کے فاعل کی نیت قرب الٰہی نہ ہو (حسن فاعلی نہ پایا جائے) تو وہ کام بھی عقل عملی کی پیروی نہیں شمار ہوگا۔

خدا پر ایمان، عقل عملی اور نیک کام انجام دینے کے لئے شرط

اب تک کے بیان سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ عقل عملی کا ایک کام نیک اعمال انجام دینا ہے، اور نیک کام کی دو شرطوں میں سے ایک شرط اُس کام کا خدا کی رضا یعنی اُس سے تقرب کے لئے انجام دینا ہے لہٰذا یہ بات پتہ چلتی ہے کہ نیک کام کے عامل کو خدا کے وجود پر اعتقاد لازمی ہے، کیونکہ بغیر اعتقاد کے کسی کام کو اس سے تقرب کے لئے انجام نہیں دیا جاسکتا ہے۔

اس بنا پر اگر کوئی خدا کے وجود کی دلیل کو جانتا ہے، یعنی باوجود اس کے کہ اُس کی عقل نظری کام کر رہی ہے وہ خدا پر بالکل اعتقاد نہ رکھتا ہو یا اگر خدا کے وجود پر اعتقاد ہے لیکن پھر بھی وہ اپنا کوئی بھی کام خدا سے تقرب کی غرض سے انجام نہ دے تو اس نے عقل عملی کی پیروی نہیں کی ہے لہٰذا وہ مکمل طور پر عاقل نہیں ہے اور وہ شخص انسان کامل کا مصداق نہیں ہے کیونکہ ناطقیت کی فصل یعنی عقل نظری کا مالک ہونا اور عقل عملی کی پیروی کرنا، پوری طرح سے اُس میں موجود نہیں ہے، اگرچہ ناطقیت کے کچھ اثرات جیسے کہ سننے اور سمجھنے کی قوت اُس میں موجود ہوں۔ ایسے لوگ حیوان سے برتر اور انسان سے پست تر ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کچھ دینی متون میں مثلاً قرآن کریم کی بعض آیات میں ایسے لوگوں کو تو حیوانات

سے بھی پست تر بتایا گیا ہے کیونکہ باوجود اس کہ کہ اُن کے پاس عقلی عمل کی پیروی کرنے کی قوت تھی، انہوں نے اس کی پیروی نہیں کی۔ حاصل یہ کہ منطق اور قرآن کی رو سے وجود خدا پر اعتقاد اور اس سے ارتباط دونوں ہماری انسانی فطرت میں نہاں ہے۔

انسانی حقیقت کے تشکیکی درجات

ہم نے جانا کہ عقل عملی کا مالک ہونا یعنی اس کی پیروی کرنا انسان کی فصل ہے۔ اسی طرح یہ بھی جانا کہ خدائے متعال کے وجود پر اعتقاد اور خیر کے منبع سے ارتباط، انسانیت سے کبھی نہ جُدا ہونے والی حیثیت ہے لہٰذا جتنا زیادہ انسان اپنی عقل عملی کی پیروی کرے گا یعنی اپنے اعمال کو خدا سے تقرب کے ہدف سے انجام دے گا اتنا ہی زیادہ وہ انسانیت کا مالک ہوگا اور انسان کامل کے اور بھی قریب ہوتا جائے گا۔ اس کے بر عکس جتنا انسان نیک کاموں میں سستی کرے گا یعنی خدا سے کم ارتباط برقرار کرے گا اتنا ہی اس کی انسانیت انسان کامل کے مقام سے دور ہوتی جائے گی اور نتیجے میں اپنی انسانیت میں ضعیف ہوتا جائے گا لہٰذا انسانیت کی حقیقت کے مختلف مراتب ہیں۔ انسانیت کے درجات کا انسان کے کمالات کے ساتھ سیدھا رابطہ ہے۔ انسان کے کمالات عقل عملی کی پیروی اور نیک کام انجام دینے کی روشنی میں حاصل ہوتے ہیں۔ جتنا انسان خدا سے زیادہ ارتباط رکھے گا اتنا ہی زیادہ اس سے شبیہ ہوگا اور انسانیت میں زیادہ مکمل ہوگا اور انسانی کمالات کے رفیع تر درجات حاصل کرے گا۔

انسانیت کا اول درجہ انسان کامل کا مقام ہے۔ اس مقام پر انسان کامل اپنی زندگی میں سب سے زیادہ توجہ خدائے متعال کی طرف دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ اور فلسفیوں کی زبان میں انسانیت ایک تشکیکی امر ہے جس کا سب سے نچلا درجہ اپنی زندگی میں خدا کے ساتھ ضعیف ترین ارتباط برقرار کرنے میں ہے اور سب سے اونچا درجہ اپنی طول حیات میں خدا کے ساتھ قوی ترین ارتباط قائم رکھنے میں ہے لہٰذا انسانیت کا معیار خدا پر اعتقاد اور اس سے رابطے میں مضمر ہے۔

مسلمان عرفا اور حتی غیر مسلم عرفا نے یاد خدا کو خدا سے تقرب کا ایک راستہ بتایا ہے۔ مسلمان دانشوروں بلکہ عیسائی سنتوں جیسے کہ ٹھامس آکویناس نے (قرون وسطیٰ کے برجستہ ترین عیسائی عرفا، فلسفیوں اور متکلموں کی پہلی صف میں تھے) انسان کے لئے سب سے اہم خیر کو خدا کے بارے میں تامل اور تفکر بتایا ہے۔ جب انسان خدا سے زیادہ شبیہ ہوگا یعنی اور بھی زیادہ کمالات کا مالک ہوگا تو اس کی عظمت اور

کرامت بڑھ جائے گی۔ اس لئے خدائے متعال سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۳ میں ارشاد فرماتا ہے : بے شک خداکے نزدیک سب سے زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، للذا انسان جتنا زیادہ اپنی عقل عملی کی پیروی کرے گا اتنا ہی اس کی انسانیت میں اضافہ ہو گا۔

اب تک جو بیان ہوا اس سے ایک فلسفی نکتہ یہ ملتا ہے کہ انسانوں کی فطرت ایک جیسی نہیں ہے۔ کیوں کہ فطرت، ذہن کے باہر کے وجود کا ذہنی سانچہ ہے اور انسانوں کی فطرت کے بھی ان کے وجود کے مانند مختلف درجات ہیں۔

واضح تر الفاظ میں انسانیت مثالی فطرت نہیں ہے جس میں افراد ایک دوسرے کے مساوی ہوں، بلکہ جنسی فطرت ہے جس کی انسانوں کے تعداد کے برابر مختلف قسمیں ہیں کیوں کہ اس کا وجود جس کی منشاء حصولِ فطرت ہے، کا درجہ دوسرے انسانوں کے وجودی درجے سے الگ ہے۔ اعلی انسانی کمالات انسان کو اس کی عقل عملی کی پیروی کے مقدار کے بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثالی فطرت انسان کی جنس کی ہے جو کہ ہر فرد میں موجود ہوتی ہے۔ در حقیقت ہر فرد کے اخلاقی کمالات کا درجہ، انسانی جنس کے مثالی فطرت میں اس کے مرتبے کا تخمینہ ہے۔

انسانیت کے دائرے سے خروج

ہم نے جانا کہ خدا پر اعتقاد اور اس سے ارتباط انسانیت کے مرکز میں موجود ہے لیکن کیا ان میں سے کوئی بھی جو خدا کے وجود پر ایمان نہیں رکھتا، انسان نہیں ہے ؟ اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی یاد دہانی مفید ہو گی کہ جیسا کہ کہا گیا، کسی بھی کام کو انجام دینے کی لئے خدا سے تقرب کی نیت (ارادہ) اور حضرتِ کاملِ مطلق سے کمالات حاصل کرنا ہر انسان کی عقل عملی کے فرائض میں سے ہے۔ اگر کوئی خدا کو نہ پہچانے تو اس سے رابطہ برقرار نہیں کر سکتا اور اس سے تقرب کی نیت سے اپنے کام انجام نہیں دے سکتا۔ جس قدر عامل خدا یعنی کامل مطلق کو زیادہ پہچانے گا اتنا ہی وہ خود کو اس کے جیسا بنانا چاہے گا اور اس سے قرب چاہے گا للذا ان دانشمندوں کے نیک کاموں کی قیمت جو خدا کو زیادہ اور بہتر پہچانتے ہیں، دوسرے لوگوں کے نیک کاموں سے زیادہ ہے۔

اب ممکن ہے کہ ذاتی یا خاص سماجی حالات موجود نہ ہونے کی وجہ سے انسان خدا کے وجود یا اس کے کمالی اوصاف کو نہ یہ کہ جان بوجھ کر بلکہ سہواً نہ پہچان پائے اور ان پر معتقد نہ ہو۔ مثلاً کوئی انسان دنیا

کے کسی دور دراز کونے میں جیسے کہ قطب شمالی یا افریقہ کے دور دراز جنگلوں میں زندگی بسر کرتا ہو اور دینی معلومات تک اس کی رسائی نہ ہو لیکن وہ خدا کے وجود کا انکار نہ کرے اور اپنی فطرت کی آواز پر کہ خدائے متعال سبھی انسانوں کی ذات میں موجود ہے لبیک کہے۔ کیا اس صورتحال میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسان دائرۂ انسانیت سے خارج ہے؟ اسلامی تعلیمات نے ایسے لوگوں کو فکری مستضعف کے نام سے یاد کیا ہے۔ عقل اور وحی کی نگاہ میں اور اب تک جو انسان کی تعریف بیان کی گئی اس کی بنا پر کیا فکری مستضعف خدا سے رابطہ نہ ہونے کے باوجود انسان ہے؟ اس کا جواب ہے کہ فکری مستضعف دائرۂ انسانیت سے خارج نہیں ہونگے، کیونکہ وہ اپنی ضد سے خدا کے وجود کا انکار نہیں کرتے بلکہ ان کی توجہ اپنی فطرت کی آواز پر ہوتی ہے اور وہ لوگ اپنے عقلی دریافتوں اور بنیادی اخلاقی اصول جو خدائے متعال نے ان کی فطرت میں خلق کیا ہے جیسے کہ عدالت کی حمایت اور ظلم پر اعتراض وغیرہ پر پابند ہیں۔

خدائے متعال نے اپنے وجود کی طرف تمایل کو انسانوں کی فطرت میں قرار دیا ہے اور ان کو اسی کے ساتھ خلق کیا ہے۔ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں انسان کے اس فطری میل کو بیان کیا گیا ہے۔

مستضعف (فکری) انسان اپنی فطرت کی پابندی کی وجہ سے اور اپنے ضمیر کے احترام کی غرض سے نیک کام انجام دے سکتا ہے اور اس طرح سے وہ کسی حد تک فطری تکامل کو حاصل کر سکتا ہے لہٰذا فقط وہی لوگ دائرہ انسانیت سے خارج ہونگے جو یہ جان کر کہ اس دنیا کا کوئی خدا ہے اور وہ تمام نیکیوں کا منبع ہے، پھر بھی اس کا انکار کرتے ہیں۔ ایسے افراد کی نفسانی خواہشات اس قدر قوی ہوتی ہے کہ ان کی پیروی کی وجہ سے ان کی فطرت دب جاتی ہے، نتیجے میں وہ لوگ اپنی فطرت کی آواز پر لبیک نہیں کہہ پاتے کیوں کہ در حقیقت وہ اپنی فطرت کی آواز کو سن ہی نہیں پاتے۔ کان ہونے کے باوجود حق کی آواز کو نہیں سن پاتے، آنکھ ہوتے ہوئے بھی حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے۔ کیوں؟ کیوں کہ انہوں نے اپنی فطرت کو دبا کر رکھا ہے۔ خدائے متعال نے قرآن میں کئی مقامات پر اس واقعیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۱ میں ارشاد ہوتا ہے :

> " کافر ایسے ہی ہیں کہ جب وہ بلائے جائیں گے تو ان کو آواز اور پکار کے سوا کچھ نہیں سنائی دیگا، یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور کچھ سمجھتے نہیں ہیں۔"

یہ لوگ خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے اور خود کو خدا کے قریب نہیں لے جاتے اور اس کے کمالات سے مستفید نہیں ہوتے چونکہ ایسے لوگوں کے اعمال میں حسن فاعلی اور نتیجے میں حسن فعلی نہیں ہوتا للذا کسی بھی کام کو انجام دینے کی وجہ سے وہ کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتے. کیوں کہ خدائے واحد سبھی کمالات کا منبع ہے اور یہ افراد نہ صرف اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے بلکہ اس کے وجود کا انکار بھی کرتے ہیں۔ ایسے افراد کے سارے اعمال اگرچہ لوگوں کی نظر میں نیک ہوں لیکن چونکہ حقیقت میں نیک نہیں ہوتے یعنی ان میں حسن فعلی اور حسن فاعلی نہیں ہوتا اس لئے ان کی کوئی قیمت اور ثواب بھی نہیں ہوتا یعنی کمال سے سرشار نہیں ہوتے۔

خدائے متعال سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۱۸ میں ایسے افراد کے اعمال کے سلسلے میں فرماتا ہے:

> "ایسے لوگوں کے اعمال جو خدا کا انکار کرتے ہیں (بغیر کسی دلیل کے) اس راکھ کے مانند ہے جس کو آندھیوں میں جمع کرنا چاہ رہے ہوں (وہ ہرگز اس کے ایک ذرہ کو بھی جمع نہیں کر پائیں گے) اور ان کی طرف سے خدا کا بنا دلیل کے انکار دور نہ ہونے والی گمراہی ہے۔"

نتیجہ یہ کہ وہ لوگ جن پر حجت پوری ہو چکی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ خدا ہے لیکن ان سب کے باوجود اس کا انکار کرتے ہیں اور اسی لئے اس خدا سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے. ان کے کام نیک نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے کاموں میں حسن فاعلی (یعنی خدا سے قرب کا ہدف) اور نتیجے میں حسن فعلی (یعنی کمال لانے والا) نہیں ہوتا اس حساب سے ایسے لوگ عقل عملی کی پیروی نہیں کرتے اور اسی لئے دائرے انسانیت سے باہر رہ جاتے ہیں کیونکہ عقل عملی کی پیروی، انسان کی تعریف حیوان ناطق (عاقل) کے مطابق انسان کی ماہیت کا جز ہے۔

انسان شناسی فلسفی سے استفادہ کرتے ہوئے اس بات کو بخوبی پیش کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی ذات کا اہم رکن خدا پر ایمان اور اس سے ارتباط ہے۔ انسان کی تعریف حیوان ناطق کے طور پر کرنے کا مطلب یہی ہے کہ انسان نہ صرف عقل نظری کا مالک ہو یعنی کلی مفاہیم کو درک کرنے میں قادر ہو، بلکہ عقل عملی کی بھی پیروی کرے۔ عقل عملی کی پیروی کرنے کی شرط یہ ہے خدا پر اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اس سے رابطہ بھی رکھے۔ دوسرے الفاظ میں انسان ایک خدا پرست حیوان ہے۔ قرآنی تعلیمات بھی ان عقلی اصول و نظریات کی باقاعدہ تائید کرتی ہیں۔ اس بنا پر فلسفی اور دینی انسان شناسی کے علم کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی ماہیت و حقیقت کو طے کرنے میں عقل اور وحی ایک ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسان کی انسانیت کے مختلف مراتب ہیں کیونکہ اپنے کمالات کے مرتبے میں جو خدا سے رابطے کے مقدار پر منحصر ہے،. برابر نہیں ہیں لہذا انسانیت کا وجود ایک تشکیکی امر ہے اس لئے انسانوں کی ماہیت بھی ایک جیسی نہیں ہے۔

اس بحث کے آثار و نتائج انسان شناسانہ بحثوں کے مختلف علوم میں ظاہر ہونگے۔ بطور مثال علم فلسفہ حقوق میں حقوق انسانی کی مباحث میں اس مقالے کی اسلامی تعلیمات سے بخوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں پر اس بحث کے کچھ آثار مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ انسانی حقوق صرف حقیقی انسان کا حق ہے جو حقیقتاً انسان نہ ہو وہ انسانی حقوق کا مالک ہونے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سبھی لوگ جو بظاہر انسان ہیں انسانی حقوق کے مستحق ہیں۔

۲۔ انسانی حقوق کے فوائد سبھی انسانوں کے لئے مساوی نہیں ہیں کیونکہ جو کوئی دوسرے سے زیادہ انسان ہوگا، اس کے انسانی حقوق بھی زیادہ ہونگے۔

۳۔ حکومت کی ذمہ داری ان انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے میں زیادہ ہے جن میں انسانیت زیادہ ہے۔

منابع و ماخذ:

- قرآن کریم
- ابن سینا حسین، الشفاء المنطق، مکتبہ آیت اللہ المرعشی النجفی، ج۱، قم، ۱۴۰۵
- جرجانی، سید شریف، الحاشیہ علی شرح الشمسیہ، کتاب فروشی علمیہ اسلامیہ، تہران، ۱۳۰۴
- صدر الدین شیرازی، محمد، المبدا و المعاد، ج ۲، بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۱

❖ طالبی، محمد حسین ، علی، ترادف علوم انسانی باعلوم انسان ساز، معرفت فلسفی، ش ۴۱ ، ۱۳۹۲
❖ عبودیت، عبد الرسول، مرکز تحقیق وتوسعہ علوم انسانی، و موسسہ آموزشی وپژوھشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۱
❖ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، انتشارات علمیہ اسلامیہ، تہران، ۱۳۶۴
❖ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، موسسہ الوفاء، بیروت، ۱۴۰۴
❖Staley,kevin,"New Natural Law, Old Natural Law or The Same Natural Law ?",in : American Journal of Jurisprudence, No,38, 1993

انسانی ارادہ اور مستقبل کی تعمیر
قرآن کے تناظر میں

مؤلف: فرشتہ سقا، فتحیہ فتاحی زادہ، ابراہیم شفیعی سروستانی
مترجم: مولانا نثار احمد زین پوری

بشریت کا مستقبل اور تاریخ کا انجام، ہمیشہ سے اللہ کو ماننے والے اور نہ ماننے والے مفکرین اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ مختلف مکاتب فکر نے اس سلسلے میں مختلف منصوبے پیش کیے ہیں لیکن قرآن مجید نے بشریت کے لیے ایسا مکمل اور نوید بخش منصوبہ پیش کیا ہے جس میں تمام انسانوں کی کامیابی وخوش نصیبی سے مالا مال مستقبل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر سے مستقبل نگری کی بنا پر انسان اپنے عزم وارادہ اور سماجی وتاریخی روایات کے قالب میں رائج قوانین پر عمل کرتے ہوئے، اپنے مستقبل کے بارے میں کسی بھی وجہ سے مجبور نہیں ہے بلکہ اس سے وہ اپنے مستقبل اور اپنی دنیا کو بنانے اور سنوارنے کے لیے بہت سی لازمی معلومات حاصل کرتا ہے اور اپنے سرگرم ارادہ کے ساتھ دنیا کے مستقبل اور اپنی تقدیر کی تعمیر کرتا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں پہلے ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث کی مدد سے مستقبل کے بارے میں قرآنی اصول کو آیات کی تفسیر کی روشنی میں بیان کیا جائے گا اور پھر مستقبل موعود کو وجود میں لانے کے لیے انسان کے فعّال کردار کو قرآن کے فکری اصولوں کی روشنی میں ثابت کیا جائے گا۔

مستقبل ایک ایسا مفہوم ہے جو انسان کے عام مطالبہ کی بنیاد پر ہمیشہ زیر غور رہا ہے۔ مستقبل اور اگلے لوگوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا علم حاصل کرنے کے لئے مختلف مکاتب فکر نے بشریت کے انجام و مستقبل کے بارے میں غور کیا ہے اور ہر مکتب نے اپنی تعلیمات کی بنیاد پر اپنے پیروی کرنے والوں کے لیے اس موضوع کی توجیہ و تفسیر کی ہے۔ اس طرح مستقبل اور تاریخ کے خاتمہ کا موضوع سابقہ ادیان اور فلسفی وسیاسی مکاتب میں قابل مشاہدہ ہے۔

دوسری آسمانی کتابوں کی مانند قرآن نے بھی بشریت کے روشن وکامیاب مستقبل کی تصویر کشی کی ہے اور مستقبل موعود اسلام کی پیروی کرنے والوں کے لیے بشارت وخوشخبری کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق چونکہ اس دنیا کا خالق علم، حکمت اور طاقت والا ہے لہٰذا تاریخ ایک آسمانی حقیقت سے شروع ہوتی ہے اور انسان و دنیا کی آسمانی حقیقت ہوتی ہے۔اس مکتب میں مستقبل اور انسان کے انجام کو، جس کی توجیہ حق تعالیٰ کے ارادہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے، روشن اور امید بخش پیرایہ میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیاقرآن مجید نے اپنے تاریخی منصوبہ میں، مستقبل کے منتظر انسان کو بے بس و مجبور بتایا ہے یعنی ایسے روشن مستقبل کو وجود میں لانے میں اس کا کوئی اہم کردار نہیں ہے یا یہ کہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں صرف انسان کی کوششوں کو کافی قرار دیا ہے؟ شیعی تاریخ کا فلسفہ، ایک ایسا مرکز و محور ہے جس کے ذریعہ قرآن کے تاریخی نظریہ سے اس مسئلہ کو دیکھا جاسکتا ہے۔اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مستقبل نگری کے بارے میں قرآنی اصول سے مدد لیتے ہوئے جو شیعی تاریخ کے فلسفہ میں بیان ہوئے ہیں، مستقبل موعود کے وجود میں لانے کے سلسلہ میں انسان کے ارادہ کو علامہ طباطبائی کے تفسیری نظریات اور شہید صدر کے افکار کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل کیا جائے۔

مستقبل نگری کے سلسلے میں قرآن کے بنیادی اصول:

قرآن کی مستقبل نگری در حقیقت، مہدویت کے نظریہ سے مربوط ہے۔ بعبارت دیگر قرآن مجید حتمی ویقینی مستقبل کی مکمل طور پر تصویر کشی کرتا ہے۔اس کے باوجود یہ موضوع تاریخی اعتبار سے بھی تحقیق کے قابل ہے۔ شیعی تاریخ کے فلسفہ میں قرآن کے مستقبل نگری کے بنیادی اصول یہ ہیں:

ا۔ پوری تاریخ پر خدا کے ارادہ اور مشیت کی حکومت:

قرآن کے اہم معارف میں سے ایک یہ ہے کہ کائنات کے پورے نظام پر ایک ارادہ کی حکومت ہے اور وہ خدا کا ارادہ ہے۔ کائنات میں جو چیز بھی وجود میں آتی ہے اور جو بھی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ خدا کا ارادہ ہے جو تاریخ بشریت کو آگے لئے جارہا ہے لیکن کیا اس قسم کی حاکمیت انسانی معاشرہ میں علِّیت کے قانون کو ختم نہیں کرتی اور جبر کا سبب نہیں ہوتی یا یہ کہ انسان اپنے اعمال وافعال میں آزاد وخود مختار ہے؟

خدا کی مشیت کے موضوع سے متعلق قرآن میں تین قسم کی آیتیں ہیں۔ بعض آیتیں خدا کی مشیت مطلقہ کی تصریح کرتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ [1]

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ [2]

فَإِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ [3]

یہ آیتیں کسی چیز کی خلقت کے وقت خدا کے ارادہ کو بیان کر رہی ہیں۔ ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کی ایجاد کے وقت خدا کی شان کی توصیف میں "کن فیکون" کی لفظ، قول، ارادہ، فرمان اور خدا کے حکم کے معنی میں ہوتی ہے [4]۔ صرف بحسب اعتبار خدا کا ارادہ اور اس کی قضا اس کے قول وامر پر مقدم ہے۔

بعض آیات میں اس کی مشیت مطلقہ کو تاریخ پر حاکم قوانین وسنن کے قالب میں بیان کیا گیا ہے:

وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا [5]

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ [6]

فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَبْدِيلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَحْوِيلًا [7]

۱۔ سورہ یٰسین، آیت ۸۲

۲۔ سورہ نحل، آیت ۴۰

۳۔ سورہ غافر، آیت ٦۸

۴۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۷، ص ۱۱۵

۵۔ سورہ اسراء، آیت ۷۷

٦۔ سورہ انعام، آیت ۳۴

۷۔ سورہ فاطر، آیت ۴۳

ان آیتوں میں جس حتمیت کا مشاہدہ ہوتا ہے اس سے بشر کی زندگی میں ان قوانین کا عام اور کلی ہونا طے ہو جاتا ہے اور جب تک اس عالم ہستی میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوتی ، کائنات اور جو کچھ بھی اس میں موجود ہے وہ انہیں قوانین کی بنیاد پر گردش کرتا ہے۔

اس قسم کی آیتوں کے ساتھ دوسری آیتیں بھی موجود ہیں جو خدا کی مشیت شاملہ پر مبنی ہیں:

وَمَا تَشَاؤنَ إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ الله [1]

اس آیت میں نفی کے ذریعہ استثنا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کی مشیت وچاہت خدا کی مشیت سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ آیت کفار کے اس وہم کو برطرف کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی کہ ہم اپنے ارادہ اور خواہش میں مستقل ہیں۔ آیت نے یہ بتایا کہ بندے کا ارادہ اور اس کی خواہش خدا سے تعلق رکھتی ہے خود اس کے فعل سے نہیں [2]۔ پس باوجودیکہ انسان مستقل ارادہ رکھتا ہے پھر بھی مشیت الٰہی کے تحت آتا ہے۔

آیت وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا [3] بھی مشیت شاملہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس آیت کے مطابق اللہ کی مشیت یہ نہیں ہے کہ سبھی لوگ ایمان لے آئیں۔ اسی دلیل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سارے انسان اپنے ارادہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان بھی دیگر امور کی مانند کسی خاص سبب کا محتاج ہے اور یہ سبب جو بھی ہو خدا کی مشیت کے بغیر موثر واقع نہیں ہوتا ہے۔ [4]

اس سلسلے کی آیتوں کی تیسری نوعیت میں دونوں وجہیں جمع ہو گئی ہیں۔ ارشاد ہے: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللهَ رَمٰى [5]۔ یہ آیت جنگ بدر میں مشرکین کو بھگانے کے لیے ان کی طرف کنکریاں پھینکنے کو خدا کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس فعل کو رسولؐ کی طرف نسبت نہ دینے کا سبب خدا کی آپ پر خاص اور غیر معمولی عنایت ہے البتہ اس کے ظاہری اور طبیعی عوامل یعنی سنگریزے پھینکنے والے رسول کی طرف نسبت دینا اس کے منافی نہیں ہے [6]۔

۱۔ سورہ دھر، آیت ۳۰
۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۲۰، ص ۱۴۲
۳۔ سورہ یونس، آیت ۹۹
۴۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۰، ص ۱۲۶
۵۔ سورہ انفال، آیت ۱۷
۶۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۹، ص ۳۹

مذکورہ آیتوں کی پہلی قسم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کی مشیت خدا کی مشیت کے تحت ہے، دوسری قسم کی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی مشیت انسان کے اختیاری اعمال سے متعلق ہے اور آیتوں کی تیسری قسم سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اسباب اور الٰہی سبب دونوں کا اثر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ اپنے وجود کے ساتھ خدا کے ارادہ کے ماتحت ہے اور وہ انسان کے اختیاری افعال کے دائرہ میں آتا ہے جن کو مادی اسباب و عوامل کہاجاتا ہے۔ یہی شیعوں کا عقیدہ ہے جس کو وہ لَاجَبرَ وَلَا تَفوِیضَ بَلِ الْاَمْرُ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ[1] کی عبارت میں بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید اسباب ومسبّبات کے نظام اور اصل علیت کی تائید کرتا ہے اور ہر موضوع کو جیسے موت، زندگی اور دوسرے آسمانی وزمینی واقعات کو جس کے بارے میں وہ گفتگو کرتا ہے، ایک علت سے منسوب کرتا ہے اگرچہ آخر میں توحید کے اثبات کے لئے اس کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے[2]۔

اسلامی نقطۂ نظر خصوصاً شیعی نظریہ کی بنیاد تمام عالم خلقت پر خدا کی حاکمیت کے محور پر استوار ہے۔ اس بنا پر تاریخ کا آغاز وانجام اور تاریخ کا سفر وارتقاء سب کچھ خدا کے ارادہ کے تحت ہے۔ آیت قَالَ رَبُّنَا الَّذِی أَعْطَی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَی[3] ایک برہان (دلیل) پیش کرتی ہے جس میں خدا ہر چیز کا رب ہے۔ واضح ہے کہ جب خدا نے اشیا کو پیدا کیا ہے تو وہی ان کا مالک اور مدبر بھی ہے کیونکہ ان کا وجود خدا کے وجود سے وابستہ ہے[4]۔

خداوند عالم، کائنات منجملہ انسان اور تاریخ بشر کا بھی خالق ہے وہی تاریخ کے تکامل کا بھی سرپرست ورب ہے یعنی عالم اور اس کی تاریخ کی خلقت وپیدائش کا تعلق خدا کی خالقیت سے ہے اور تاریخ کے تکامل کا ربط اس کی ربوبیت سے ہے۔ بنابرایں قرآن مجید تاریخی واقعات کو جو خدائی شناخت دیتا ہے وہ خدا

۱۔ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج ۱، ص ۲۸۹
۲۔ سورہ یونس، آیت ۴۴؛ سورہ کہف، آیت ۱۷
۳۔ سورہ طٰہٰ، آیت ۵۰
۴۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۴، ص ۱۶۸

کی حاکمیت کو واقعات کی علت یا واقعات کے طبیعی قوانین سے جایگزین کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعات اور خدا کی حکمت و حسن تدبیر کے درمیان جو رابطہ ہے اسے بتانا چاہتا ہے[۱]۔

قرآن علیت کے عمومی قانون کو مسلّم جانتا ہے۔ کائنات میں جو شئے بھی موجود ہے اور جو بھی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ ایک علت یا علتوں کے مجموعہ سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ علتوں کے بغیر وہ ممتنع الوجود ہے[۲]۔ عقل بھی بدیہی حکم اور اپنی فطرت کی بناپر اس قانون کو قبول کرتی ہے وہ ہر مادی واقعہ کی علت تلاش کرتی ہے اور اس سلسلہ میں کہ ہر واقعہ کی کوئی علت ہوتی ہے شک وتردّد میں مبتلا نہیں ہوتی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ موضوع خدا کے علت العلل ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ مشیت خدا علت کے قوانین یا قرآن کی زبان میں الٰہی سنن کے راستہ سے جن میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے، خارجی صورت اختیار کرتی ہے۔

خداوندعالم فرماتا ہے: وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ، اگر شہروں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناان پر آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے[۳]۔

پوری ہستی اور تاریخ پر خدا کی جو حاکمیت ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان مجبور ہے یا اس کی زندگی میں جبر ہے۔ جہاں خدا کل ہستی کے بارے میں بات کرتا ہے وہاں جبر مطلق حاکم ہے فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا[۴] لیکن جہاں انسان کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، خواہ فرد بشر کے بارے میں ہو یا انسانی معاشرہ کے بارے میں یا تاریخ بشر کے متعلق ہو، خدا کی مشیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حوادث و وقائع میں علت و معلول کا قانون ختم ہوگیا ہے بلکہ خداان روابط کے وجود پذیر ہونے کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔ درحقیقت دنیائے آفرینش میں جو علّتی روابط ہیں ان کا سرچشمہ اس کی حکمت وتدبیر اور تقدیر ہے اور اسی دلیل سے وہ خدا کا ارادہ، اس کا کلمہ اور اس کی سنت ہیں۔

۱۔ جعفری، یعقوب، بینش تاریخی قرآن، ج۲، ص ۳۲

۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۷، ص ۲۹۴

۳۔ سورہ اعراف، آیت ۹۶

۴۔ سورہ انعام، آیت ۹۶

ایسے مرتبط وعلّت والے نظام کے سایہ میں جس میں انسان مطلق طور پر خدا سے وابستہ ہے، وہ ان روابط کے ادراک سے خدا کی مشیت شاملہ کو درک کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کو اپنے ارادہ کے تحت مطلوب سمت میں لے جاسکتا ہے کیونکہ خدا کی مشیت شاملہ دو وجہ سے کارساز ہے۔ پہلی وجہ خدا کی جانب سے ہے لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ [1] اور دوسری وجہ انسان کی طرف سے ہے وَلَوۡ أَنَّ أَهۡلَ ٱلۡقُرَىٰٓ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوۡاْ [2]۔

۲۔ سنت الٰہی یعنی کائنات پر حاکم حتمی قوانین:

فلسفۂ تاریخ میں پیش کیا جانے والا پہلا موضوع تاریخ کی قانون مندی ہے۔ شہید مطہری کے نظریہ کی بنا پر جو چیز فلسفہ کی اصطلاح میں نظام کائنات اور قانون اسباب کے نام سے نظر آتی ہے اسی کو دینی اصطلاح میں "سنت الٰہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے [3]۔ سنن تاریخی اللہ کی سنت ہیں یعنی وہ خدا سے مربوط ہیں بعبارت دیگر قوانین تاریخ میں سے ہر قانون ایک خدائی قاعدہ ہے۔ قرآن کی تاکید اس بات پر ہے کہ تاریخی سنن خدائی ہیں اور غیبی خصوصیت کی حامل ہیں تاکہ انسان کی خدا سے وابستگی ہمیشہ ذہن میں رہے۔ چنانچہ جب انسان فطرت و نیچر سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو بھی وہ خدا سے وابستہ ہے اور کائنات کے مکمل نظام سے اور مختلف میدانوں میں طبیعت پر حاکم قوانین سے اسی صورت میں فائدہ حاصل کر سکتا ہے جب اس نے خدا سے دوری اختیار نہ کی ہو کیونکہ خداوند عالم انہیں سنتوں کے پیرایہ میں اپنی قدرت کا کرشمہ دکھاتا ہے۔ یہ سنتیں اور قوانین ارادۃ اللہ ہیں اور یہی کائنات میں اس کی حکمت وتدبیر کو مجسم کرتی ہیں [4]۔ یہی وجہ ہے کہ الٰہی سنن و قوانین کا یہ مجموعہ قرآنی اصطلاح میں دین کہلاتا ہے [5]۔

قرآنی نقطہ نظر کے مطابق تاریخی سنت سے مراد کچھ ایسے مفاہیم (اصول و نظریات) ہیں جو تاریخ کی قانون مندی کو بیان کرکے تاریخ کی حرکت کی ڈگر یہاں تک کہ سفر تاریخ کے مقصد کو بیان کرتے ہیں [6]۔ شہید صدر نے قرآنی آیتوں میں سے کچھ ایسے قوانین وضوابط کو پیش کیا جو تاریخ پر اثر انداز ہوئے

۱۔ سورہ اعراف، آیت ۹۶
۲۔ سورہ اعراف، آیت ۹۶
۳۔ مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج ۱، ص ۱۳۵
۴۔ ایضاً، ص ۸۵
۵۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۶، ص ۱۹۳
۶۔ صدر، محمد باقر، الموسوعہ الشہید الصدر، ج ۱۹، ص ۴۷

ہیں جیسے پورے معاشرہ کی موت (یونس،۱۹) مقررہ وقت میں دنیوی سزا (کہف،۵۸۔۵۹) رسول کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے معاشروں کی تباہی (اسراء،۷۶۔۷۷) اور رسولوں کا اپنی قوم کے خوش حال طبقہ سے جہاد (سباء،۳۴۔۳۵) ۔

شہید صدر جنہوں نے تاریخی واقعات کے اتفاقی اور تقدیری ہونے کی مخالفت میں قرآن کے نقطۂ نظر کو روشن کیا ہے، انہوں نے تاریخی استقرا[1] کو قرآن میں تاریخی قوانین کے ادراک کے لیے ایک علمی نہج کے عنوان سے پیش کیا ہے[2]۔

خداوند متعال نے أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللهُ عَلَيْهِمْ[3] جیسی آیتوں میں گذشتہ واقعات کو بیان کرکے ان کی علت کو جاننے کی ترغیب کی ہے۔ شہید صدر ان دونوں آیتوں سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گذشتہ واقعات کو پیش کرنے میں خود قرآن بھی استقرائی نہج کا استعمال کرتا ہے۔ شہید صدر کا نظریہ یہ ہے کہ تاریخی حوادث میں استقرا انسان پر علم تاریخ اور تاریخ کی سنن کے حقائق کو روشن کرتا ہے۔ بعبارت دیگر ایسی آیات میں غور وفکر کرنا، قرآن سے تاریخی قوانین وضوابط کے استخراج کا سبب ہوتا ہے۔ درحقیقت قرآن انسان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ ان سنن و قوانین کے کشف وادراک کے ذریعہ اپنی قسمت پر ایک فاعل موثر کے عنوان سے حاکم ہوسکتا ہے[4]۔

تاریخی سنن و قوانین قرآن مجید میں، قضیۂ شرطیہ یا قطعیہ یا فطری کشش ومیلان کی شکل میں بیان ہوئے ہیں۔ یقینا ان میں سے زیادہ تر قضیہ شرطیہ کی صورت میں بیان ہوئے ہیں کیونکہ کائنات

۱۔ یہ علمی کام ہے جو گذشتہ جزئی حوادث پر اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تاریخی سنن و قوانین حاصل ہوسکیں۔ منطق میں استقرا اس استدلال کو کہتے ہیں جس میں خاص وجزئی حقائق کے مشاہدہ کی بنیاد پر اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ مشاہدہ شدہ تمام جزئیات پر حکم صادق ہے، کلی حکم حاصل کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ حکم کلی پر بھی صادق ہے۔ جیسے مشاہدہ ہے کہ ہر ہنس سفید ہے پس تمام ہنس سفید ہیں۔ اس استدلال کی بنیاد پر قرآن کے تاریخی واقعات میں بھی تاریخی حوادث کے جزئیات کے تتبع و جستجو کے ساتھ کلی قوانین کو اخذ کیا جاسکتا ہے۔ (اژہ ای، محمد علی، مبانی منطق، ص ۱۴۴تا ۱۴۷)

۲۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج۱۹، ص ۵۴

۳۔ سورہ محمد، آیت ۱۰

۴۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج۱۹، ص ۶۷

تاریخی سنن و قوانین کی سطح پر شرط وجزا کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ایسے قوانین انسان کی معمولی زندگی میں بڑے مددگار ثابت ہوئے ہیں اور انسان سازی میں ان کا بڑا کردار رہا ہے کیونکہ انسان ان قوانین کی شناخت کے ذریعہ اپنے متعلق شرط وجزا کے بارے میں اقدام کرسکتا ہے۔ جب بھی وہ خود کو جزاء کا محتاج دیکھے تو اپنے ہاتھ سے شرط فراہم کرے اور شرط وجزاء کے قانون پر عمل کرے اور جب شرط کی جزاء اس کے فائدہ میں نہ ہو تو شرط کو وجود میں آنے سے روکے تاکہ جزا وجود پذیر نہ ہو[۱]۔

الٰہی قوانین اور سنتوں کی کچھ خصوصیات ہیں۔ قرآن کی تاریخی سنتوں میں سب سے پہلے ان کا خدائی ہونا، پھر ان کا عمومی ہونا اور پھر انسان کے ارادہ واختیار کی آزادی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ درحقیقت علمی قوانین کے کلی وہمہ گیر ہونے نیز ان کے یقینی ہونے (جس پر قرآن میں بھی تاکید کی گئی ہے) کی وجہ سے انہیں علمی حیثیت ملی ہے اور مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ تاریخی واقعات کا بصیرت وآگاہی کے ساتھ مطالعہ کریں اور انہیں منطق کے ساتھ قبول کریں[۲]۔

۳۔ہمہ جہتی کمال کی طرف حرکت

قرآن میں جس مستقبل کی بات ہوئی ہے ،اس کی سب سے اہم خصوصیت، نوع بشر کا کمال وعروج کی طرف سفر ہے۔اس کمال وبلندی کا نقطۂ عروج، انسان کا عقلی، اخلاقی اور اجتماعی کمال ہے جسے وہ انبیاء و ائمہؑ کی راہنمائی میں حاصل کرتا ہے۔ انسان کا آخری انجام ، تاریخ کے آخری زمانہ میں (مہدی موعود کے ظہور کے وقت) ہمہ جہت تکامل پر فائز ہونا ہے[۳]۔

تکامل کا نظریہ، دنیائے حیات میں موضوع بحث قرار پانے سے پہلے، انسانی تاریخ ومعاشرہ میں موضوع بحث رہا ہے۔ اجتماعی وسماجی تکامل کے نظریہ کی بازگشت زمانہ قدیم کے فلاسفہ کی طرف ہوتی ہے[۴]۔ معاصر دانشوروں میں سے بعض کا خیال ہے کہ انسان چونکہ اپنے افعال میں خود مختار ہے اور اس

۱۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج۱۹، ص۸۹و۹۱

۲۔ایضاً، ص۶۹

۳۔ کارگر، رحیم، آیندہ جہان، ص ۳۵

۴۔ پوپر، کارل، فقر تاریخی گری، ص۱۱۸

کے مستقبل میں اس کا کردار ہوتا ہے لہٰذا معاشروں کے مستقبل میں کوئی سیر تکاملی نہیں ہوتی ہے[۱]۔

تکامل یعنی کمال حاصل کرنا، کمال قبول کرنا اور کمال اس افزائش کو کہتے ہیں جس کو ایک موجود اپنی ہستی کے ماحول میں رہتے ہوئے حاصل کرتا ہے۔ عالم مادہ کا عام قانون، تغیر و تکامل ہے جس کو تمام اسلامی فلاسفہ اور موجودہ عہد کے دانشور قبول کرتے ہیں[۲]۔

تغیر و تکامل کے عام قانون کادارومدار اس بات پر ہے کہ اس کائنات کے ہر موجود کا وجود تدریجی ہے یعنی وہ کمزوری سے قوت کی طرف اور نقص سے کمال کی سمت سفر کرتا ہے تاکہ وہ اپنے وجود اور اپنے افعال وآثار میں کمال پیدا کرے اور کمال کی انتہا کو پہنچ جائے۔ انسان بھی اسی کائنات کا جز ہے اور اس کے اندر بھی اور اس کے افعال وآثار میں بھی، تغیر و تکامل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اندر ہونے والے تغیرات میں سے وہ آثار بھی ہیں جن کو وہ افکار وادراک سے وجود میں لاتا ہے[۳]۔ البتہ یہ قانون انسانوں کے لئے ذرا مختلف ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ کائنات کے تکامل وترقی کے سفر میں نوع انسان اگرچہ آگے بڑھنے کے لیے مجبور ہے لیکن تمام انسان قہری ولازمی طور پر تکامل وترقی کی طرف سفر نہیں کرتے ہیں کیونکہ الٰہی سنتوں کی بنیاد پر انسان اپنی زندگی کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں انسانوں کے سفر کے دو طریقے ملتے ہیں۔ ایک گروہ کمال انسانی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ دوسرا اپنی جگہ سے گرتا ہے اور انحطاط کی طرف جاتا ہے۔ تاریخ میں انسانوں کے یہ دو مختلف الجہات اور متضاد سفر نظر آتے ہیں۔ انہیں دونوں سے حق و باطل کے محاذ بنے ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے ٹکراتے اور لڑتے ہیں[۴]۔

بنابرایں کائنات کا نظام اپنے سفر میں کمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کائنات کا کوئی بھی ذرہ ساکن وبے حرکت نہیں ہے اور ان کے اس سفر وحرکت کا اصل سبب کائنات کے کلی قوانین ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کلی قوانین ثابت ہیں اور ان میں تکامل نہیں ہوتا ہے۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ

۱۔ مصباح یزدی، محمد تقی، جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن، ص ۱۶۷

۲۔ طباطبائی، محمد حسین، روابط اجتماعی در اسلام، ص ۲۳۱۔۲۳۰

۳۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۶۶

۴۔ پایدار، حبیب اللہ، برداشت ہایی در بارہ فلسفہ تاریخ از دیدگاہ قرآن، ص ۹۲۔۹۳

تَحۡوِیلًا[1]۔ کائنات میں کچھ قوانین ثابت ہیں جیسے کہ قانون علیت، علت و معلول کی سنخیت کا قانون، معلول کا علت کے مخالف نہ ہونے کا قانون اور تحول و تغیر کا قانون، جس میں غور و فکر کرنے اور طبیعی و مادی قوانین میں تخیلی طاقت سے کام لے کر نظام کائنات میں انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے[2]۔ باوجود اس کے کہ یہ قانون مادہ اور انسان کے اندر دائمی حرکت کو بیان کرتا ہے لیکن خود ثابت ہے۔

انسان کے لیے راہ تکامل پر چلنا ناگزیر ہے لیکن اس تکاملی سفر کا سبب و سرچشمہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف تو کائنات میں تکاملی حرکت کو ہدایت عمومی کے قانون کی بنیاد پر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہ قانون تمام مخلوقات پر نافذ ہے اور انسان کے اندر بھی ایسی قوت موجود ہے جو انسان کو کمال و سعادت کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ واضح ہے کہ اگر انسان کے لیے اس کمال وکامیابی کا امکان نہیں ہے جو اجتماعی زندگی گزارتا ہے تو اصل تجہیز باطل و لغو ہوگی، جبکہ خلقت و آفرینش میں کوئی بھی شئے باطل نہیں ہوتی ہے۔ یہ بات فقط عمومی قانون ہی نہیں ہے بلکہ انسان کو اس کی ضرورت بھی ہے[3]۔ بشر کی یہ فطری ضرورت وخواہش ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہے اور اس نے کامیاب معاشرہ بنانے کی آرزو میں زندگی گزاری ہے۔ درحقیقت انسان کی یہ اندرونی فطری ضرورت خلقت کے کلی قوانین سے ہم آہنگ ہے۔

دوسری طرف مستقبل موعود میں انسانی معاشرہ عدل وانصاف سے پر ہوجائے گا اور لوگ ایک دوسرے کے ہمراہ صلح وآشتی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے اور اجتماعی واخلاقی کمال کے عروج پر پہنچ جائیں گے۔ البتہ ایسے حالات کو برقرار کرنا خود انسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے معاشرہ کا رہبر، منجی بشریت اور روایات کے مطابق حضرت مہدی موعود ہوں گے۔ اس بنا پر خلقت کے کلی قوانین، دین اور فطرت انسان کے بنیادی اصول، انسان و معاشرہ میں انقلاب و تکامل پیدا کرنے کے لیے ایک نہج پر کام کررہے ہیں۔

جن عوامل واسباب نے تاریخ میں انسان کے ارتقائی سفر وحرکت پر اثر ڈالا ہے، وہ متعدد ہیں۔ مُتَألِّھین میں سے ایک گروہ فقط خدا کی قضا وقدر کو تاریخ کا سبب قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کے نقطۂ نظر سے

۱۔ سورہ فاطر، آیت ۴۳

۲۔ روابط اجتماعی در اسلام، ص ۳۲ - ۳۴

۳۔ طباطبائی، سید حسین، شیعہ در اسلام، ص ۱۴۹

تاریخ کے تمام چھوٹے بڑے حوادث کا عامل وسبب خدا کی مشیت ہے۔ بعض طبیعی علوم کے ماہرین کا خیال ہے کہ بشری علوم کی کثرت حرکت تاریخ کا سبب ہے۔ جغرافیہ، نسل ونژاد، شخصیات اور سورماؤں کو بھی تاریخ کے دیگر عوامل میں شمار کیا جاسکتا ہے[۱]۔ کچھ فلاسفہ نے متعدد عوامل سے تاریخ کی تفسیر کی ہے۔ اسلامی دانشوروں میں سے بعض نے انسان کی سیر نہ ہونے والی اور کمال کی متلاشی فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے اور فطرت کا نظریہ پیش کرکے تاریخ کی تفسیر بیان کی ہے[۲]۔

تضاد کو بھی تاریخ اور انسانی معاشرہ میں تبدیلی کا سبب بتایا گیا ہے۔ خود انسانوں کے اندر تضاد یعنی کششوں اور اندرونی قویٰ کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانوں اور فطرت (نیچر) میں بھی تضاد ہے جو اس کے اور اس کی اجتماعی مناسبتوں کے درمیان پیش آتا ہے[۳]۔

قرآن مجید میں طبیعت کے تضاد کو زوجیت کے قالب میں بیان کیا گیا ہے جو موجودات کی بقاء کا سبب ہوتا ہے[۴]۔ انسان کے اندر کا تضاد جو ابتدائے خلقت سے موجود ہے، شیطان سے جہاد کی صورت میں بیان ہوا جو عدو مبین یعنی کھلا دشمن ہے[۵]۔ معاشرہ میں انسانوں کے درمیان جو تضاد پایا جاتا ہے وہ بھی تاریخ میں حق وباطل کی جنگ کے عنوان سے موجود رہا ہے[۶]۔

قرآن کے نقطۂ نظر سے حق وباطل میں ابتدائے تاریخ سے ہی جنگ چلی آرہی ہے اور تاریخ کے اختتام تک باقی رہے گی۔ حق کی طاقت یعنی مومنین انبیاء کا اتباع کرتے ہیں اور آخر میں وہی کامیاب ہوں گے[۷]۔ البتہ معاشرہ میں نقص سے کمال کی طرف حرکت کا تقاضا یہ ہے کہ اشیاء کے درمیان نقص وتضاد موجود ہو۔اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تکامل پذیر اسلامی معاشرہ میں یہ تضاد، دین کے ثابت

۱۔ مجموعہ آثار، ج ۱۵، ص ۴۶

۲۔ایضاً، ج ۲۴، ص ۲۲۴

۳۔برداشت ہایی درباره فلسفہ تاریخ از دیدگاه قرآن، ص ۱۲۰

۴۔ سورہ ذاریات، آیت ۴۹

۵۔ سورہ حج، آیت ۵۳

۶۔ سورہ مومنون، آیت ۷۰

۷۔ سورہ مجادلہ، آیت ۲۱

اصول (توحید، نبوت، قیامت) میں نہیں ہوگا جن کے بارے میں ادیان سہ گانہ، اسلام و یہود و مسیحیت متفق ہیں، بلکہ یہ تغیر و انقلاب حیات بشری کی مادی ترقی اور علوم و فنون کی پیش رفت میں ہے[۱]۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے بشر ایسے معاشرہ میں کمال کی منزل پر پہنچے گا جس میں بشر کی فطرت سے ہم آہنگ عدالت اجتماعی کا رواج ہوگا۔ ایسے معاشرہ میں انسان اپنے نفع بخش علم اور صالح عمل کے ذریعہ کمال و کامیابی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا[۲]۔

صالح عمل وہ عمل ہے جو بر حق عقاید کے (عبودیت و خلوص) مطابق انجام پذیر ہو۔ صالح عمل کو علم کی ایک شاخ اور اس کا پھل قرار دیا جاتا ہے۔ صالح عمل کی تکرار سے عقاید میں استحکام پیدا ہوتا سعادت حاصل کرنے کی سمت میں انسان کی سیر تکاملی کے لئے دو پر یعنی علم نافع اور عمل صالح، لازم وضروری ہیں۔ علامہ طباطبائی ڈاکٹر کربن سے مناظرہ کے دوران اس سلسلہ میں کہتے ہیں:

"اسلام نے اپنے ماننے والوں کی حقیقی سعادت کے لیے جو طریقہ معین کیا ہے یعنی اعتقاد و عمل کا راستہ، وہ کچھ ایسا ہے کہ امام مہدی کے ظہور کے عقیدہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور حقیقی نتیجہ نہیں دیتا ہے[۴]۔"

شیعی مستقبل بینی یا آئندہ نگری کے عنوان سے انقلاب امام مہدیؑ کا اعتقاد معاشرہ میں حرکت و تغیر تبدیلی پر مشتمل ہے کیونکہ انقلاب ایک اجتماعی مفہوم ہے اور بشریت اپنے درد کے علاج کے لیے اس کی طرف بڑھتی ہے۔ انقلاب میں ایک مفہوم اصلاح کا بھی ہے جس کا سوتا توحید اور فطرت بشر سے پھوٹتا ہے[۵]۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ، تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ[۶]

۱۔ برداشت ہایی درباره فلسفہ تاریخ از دیدگاه قرآن، ص ۲۰
۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۴، ص ۱۱۹
۳۔ ایضاً، ج ۱۷، ص ۳۳
۴۔ ایضاً، ص ۷۵
۵۔ معموری، علی، نظریہ سیاسی شہید سید محمد باقر صدر، ص ۱۷۸- ۱۸۰
۶۔ سوره صف، آیات ۱۰-۱۱

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! کیا میں تمہیں ایسا راستہ بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ (وہ راستہ یہ ہے) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور راہ خدا میں اپنی جانوں اور اموال کے ذریعہ جہاد کرو اور یہ (ایثار و فداکاری) تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

اس بنا پر انسانی معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ لامتناہی سمت میں مستقل اور دشوار سفر جاری رکھنے کے پیش نظر سیر تکاملی کے تمام حالات و اسباب خود فراہم کرے اور ان پر کل روابط کی بنیاد رکھے[1]۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ [2]

ترجمہ: بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور انہیں کتاب و میزان (پیمانہ) دیا تاکہ لوگ عدل کے ساتھ قیام کریں اور لوہا نازل کیا جس میں لوگوں کے لیے شدید خوف و خطر اور نفع ہے تاکہ خدا یہ دیکھے کہ پوشیدہ طور پر خدا اور اس کے رسول کی کون مدد کرتا ہے، بے شک خدا زبردست قوت والا ہے۔

مذکورہ آیت کی بنا پر لوگ خود اپنے قیام و جہاد سے معاشرہ میں انقلاب برپا کرتے ہیں اور انبیاء و اولیا کا یہ فرض نہیں ہے کہ لوگوں کی مدد کے بغیر اور خود اکیلے اس تحریک کو کسی نتیجہ تک پہنچائیں بلکہ ان کا کام لوگوں کی قیادت کرنا، انہیں حالات اور انجام کار سے آگاہ کرنا اور ان کے اجتماعی شعور میں پختگی پیدا کرنا ہے۔

ذَلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ [3]

ترجمہ: یہ سزا اس لیے ہے کہ خدا نے جس قوم کو کوئی نعمت دی ہے اسے وہ نہیں بدلتا ہے مگر یہ کہ وہ اپنے باطن کو بدل دے۔

۱۔ صدر، محمد باقر، خلافت انسان و گواہی پیامبران، ص ۱۸

۲۔ سورہ حدید، آیت ۲۵

۳۔ سورہ انفال، آیت ۵۳

اس بناپر تاریخی تبدیلی و تغیر،انسانوں اور تاریخی قوانین (سنت الٰہی) کے ذریعہ رونما ہوتی ہے اور انقلاب کی تیاری کے لیے انسانوں کے ارادی عمل کو علم و بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت کو معاشرہ کا رہبر پورا کرسکتا ہے[۱]۔

۴۔تاریخ کی غرض وغایت:

قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ کائنات کو خدا نے ایک مقصد کے تحت خلق کیا ہے اور تاریخ اسلام کے فلسفہ میں تاریخ کا مقصد حضرت مہدیؑ کی عالمی حکومت کے ساتھ پورا ہوگا۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً[۲] نظام خلقت میں انسانوں کے تکامل وارتقاء کے اسباب موجود ہیں۔ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً[۳] بعض آیتوں میں اللہ کی عبادت کو کائنات کی تخلیق کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُونِ[۴]

ہر معاشرہ کی غرض وغایت کا تعلق اس معاشرے کے ارمانوں سے ہوتا ہے۔ معاشرہ کے ارمان اورآرزو، جس قدر کامل و عظیم ہوں گے اسی تناسب سے اس معاشرہ کے اغراض ومقاصد عظیم ہوں گے۔ ہر معاشرہ اپنے پسندیدہ ارمان کو قبول کرکے درحقیقت اپنے تکامل کے راستہ کا انتخاب کرتا ہے۔ قرآن وروایات نے اپنے ارمان کو اللہ کے نام سے یاد کیا ہے[۵]۔ قرآنی ارمان، ساری بشریت کے لیے مطلق طور پر ایک ارمان ہے۔ یہ کسی ایک معاشرہ یا گروہ سے مخصوص نہیں ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ[۶]

کَدَحَ کے معنی لغت میں کوشش کرنا، مشقت اٹھانا ہے[۷] اور اس آیت میں یہ ایک رضاکارانہ

۱۔ برداشت ہایی درباره فلسفه تاریخ از دیدگاه قرآن، ص۲۱۹
۲۔ سورہ ص،آیت ۲۷
۳۔ سورہ ملک،آیت ۲
۴۔ سورہ ذاریات،آیت ۵۶
۵۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج ۱۹، ص ۱۲۰
۶۔ سورہ انشقاق،آیت ۶
۷۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ج ۱، ص ۷۰۴

عمل اور حرکت ہے جس کے ساتھ رنج ومشقت بھی ہے۔ یہ حرکت دوسری حرکتوں سے کچھ مختلف ہے کیونکہ یہ تکاملی سیر ہے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں تکامل کے اس راستہ کو سبیل اللہ، صراط اور صراط اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ درحقیقت کدح انسانوں کو اس معاشرہ کا راستہ اور طریقہ بتاتا ہے جو تمام انسانوں پر محیط ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس گروہ کو بھی جس نے کمال کے خلاف اپنے راستہ کا انتخاب کیا ہے جیسے مشرکین اور خدا نے جھوٹے خداؤں کی پرستش کی بنا پر ان کی سرزنش کی ہے[۱]۔

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ [۲]

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بشریت کا کاروان اللہ کی طرف سفر کررہا ہے۔ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ [۳]۔ اور یہ موضوع بشر کے انتخاب وآزادی کے خلاف نہیں ہے۔ انسان جس محاذ پر بھی (چاہے وہ حق ہو یا باطل) پہنچے گا، وہ خدا کی سنت کے مطابق اپنے معبود حقیقی کی طرف جائے گا۔

آخرکار شیطان کو دی گئی مہلت ختم ہوجائے گی۔ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ [۴] وہ دن شیطان کی موت کا دن ہوگا کیونکہ اس روز خدائی حقائق پورے طریقے سے واضح ہوجائیں گے اور حق ہی حق ہوگا، باطل کی گنجائش ختم ہوجائے گی اور شیطانی سراب کا خاتمہ ہوگا جس کے سبب خدا کے بندے گمراہ ہوتے ہیں۔ بشر تمام شیطانی طاقتوں کو ختم کردے گا اور اپنے کمال کے راستہ کی تمام رکاوٹوں کو ہٹادے گا اور تاریخ کے مقصد کو حاصل کرلے گا یعنی روئے زمین پر بس ایک خدا کی حکومت ہوگی۔

قرآن کا تاریخی مقصد، استخلاف ہے یعنی انسان روئے زمین پر الٰہی منصب خلافت کو حاصل کرلے گا۔ اس الٰہی منصب تک وہی انسان پہنچ سکتا ہے جو تخلقوا باخلاق اللّٰہ [۵] سے آراستہ ہوتا ہے کیونکہ یہ منصب اس شخص کے شایان شان ہے جو اپنے کو خدا جیسا بنالیتا ہے، جس سے وہ خدا کے قرب ومقام خلافت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے واضح مصداق ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔

۱۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج۱۹، ص ۱۴۲

۲۔ سورہ نجم، آیت ۲۳

۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۵۶

۴۔ سورہ حجر، آیات ۳۷۔۳۸

۵۔ مجلسی، محمد تقی، روضة المتقین فی شرح من لا یحضره الفقیه، ج ۴، ص ۴۰۳

۵۔ تاریخی سنتوں کے تحقق میں انسان کے ارادہ کا اثر:

جب انسان تاریخی سنتوں کی بحث میں داخل ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک غلط تصور پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی آزادی اور تاریخی سنتوں کے درمیان ایک قسم کا تضاد ہوتا ہے۔ تاریخ کی سنتوں کے اثبات میں قرآن کا نہج کچھ ایسا ہے کہ وہ اس غلط تصور کو رد کرتے ہوئے اس مفہوم کی تاکید کرتا ہے کہ اس دنیا میں یکے بعد دیگرے جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا محور انسان کا ارادہ ہے[۱]۔ بطور مثال، قرآن مجید کسی قوم کے کے حالات کی تبدیلی کو خود اس قوم کی اپنے اندرونی تبدیلی کے بعد بیان کرتا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ حقیقت یہ ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے[۲]۔

یا دوسری آیت میں شہروں کے ہلاک شدہ لوگوں کی ہلاکت کا سبب خود انہیں لوگوں کے ظلم کو قرار دیا گیا ہے۔ وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا ،چونکہ ان شہروں کے باشندوں نے ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کردیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے وقت مقرر کر رکھا تھا[۳]۔

ذَلِكَ بِأَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ۔ یہ سزا اس لیے ہے کہ خدا نے جس قوم کو جو نعمت دی ہے وہ اسے نہیں بدلتا ہے مگر یہ کہ وہ قوم خود کو بدل ڈالے[۴]۔

مذکورہ آیات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تاریخی سنتیں انسان کے بس کے باہر نہیں ہیں اور خدا نے انسان کو زندگی میں ہر مطلوب تبدیلی کا اختیار دے دیا ہے اور انسان کے لیے سنہرے مواقع ہیں کہ وہ اپنے انتخاب اور اپنے ارادہ کی آزادی کو ثابت کرے۔ اس بنا پر انسان کے انتخاب کا مسئلہ ان اسلامی سنتوں میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے جس کی نقشہ کشی قرآن نے کی ہے۔ قرآن کی تاریخی سنتوں میں سے تین سنتیں ایسی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اجتماعی و تاریخی انقلاب میں انسان مختار و مؤثر ہے:

۱۔ برداشت ہایی در بارہ فلسفہ تاریخ از دیدگاہ قرآن، ص ۹۰
۲۔ سورہ رعد، آیت ۱۱
۳۔ سورہ کہف، آیت ۵۹
۴۔ سورہ انفال، آیت ۵۳

اجتماعی انقلاب کا معاشرہ کے افراد کے درونی تبدیلی سے ارتباط:

سورہ رعد کی آیت نمبر ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے إِنَّ اللہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ۔ آیت میں خلاصہ کے طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا نے یہ حتمی فیصلہ کر دیا ہے کہ اس نے انسان کو جو نعمتیں اور بخششیں دی ہیں، ان کا ربط خود انسان کے نفسانی حالات سے ہے۔ اگر وہ حالات خود اس کی فطرت کے مطابق ہوں گے تو ان نعمتوں اور بخششوں کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ مثلاً اس آیت میں ارشاد ہوتا:

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ ترجمہ: اگر شہر والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے (حق کو) جھٹلایا تو ہم نے بھی انہیں ان کے کرتوت کی سزا دی۔[1]

یعنی جب تک ان کے دل میں ایمان رہے گا خدا کی برکتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جب یہ اپنی حالت بدل دیں گے تو خدا بھی اپنی سنت بدل دے گا اور نعمت کو نقمت میں تبدیل کر دے گا[2]۔ جس چیز کو معاشرہ کی تبدیلی سے پہلے بدل جانا چاہئے وہ نوع انسان کے افراد ہیں کیونکہ معاشرہ کا تغیر خود اس کے افراد کے تغیر پر موقوف ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان مجبور نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر انسان مجبور ہوتا تو خدا معاشرہ کے تغیر کو معاشرہ کے افراد کے تغیر سے مشروط نہ کرتا۔ پس نیک وصالح معاشرہ وہ ہے جس کے افراد صالح اور نیک ہیں۔ اسی طرح فاسق معاشرہ، خراب وفاسد افراد سے وجود میں آتا ہے[3]۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللہِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ، جو خوبیاں تم لوگوں کو میسر آئی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں اور جو تکلیف تمہیں پہنچتی ہے اس کا سبب تم خود ہو[4]۔ علامہ طباطبائی خوبیوں کو خدا کی طرف نسبت دینے اور برائی کو انسان سے منسوب کرنے کے بارے میں اس آیت کے ساتھ سورہ انفال کی آیت نمبر ۵۳ کو نقل کرتے ہیں:

۱۔ سورہ اعراف، آیت ۹۶

۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۱، ص ۳۱۰

۳۔ مقدم، احمد حامد، سنت ہای اجتماعی در قرآن کریم، ص ۱۹۔۲۰

۴۔ سورہ نساء، آیت ۷۹

ذَلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ، اور یہ سزا اس لیے ہے کہ خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو نہیں بدلتا ہے مگر یہ کہ وہ لوگ اپنے دل کی حالت کو بدل دیں۔ علامہ طباطبائی دونوں آیتوں کو قریب المضمون سمجھتے ہیں[۱]۔ اس بنا پر انسان کی زندگی کی خوبیاں اور برائیاں خود اس کے عمل کا نتیجہ ہیں اور اس کو خدا کی مذکورہ سنت کی ایک نشانی سمجھا جائے گا[۲]۔

انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں انسان کا اختیار:

خدا کی طرف سے ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا بھی خدا کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ رسولؐ کی بعثت کے بعد ایک گروہ ہدایت پاتا ہے اور دوسرا ضلالت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ خدا ہدایت کے امکان سب کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اتمام حجت کے بعد لوگوں کو اختیار ہے کہ راہ صواب اختیار کریں یا غلط راستہ اپنائیں[۳]۔ یہ موضوع چند آیتوں میں موجود ہے ، مثلاً:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلاَلَةُ، ترجمہ: بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسولؐ بھیجا تا کہ وہ انہیں خدا کی عبادت اور شیطان سے اجتناب کے لیے کہے۔ اس کے بعد خدا بعض کو ہدایت دیدیتا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کے لیے گمراہی سزاوار ہے[۴]۔

مذکورہ آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رسولوں کا بھیجنا ایسی سنت ہے جو تمام قوموں اور امتوں کو شامل ہے، کسی ایک امت سے مخصوص نہیں ہے۔ ایک دوسری آیت سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے:

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُكْرًا، ترجمہ: اور کتنے ہی شہر والوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے روگردانی کی تو ہم نے ان سے

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن ، ج ۵، ص ۹
۲۔ برداشت ہایی درباره فلسفہ تاریخ از دیدگاه قرآن، ص ۲۹
۳۔ ایضاً، ص ۲۳
۴۔ سوره نحل، آیت ۳۶

سخت حساب لیا اور انہیں بدترین عذاب میں مبتلا کیا[1]۔

آیت میں جس عذاب کا ذکر ہوا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ رسولوں کی دعوت کو قبول کرنے یا قبول نہ کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ قرآن مجید لوگوں کی دین حق سے عداوت و سرکشی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو بجائے خود انسان کے مختار ہونے کی دلیل ہے۔

اپنی قسمت میں انسان کا دخل:

سنت امداد کی بنیاد پر دنیا کو چاہنے والوں کو دنیوی زندگی میں اور آخرت کے متوالوں کو اخروی زندگی میں امداد ملتی ہے۔ کچھ آیتیں انسان کو اپنی قسمت کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔ بعض آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا اپنے ارادہ اور مشیت کی بنیاد پر انسانوں کی آرزوؤں کو پورا کرنے میں جتنی مناسب سمجھتا ہے مدد دیتا ہے۔اس بنا پر ان آیتوں میں اپنی اور اپنے معاشرہ کی قسمت کے لئے انسانوں کے کردار کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۔ ترجمہ: جو شخص (زود گزر) دنیا چاہتا ہے تو ہم عنقریب اس دنیا میں سے جس کو جتنا چاہیں گے دیں گے بعد میں تو اس کے لیے ہم نے جہنم مہیا کر رکھا ہے جس میں وہ دھتکار وذلت کے ساتھ داخل ہوگا اور جو آخرت کا طلب گار ہے اور اس کو حاصل کرنے کی وہ انتھک کوشش کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی مشکور ہوگی[2]۔

اس آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے کہ جو اس زود گزر دنیا کو چاہے گا تو ہم عنقریب اس کی اس خواہش کو پورا کردیں گے پس ہمارے اختیار میں ہے کہ جس کو چاہیں گے دیں گے[3]۔ خدا بندوں کی اور خواہشوں کو پورا کرتا ہے لیکن اپنی مرضی کے مطابق اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے ارادہ کا سنت الٰہی پر اثر ہوتا ہے۔

۱۔ سورہ طلاق، آیت ۸

۲۔ سورہ اسراء، آیات ۱۸۔۱۹

۳۔المیزان فی تفسیر القرآن ، ج ۱۳، ص ۵۷

سورہ اسراء کی بیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ یعنی ہم دونوں کی مدد کرتے ہیں، کلا جو کہ نمدُّ کا مفعول ہے، اس کو فعل پر اس لیے مقدم کیا گیا ہے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ سنت امداد رسانی دونوں گروہ کو شامل ہے اور وہ اس طرح کہ انسان کی آرزو کو پورا کرنے میں خدا کی جو امداد رسانی کی سنت ہے وہ اپنی جگہ برقرار ہے۔ (چاہے یہ آرزو آخرت کے طلب گار مومن کی ہو یا دنیا دار کافر کی)

مذکورہ آیات انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔ انسان مسلوب الارادہ و اختیار نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ سنتوں میں انسان کی خواہش کا اثر سنت و قانون کے جاری ہونے یا نہ ہونے میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ بشر ہے جس کے اندر خدا کے امر ہدایت سے روگردانی کی طاقت ہے چاہے وقتی طور پر ہی سہی لہٰذا وہ جبری قانون کے تحت نہیں آتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی اجتماعی اور تاریخی سنن کا انسان کے ارادہ سے مشروط ہونا، انسان کے ارادہ کی آزادی کی قطعی دلیل ہے اور جب قرآن کے تاریخی منصوبہ کے تحقق میں تاریخی سنتوں کا اثر ہو اور یہی سنتیں انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار بھی قرار دیتی ہوں تو انسانوں کا ارادہ تاریخی سنتوں کے شانہ بشانہ مستقبل موعود کو وجود دینے میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔

ایک طرف انسان اپنی اندرونی طاقت (فکر وارادہ) کی بنیاد پر حرکتِ تاریخ کو وجود دیتا ہے۔[1] فکر، انسان کا وجود ذہنی ہے جس میں مقاصد واہداف متصور ہوتے ہیں اور ارادہ انسان کو ان اہداف کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ فکر وارادہ کے امتزاج سے انسان سے ایسا فعل صادر ہوتا ہے جس کا رخ مستقبل کی طرف ہوتا ہے[2]۔

بعض اجتماعی تبدیلیوں کا سرچشمہ الٰہی ہوتا ہے اور ان کے افکار و نظریات کی اصل وحی الٰہی ہوتی ہے، اس کے باوجود ان کے وجود میں آنے کے سلسلہ میں خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ فطری وعادی طریقہ سے اور ایک اجتماعی طبیعی واقعہ کے طور پر وجود میں آئیں کیونکہ جب تک ماحول ومعاشرہ میں انقلاب کے لیے مناسب فضا قائم نہیں ہوگی تب تک، انقلاب نہیں آئے گا اور آسمانی انقلاب آگے نہیں بڑھے گا۔

بعنوان نمونہ، جنگ بدر میں فتح کے بعد جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ،

۱۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج ۱۹، ص ۱۱۷

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۶

ترجمہ: اگر تمہیں (مسلمانو!) زخم لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی زخم لگا ہے اور اس فتح وشکست کو تو ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں[1]۔

قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ داستان تاریخی سنن وضوابط سے مربوط ہے۔ جنگ بدر میں کامیابی کا سبب وہ حالات ہیں جو لوگوں نے فتح کے لیے بنائے تھے اور تاریخی سنن کے مطابق ان حالات کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان کامیاب ہوں چنانچہ وہ فتحیاب ہوئے اور جنگ احد میں حالات کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان شکست کھائیں چنانچہ انہوں نے شکست کھائی[2]۔

تاریخی سنن میں انبیاء واوصیاء کا ایک کردار ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے ماننے والوں کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے خصوصاً ان انقلابوں یا اصلاحی تحریکوں میں جن کو الٰہی سنتوں کے مطابق فطری طریقہ سے جاری ہونا ہے، لوگوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں فرعون کی نابودی اور بنی اسرائیل کے برسراقتدار آنے کی داستان، اپنی سنتوں سے متفق ہونے اور اس عہد کے اجتماعی ولی (حضرت موسی) سے مرتبط ہونے اور ان کے اتباع کا ایک نمونہ ہے جسے سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۹ سے ۱۳۴ میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ گیری:

۱۔ تاریخ پر مشیت خدا کی حاکمیت، تاریخ کا ہمہ جانبہ تکامل کی طرف بڑھنا اور انسان کے ارادے کے تحت تاریخی سنتوں کا وجود میں آنا، قرآن کریم کے مستقبل نگری کے اصولوں میں سے ہے۔

۲۔ شہید صدر کے نقطۂ نظر کی بنیاد پر کائنات پر تاریخی قوانین کی حکومت قرآن کی تاریخی سنتوں کے ساتھ مکمل طور پر قابل انطباق ہے اور ان سنتوں کے انکشاف سے جزئی واقعات کے ذریعہ کلی وقطعی قوانین کا سراغ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے انسان اپنے مستقبل ومقدر کو بدل سکتا ہے۔

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۴۰

۲۔ الموسوعہ الشہید الصدر، ج ۱۹، ص ۵۱

۳۔ تاریخ کی ہمہ جانبہ سیر تکامل، قرآن کی مستقبل نگری کا ایک اور اصول ہے۔ علم نافع اور عمل صالح کا بشر کی تکاملی سیر میں ہونا لازمی ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے سیر تکاملی اس زمانہ میں ہوگی جب منجی بشریت کا ظہور ہوگا۔

۴۔ قرآن کی بعض تاریخی سنتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان اپنی زندگی و تاریخ کا خود ذمہ دار ہے۔ مثلاً منجملہ اجتماعی انقلابات، افراد کی باطنی تبدیلی سے مربوط ہیں اور اپنی قسمت میں انسان کی مداخلت اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انسان کے ارادہ میں تبدیلی نہیں ہوگی تو تاریخی سنتوں میں بھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۵۔ انسان کا ارادہ خدا کی مشیت کے تحت ہے۔ انسان خدا کے ارادہ اور مشیت کی بنیاد پر ان اعمال وافعال کو انجام دینے میں مختار ہے جو اس کی قسمت اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں یہ کہئے کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے اور اپنی تاریخ خود رقم کرتا ہے۔

۶۔ تاریخی سنتیں، قرآن کے تاریخی منصوبہ کے تحقق کا سبب ہیں اور دوسری طرف انہیں سنتوں کی بنیاد پر انسان کو اس کے افعال واعمال کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں، اس بنا پر انسان کا ارادہ، تاریخی سنتوں کے ساتھ مل کر مستقبل موعود کے وجود میں آنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

منابع و مآخذ

- قران کریم
- اژہ ای، محمد علی، مبانی منطق، ج ۴، سمت، تہران، ۱۳۸۲
- پایدار، حبیب اللہ، برداشت ہایی در بارہ فلسفہ تاریخ از دیدگاہ قرآن، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۳۶
- پوپر، کارل، ر، فقر تاریخی گری، ترجمہ احمد آرام، ج ۲، خوارزمی، تہران، ۱۳۵۰
- جعفری، یعقوب، بینش تاریخی قرآن، ج ۲، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، قم، ۱۳۶۸
- راغب اصفہانی، محمد حسین، مفردات الفاظ القرآن، محقق صفوان عدنان داوودی، دار القلم، دمشق، بیروت، دار الشامیہ، ۱۴۱۶ق
- سقا، فرشتہ، نقش ارادہ انسان در تحقق آیندہ موعود از منظر قرآن و مقایسہ آن با نظریہ پایان تاریخ، پایان نامہ کارشناسی ارشد، دانشگاہ الزہراء، ۱۳۹۱

- صدر، محمد باقر، الموسوعہ الشہید الصدر، ج ۱۹، مرکز الابحاث والدراسات التخصصیۃ للشہید الصدر، قم، ۱۴۲۱ق
- صدر، محمد باقر، خلافت انسان و گواہی پیامبران، ترجمہ جمال موسوی، تہران، ۱۳۵۹
- طباطبائی، سید محمد حسین، اصول فلسفہ وروش ریالیسم، ج ۲، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۷
- طباطبائی، سید محمد حسین، روابط اجتماعی در اسلام، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۷
- طباطبائی، سید محمد حسین، شیعہ در اسلام، ج ۵، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۸
- طباطبائی، سید محمد حسین، شیعہ، ج ۲، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۷
- طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۵، دفتر انتشارات اسلامی، قم، ۱۴۱۷ق
- کارگر، رحیم، آیندہ جہان (دولت وسیاست در اندیشہ مہدویت)، ج ۲، مرکز تخصصی مہدویت، تہران، ۱۳۸۷
- کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج ۱۵، دارالحدیث، قم، ۱۴۲۹ق
- مجلسی، محمد تقی، روضۃ المتقین فی شرح من لایحضرہ الفقیہ، ج ۲، مؤسسہ فرہنگی اسلامی کوشانبور، قم، ۱۴۰۶ق
- مصباح یزدی، محمد تقی، جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن، سازمان تبلیغات اسلامی، تہران، ۱۳۷۸
- مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج ۱-۱۵، و ۲۴، صدرا، تہران
- معموری، علی، نظریہ سیاسی شہید سید محمد باقر صدر، اشراق، قم، ۱۳۷۹
- مقدم، احمد حامد، سنتہای اجتماعی در قرآن کریم، ج ۵، بنیاد پژوہشہای اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۸۴

انسان اور خدا کا رابطہ، نہج البلاغہ کی رو سے

مؤلف: ڈاکٹر بخش علی قنبری
مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی

رابطہ کا جو مفہوم آج بیان کیاجاتاہے ،ایک سو پچاس سال پہلے اس کے وہ معنی بیان نہیں ہوتے تھے اس کے باوجود اس کے جانشین مفاہیم مثلاً اُنس نہج البلاغہ میں بار بار آئے ہیں جو رابطہ کے اصناف ومراتب کو بیان کرتے ہیں چاہے وہ رابطہ انسان اور خدا کے در میان ہو یا پھر دوسرے رابطے ہوں۔ انسان کے تعلق سے چار قسم کا رابطہ ملتا ہے۔ انسان کا خدا سے رابطہ، اس کا خود اپنے آپ سے رابطہ، دوسرے انسانوں سے رابطہ اور طبیعت سے رابطہ۔ ان میں سے ہر رابطہ انسان کے پانچ وجودی میدان میں متحقق ہوتاہے۔ اس طرح کل بیس طرح کے رابطے وجود میں آتے ہیں جن میں سے ایک انسان اور خدا کا عقیدتی ۔معرفتی رابطہ ہے۔ اس رابطہ میں بندگی ، خلافت، عاشقانہ اور تعاون جیسے روابط شامل ہیں۔ اول ،دوم وسوم روابط نہج البلاغہ میں کثرت سے بیان کئے گئے ہیں لیکن تعاون کا رابطہ مشرقی ادیان مثلاً دائیوئی (تاؤازم) (TAOISM) میں بیان کیا گیا ہے اور نہج البلاغہ میں موجود نہیں ہے لیکن اس کے باوجود خدا اور بندہ تعاون کرتے ہیں تاکہ انسان بہتر سے بہتر بنے اور اپنے کمال کی منزل سے قریب ہو جائے۔

نفس انسان ایک ایسا میدان ہے جو عقائد، احساسات ، خواہشیں، چاہتیں، گفتار وکردار کا منبع ہے اور اسی کی وجہ انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہاجائے کہ انسان کے دو پہلو ہیں۔ ایک شخصی اور ذاتی پہلو ہے جس میں اس کا جسم، ذہن اور نفس شامل ہے، دوسرا مشترک پہلو یعنی روح ہے جس میں دوسرے انسان بھی مشترک نظر آتے ہیں ۔ انسان خدا اور دوسرے موجودات سے رابطہ برقرار کرسکتا ہے۔اس مضمون میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ نہج البلاغہ میں انسان اور خدا کے رابطہ کی ماہیت کیا ہے؟ تحقیق کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع

کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں اور شاید اب تک ان پر توجہ نہیں دی گئی ہے جس کی وجہ سے مسائل اور بحران پیدا ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں خدا سے رابطہ کی قسمیں نہ پہچاننے کی بنا پر انسان نے اپنی زندگی سے خدا سے رابطہ کو رفتہ رفتہ ختم کرلیا ہے جس کی وجہ سے انسان تنہائی اور خالی پن جیسی پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا ہے۔ جیسا کہ تحقیقات اس دعوے کی مؤید ہیں۔[1]

پیغمبر اور عرفاء واولیائے الٰہی کبھی کبھی "میں" اور "وہ" کے رابطہ کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کا مطلب "میں" اور "تو" کے رابطہ سے غفلت نہیں ہے بلکہ مقام توصیف میں دوسروں کے لئے اس طرح کے دونوں رابطوں کو بیان کیا ہے وَالَّذِی هُوَ یُطعِمُنی وَیَسقینِ وَإذا مَرِضتُ فَهُو یَشفِینِ[2]۔

خدا اور انسان کا رابطہ نہج البلاغہ میں بہت سے مقامات پر "میں" اور "وہ" اور بعض مقامات پر "میں" اور "تو" کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ عقیدہ اور معرفت کے میدان میں انسان اور خدا کا رابطہ کس طرح واضح کیا گیا ہے؟ رابطہ کی چار قسمیں یعنی عبد اور مولا کا رابطہ، جانشینی کا رابطہ، عاشق ومعشوق کا رابطہ اور تعاون کا رابطہ اس مقالہ میں بیان کیا گیا ہے لیکن انسان کی بلندی کے راستہ میں انسان اور خدا کے تعاون کی کمیت و کیفیت کو بھی یہاں بیان کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں شاید سب سے پہلے توشی ہی کو ایزوتسو نے قرآن میں خدا اور انسان کا رابطہ کے نام سے کتاب تالیف کی ہے۔ انہوں نے اس رابطہ کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن عقیدتی اور معرفتی میدان میں انسان اور خدا کے رابطہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ ان کی تحقیق قرآن مجید پر مبنی ہے نہج البلاغہ پر نہیں۔ نہج البلاغہ پر تحقیق کرنے والوں نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی ہے ،البتہ بعض شرحوں مثلاً ابن ہیثم اور محمد تقی جعفری کی شرح میں کلی طور پر اس بحث کی طرف اشارہ موجود ہے لیکن راقم السطور نے جس طرح اس پر نظر ڈالی ہے یعنی عقیدتی اور معرفتی اعتبار سے اس رابطہ پر بحث نہیں ہوئی ہے۔

۱۔ قنبری، بخش علی، رنج تنہائی و مثنوی معنوی، پژوہش زبان وادبیات فارسی، شمارہ۲۱، ص ۹۸۔۹۷

۲۔ سورہ شعراء، آیت ۷۹ -۸۰

معرفتی اور عقیدتی رابطہ کی ماہیت

اللہ تعالی اور بندہ کے درمیان جب ہم رابطہ کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد عقیدتی ، جذباتی، ارادی، گفتاری اور کرداری ارتباط ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہاجاتاہے کہ انسان جب کوئی عمل کرتاہے تو وہ خدا کی خوشنودی کے اسباب فراہم کرتاہے تو یہاں ہم نے جذبات کے دایرہ میں خدا اور انسان کے رابطہ کی بات کی ہے کیوں کہ خوشنودی اور غضب اسی طرح کی چیزیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کے رابطے نہج البلاغہ میں بہت زیادہ بیان ہوئے ہیں۔ جب خدا کے بارے میں انسان کے حمد کی بات آتی ہے تو یہ انسان اور خداکے درمیان گفتاری رابطہ ہے کیوں کہ گفتار ایسا رابطہ ہے جس میں ایک طرف کے رابطہ کو بیان کے ذریعہ پیش کیا جاتاہے[1]۔

حضرت علیؑ کے ارشادات پر ایک کلی نگاہ ڈالنے کے بعد نہج البلاغہ میں خدا اور انسان کی شناخت کی نوعیت جانی جاسکتی ہے اور اسی بنیاد پر ان دونوں موجود کے درمیان رابطہ کے امکان یا عدم امکان کی بات کہی جاسکتی ہے کیوں کہ ان دونوں موجود کی شناخت بنیادی ہے اور یہ رابطہ اسی کی فرع ہے۔ چونکہ نہج البلاغہ میں انسان اور خدا کا رابطہ باربار دہرایا گیا ہے، اس وجہ سے بڑی آسانی سے نتیجہ نکالاجاسکتا ہے کہ حضرت علیؑ نے خداکے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ انسان کے ذہن سے بہت قریب ہے یعنی جو موجود تمام موجودات سے جدا ہے۔وہاں فکر، ارادہ اور احساس موجود ہے، حالانکہ خدا حالات کی تبدیلی (صرف) سے بری ہے وہ انسان سے خوش اور ناراض ہوسکتا ہے[2]۔ اسی طرح خدا میں وہ صفات بھی موجود ہیں جو انسانوں میں موجود ہیں (البتہ وہ امکانی اوصاف سے منزہ ہے) مثلاً وہ خوش اور ناراض ہوسکتا ہے ، شوق اور رغبت دلا سکتا ہے اور تنبیہ بھی کرسکتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی اور بندہ میں رابطہ برقرار ہوسکتا ہے۔ البتہ یہ رابطہ مختلف شکلوں میں ہوتاہے کبھی عاقلانہ اورمعرفتی ، کبھی عاشقانہ، کبھی رب اورمربوب کا رابطہ ۔ بندگی اور خدائی رابطہ کی کثرت ہے اور عاشقانہ رابطہ بڑا گہرا رابطہ ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۱۴ ، ص ۱۶۹

۲۔ استیس، وت، فلسفہ عرفان، ص ۱۸۴۔ ۱۸۳

نہج البلاغہ میں خدا کے بارے میں جو بیان کیا گیا ہے وہ خدا کے مشخص ہونے کی تائید کرتا ہے اور انسان اللہ تعالی سے رابطہ برقرار کر سکتا ہے۔ جب نہج البلاغہ میں اللہ تعالی کو بار بار "تو" سے خطاب کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اسے گھر میں مسافر کا جانشین کہا گیا ہے تو یہ سب خدا کے مشخص ہونے کی دلیل ہے۔ امام علیہ السلام دعا میں فرماتے ہیں کہ خدا تو ہی سفر میں ہمراہ اور میرے گھر میں میرا جانشین ہے۔ اس ذات کے علاوہ یہ دونوں صفتیں ایک ساتھ کسی ذات میں نہیں پائی جا سکتیں کیوں کہ جو جانشین ہے وہ ہمراہ نہیں ہوگا اور جو ہمراہ ہوگا وہ جانشین نہیں ہوگا[۱]۔ اس طرح کے موارد نہج البلاغہ میں بہت ہیں[۲]۔

نہج البلاغہ میں ایک جگہ بیان ہوا ہے کہ خدا ہر موجود کے ساتھ موجود ہے اور کوئی چیز اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، تم اپنی ضرورتیں اسی سے مانگو اور اسی سے عطا و بخشش کی درخواست کرو کیونکہ تمہارا کوئی پردہ اور پردہ داری اسے روک نہیں سکتی، نہ اس کا کوئی دروازہ تمہارے اوپر بند ہے، وہ ہر جگہ ہے، ہر وقت اور ہر جن وانس کے ساتھ ہے، اسے کوئی کسی سے منحرف نہیں کر سکتا۔ کوئی آواز کسی آواز کی بناپر اس سے چھپ نہیں سکتی اور بخشش اسے سزا دینے سے روک نہیں سکتی[۳]۔

اس رابطہ کی بنیاد آگاہی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسان بھی ایسے اوصاف کا مالک ہے جو اس رابطہ کی توجیہ کرتے ہیں۔ قرآن میں مختلف جگہوں پر اس رابطہ کے بارے میں بتایا گیا ہے جیسا کہ بعض اہل نظر نے سورہ حمد سے استناد کیا ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد والی آیت کو بندہ اور رب کے درمیان عملی رابطہ کا راز قرار دیا ہے اور بعد کی آیات کو خدا سے درخواست جانا ہے اور خدا بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ یہ سب بندہ کا ہے اور میرا بندہ جو چاہتا ہے وہ مجھ سے مانگ سکتا ہے[۴]۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۴۶، ص ۸٦

۲۔ نمونہ کے طور پر خطبہ ۲۳۷، ص ۲۴٦ اور نامہ ۳۱، ص ۳۸۹ ملاحظہ ہو

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹، ص ۳۰۹

۴۔ کربن، ہانری، تخیل خلاق در عرفان ابن عربی، ص ۳۷۰

مقام وجود میں عقیدتی اور معرفتی رابطہ کی قسمیں

یہ رابطہ کبھی اجباری اور کبھی ارادی ہوتاہے۔یہ دوسرا رابطہ ممکن ہے انسان کی طرف سے یا خدا کی طرف سے شروع ہو۔ بہرحال اس رابطہ کی تین مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی انسان خدا سے رابطہ کرے یا براہ راست خدا کسی انسان سے رابطہ برقرار کرے۔ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ خدا نوع انسان (تمام انسانوں) سے رابطہ قائم کرے (رابطہ نوعیہ) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ رابطہ علت ومعلول کا رابطہ ہو یعنی خدا چونکہ مخلوقات کے وجود کی علت ہے وہ انسان یا کسی ایک مخلوق سے رابطہ قائم کرے۔ نہج البلاغہ میں کبھی وجود کی بنیاد پر، تو کبھی عقیدہ اور کبھی فرائض کی بنیاد پر روابط کی بات کی گئی ہے۔

ا۔ بندگی کا رابطہ (عبد ورب)

لفظ عبد عربی زبان میں کم سے کم دو معنی میں استعمال ہوتاہے ،ایک غلام کے معنی میں (اسلام سے پہلے عربی ثقافت میں اسے رقبہ کہتے ہیں) اور دوسرا بندہ کے معنی میں استعمال ہوتاہے۔ غلام سے زیادہ انسانی رخ لفظ بندہ میں پایاجاتاہے کیونکہ غلام خرید فروخت ہوتا تھا لیکن بندہ ایسا نہیں تھا۔

قرآنی لغت میں رب پرورش کرنے والے سے بالاتر معنی میں استعمال ہوا ہے اس معنی میں کہ خدا انسان کا سرور بھی ہے اور پرورش کرنے والا بھی ہے۔ قرآن مجید اور نہج البلاغہ میں عبد، بندہ کے معنی میں ہے ،غلام کے معنی میں نہیں ہے۔ نہج البلاغہ میں بہت ساری جگہوں پر بندگی کا رابطہ بیان ہوا ہے۔ کچھ مقامات پر صراحت کے ساتھ انسانوں کو مربوب اور خدا کو رب بتایا گیا ہے: لم یخلق ما خلقه لتشدید سلطان ولا تخوّف من عواقب زمان ولا استعانة علی ندٍّ مثاور ولا شریك مکاثر ولا ضد منافر ولکن خلائق مربوبون وعباد داخرون، تونے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اپنی قدرت وسلطنت کی مضبوطی، زمانہ کے حوادث کے خوف اور حریف رزم جو ، فخر کرنے والے شریک اور برتری طلب کرنے والے ساتھی سے تحفظ کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ تمام خلائق پروردہ (رب والے) فرماں بردار اور خاضع بندے ہیں[1]۔

ا۔ نہج البلاغہ، خطبہ ٦٥ ،ص ٨٢

اس رابطہ میں ایک طرف خدا ہے جو پروردگار (رب) ہے، جس میں جلال ، قدرت اور سرپرستی کے ساتھ ساتھ پرورش کا پہلو بھی موجود ہے ، دوسری طرف بندہ (عبد) ہے جس میں فروتنی ، ضعف، خضوع اور مطلق فرماں برداری کا پہلو موجود ہے جس کی توقع عموماً بندہ سے ہوتی ہے ۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ عبد میں کبر، غرور، اظہار بے نیازی نہیں ہونی چاہئے۔ اسلام ایسی باتوں کو جاہلیت کی زندگی کے اوصاف شمار کرتا ہے[۱]۔ نہج البلاغہ میں انسان کو کبر و نخوت سے شدت کے ساتھ بار بار روکا گیا ہے : مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الكَرِيمِ[۲]۔ اس روایت میں انسان کو فروتنی کی تاکید گئی ہے ،اسی کے ساتھ خدا پر جرات دکھانے کو کبر کا بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے اور انسان کو اس دام سے بچنے کی تاکید گئی ہے یا ایھا الناس.... وما غرك بربك وما انسك بھلكه نفسك ، اے انسان تجھے کسی چیز نے پروردگار کے سامنے دلیر بنادیا ہے اور تیری ہلاکت کا کیا سبب ہے؟[۳] اس عبارت سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ خدا کے سامنے تکبر اور دلیری ہلاکت کا اور تواضع انسان کی نجات کا باعث ہے۔ چنانچہ شیطان اسی فکر کی بناپر ذلیل ورسوا ہوا[۴]۔

۲۔ جانشینی کا رابطہ

نہج البلاغہ میں جانشینی کی دو صورتیں بیان ہوئی ہیں ۔ایک صورت تو یہ ہے کہ خدا انسان کا جانشین ہے اور دوسری صورت میں انسان، خدا کا جانشین ہے اس ارتباط کو ہم خلافت یا جانشینی کے نام سے یاد کرتے ہیں، چونکہ خدا ہر جگہ حاضر وناظر ہے اس بناپر ہر مسافر کے گھر پر اس کا جانشین ہوسکتا ہے ۔حضرت کے اس قول کی بناپر خدا کی جانشینی اس معنی میں ہے کہ وہ گھر والوں کی حفاظت اور ان کے مسائل ومشکلات کو حل کرتا ہے۔

۱۔ ایزوتسو، توشی ہیکو، خدا و انسان در قرآن، ص ۹۴

۲۔ سورہ انفطار، آیت ٦

۳۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۲۲۳۔۲۴۴

۴۔ ایضاً ، خطبہ ۱۹۲

نہج البلاغہ میں خدا کی جانشینی کہیں عام اور کہیں خاص ہے۔ جب خدا ہر جگہ حاضر ہے تو وہ لوگوں کے گھروں میں بھی حاضر ہے، اس طرح کی خلافت کسی خاص شرط سے مشروط نہیں ہے بلکہ خدا سفر کے وقت ہر شخص کے گھر میں موجود ہے البتہ مومنین اس جانشینی سے واقف ہیں اور اس پر ان کا ایمان ہے لیکن غیر مومن ممکن ہے ایسی باتیں قبول نہ کرتا ہو۔ حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں بڑی صراحت کے ساتھ اس رابطہ کو یاد کیا ہے[۱]۔ یہ جانشینی واقعی جانشینی کے معنی میں ہے یعنی اگر کوئی سفر میں ہو تو خدا واقعی اس کے گھر میں اس کا جانشین ہوتا ہے اور سفر میں بھی ہمراہ ہوتا ہے۔ گھر میں جانشین ہونا اور سفر میں بھی ساتھ ہونا کسی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ جو ایک کام میں مشغول ہونے کے بعد دوسرے کام میں بھی مشغول ہو وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اسی وجہ سے جنگ میں خدا علیؑ کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی وقت ان کے گھر میں بھی موجود ہو کر اہل خانہ کی حفاظت کرتا ہے۔ نہج البلاغہ کے بعض شارحین کی تعبیر کے مطابق عالم ہستی میں خدا کے مطلق احاطہ کا مطلب یہی ہے[۲]۔ اس بنا پر اس جانشینی کا مطلب اللہ تعالی کا علم، حکمت اور قضا وقدر الٰہی ہر جگہ موجود ہے[۳] جو ہر جگہ ہر چیز میں من جملہ انسانوں کے گھر میں اس کے رہنے والوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔

مخصوص جانشینی کے دو مراحل ہیں۔ پہلے مرحلہ میں پورے نوع انسان کو خدا کا خلیفہ بتایا جاتا ہے اور کسی خاص گروہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ خلافت کی دوسری نوعیت یہ ہے کہ وہ کسی خاص فرد کے لئے ہے۔ امیر المومنین نے اس گروہ کو زمین پر خدا کا جانشین بتایا ہے: اولئك خلفاء الله في ارضه والدعاة الى دينه، وہ زمین پر خدا کے جانشین اور اس کے دین کے داعی ہیں[۴]۔ دوسرے مقام پر آپ نے اپنا تعارف خلیفۂ الٰہی کی حیثیت سے کرایا ہے نہ کہ زمینی اور دنیوی خلافت کے معنی میں[۵]۔ البتہ اس طرح کے خلفائے الٰہی جب زمینی مسند خلافت پر فائز ہوتے ہیں تو اس وقت خلائق

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۴۶، ص ۸۶

۲۔ جعفری، محمد تقی، ترجمہ وتفسیر نہج البلاغہ، ج ۱۶، ص ۴۲

۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۱۶۶

۴۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷، ص ۴۹۷

۵۔ ایضاً، نامہ ۲۵؛ حسن زادہ آملی، حسن، انسان کامل در نہج البلاغہ، ص ۵۷

سے حق الٰہی وصول کر لینا ان کا فریضہ ہوتا ہے۔

انسان کامل خلیفۂ خدا کے عنوان سے اپنے اعمال کا ذمہ دار اور زمین کا سرپرست اور محافظ ہے۔ زمین پر خدا نے اسے حق تسلط دیا ہے بشرطیکہ وہ خدا کے فرامین کے مطابق زندگی گذارے[۱]۔ ایسے انسان زمین و آسمان کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی تعبیر کے مطابق وہ بدن کے ذریعہ دنیا سے ہمدم ہیں اور ان کی روح عالم بالا سے متعلق ہے[۲]۔ وہ اپنے فرائض انجام دینے کے لئے زمین پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ حق ولایت کی خصوصیتیں انہیں سے متعلق ہیں۔ وصیت اور میراث پیغمبر انہیں کے درمیان ہے[۳]۔ ہر زمانہ میں انسان کامل موجود ہوتا ہے۔ اس سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہوتا کیوں کہ وہ زمین پر حجت خدا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ زمین پر آل محمد کی مثال آسمان کے ستاروں جیسی ہے، جب کوئی ستارہ غروب ہوتا ہے تو دوسرا ستارہ نکل آتا ہے[۴]۔

انسان کے اوصاف کلی بیان کرتے ہوئے نہج البلاغہ میں امیر المومنین نے فرمایا:

> "وہ علم کو زندہ کرنے والے اور دنیا کو عزت دینے والے ہیں۔ ان کی بردباری تمہیں ان کے علم کا ان کا ظاہر ان کے باطن کا، ان کی خاموشی ان کی حکمت آمیز گفتگو کا پتہ دیتی ہے۔ نہ تو وہ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور نہ اس کے بارے میں کوئی نظری اختلاف رکھتے ہیں، وہ اسلام کے ستون ہیں، پناہ تلاش کرنے والوں کی پناہ گاہ ہیں، انہیں کے ذریعہ حق اپنے مقام پر پلٹ آیا اور باطل اپنی مسند سے کنارہ کش ہوا۔ اگر وہ سکوت بھی اختیار کریں پھر بھی ان کا آفتاب وجود اھل طلب پر نور افشانی کرتا رہتا ہے۔"[۵]

انسان کامل اور اولیاء خدا کے علم کا چشمہ ان کے اندر سے ابلتا رہتا ہے، اسی وجہ سے سرچشمۂ علم اور ان میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا بلکہ منبع تولید علم ان کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے لہٰذا وہ باطنی

۱۔ نصر، سید حسین، معرفت ومعنویت، ص ۳۲۶
۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷، ص ۴۹۷
۳۔ ایضاً، خطبہ ۲، ص ۴۷
۴۔ ایضاً، خطبہ ۱۰۰، ص ۱۴۶
۵۔ ایضاً، خطبہ ۲۳۹، ص ۳۵۸۔ ۳۵۷

بصیرت سے ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جنہیں لوگ چشم بینا سے نہیں دیکھ پاتے۔ انسان کامل کی خصوصیتیں مندرجہ ذیل طریقہ سے بیان کی جاسکتی ہیں:

۱۔ وہ علم کو زندہ کرنے والے ہیں۔ پہلی منزل میں یہ علم کشفی اور عرفانی علم ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے مرحلہ میں ہر علم نافع کو شامل ہوتا ہے[۱]۔

۲۔ وہ اہل حلم ہیں، ان کا حلم ان کے علم ونظریہ میں موثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا علم، علم حضوری ہے اور ایسے علم کا اثر ان کے اخلاق اور روش میں آشکار ہوتا ہے۔

۳۔ ان کے ظاہر وباطن میں یکسانیت ہے چونکہ وہ قلب کے راستہ سے اندرونی اور بیرونی اتحاد تک پہونچے ہیں بلکہ جہاں ہستی کی وحدت تک پہونچے ہیں اس وجہ سے ان کا ظاہر ان کے باطن کی خبر دیتا ہے۔

۴۔ ان کا سکوت ان کی گفتگو کی خبر دیتا ہے کیوں کہ انہوں نے قلب کے وسیلہ سے سکوت اور گفتگو کی سرحد ختم کردی ہے۔

۵۔ وہ حق سے ہم آہنگ ہیں بلکہ حق کے مصداق اور معیار ہیں اسی وجہ سے قوام ہستی ان سے وابستہ ہے۔ ان کے بغیر نظام ہستی بکھر جائے گا اور اپنا وجود کھو دے گا۔

ایسے افراد دوسروں کو دعوت دینے کا حق رکھتے ہیں اور تمام افراد پر ان کی پیروی فرض ہے۔ داع دعا و راع رعی فاستجیبوا للداعی واتبعوا الراعی، وہ دعوت دینے والے داعی ہیں اور سرپرستی کرنے والے سرپرست ہیں لہٰذا دعوت دینے والے کی دعوت پر لبیک کہو اور سرپرست کی پیروی کرو۔ وہ تمام سالکان طریقت کے مرجع اور مقتدا ہیں۔ حق تلاش کرنے والوں کی تمام اندرونی وبیرونی چاہت ہیں اور سوالات کے جواب دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کو سوال کرنے کی دعوت دیتے ہیں: ایہا الناس سلونی قبل ان تفقدونی فلانا بطرق السماء اعلم منی بطرق الارض قبل ان تشغر برجلها فتنة تطا فی خطامها وتذهب باحلام قومها[۲]۔ انسان کامل کی بینش میں اتنی گہرائی ہے کہ وہ عمق جان کی خبر دینے اور ان کے راز ہائے

۱۔ علم کشفی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے نہج البلاغہ، خطبہ ۵، ص ۵۲ اور علم نافع کے سلسلہ میں خطبہ ۱۹۳، ص ۳۰۳ ملاحظہ فرمائیں

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۹، ص ۲۸۰

درونی کو بیان کرنے پر قادر ہے ،انسان کے سرانجام سے بھی واقف ہے۔ خدا کی قسم اگر میں چاہوں تو تمہارے آنے جانے اور تمام امور کی خبر دے سکتا ہوں [1]۔

۳۔ عاشقانہ رابطہ

رابطہ عاشقانہ کی سب سے بہترین صورت میں اور تو کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ رابطہ وصال تک بر قرار رہتا ہے اور اس کے بعد میں تو میں فنا ہو جاتا ہے اور صرف تو ہی باقی رہتا ہے لہٰذا جب عاشقانہ رابطہ کی بات ہوتی ہے تو ہماری مراد یہ ہے کہ عاشق کے وجود کو سوائے معشوق کے کوئی دوسرا پر نہیں کر سکتا۔ یہ مفہوم نہج البلاغہ میں کئی بار بیان ہوا ہے لیکن عشق، عاشق اور معشوق کی لفظوں کے ساتھ نہیں بلکہ محب، محبوب اور محبت کے الفاظ کے ساتھ اور بسا اوقات ان الفاظ کے بغیر بھی یہ مفہوم ادا ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر محبان الٰہی کے عشق کے بیان کے لئے لفظ ولہ سے استفادہ کیا گیا ہے : این القوم الذین دعوا الی الاسلام فقبلوہ ... وھیجوا الی الجھاد فولھوا اللقاح الی اولادھا [2]۔وہ لوگ کہاں ہیں جنہیں اسلام کی دعوت دی گئی تو انہوں نے قبول کیا؟ اور جیسے اونٹنی اپنے بچے کی طرف شیفتگی سے بڑھتی ہے وہ اسی طرح جہاد کی دعوت کے وقت جہاد کی طرف بڑھے۔

اس عشق و محبت کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے خدا کو دل میں بسالیا ہے : عظم الخالق فی انفسھم فصغر مادونہ فی اعینھم، چونکہ ان کی نظر میں خالق سب سے بڑا ہے اس وجہ سے اس کے علاوہ ہر چیز چھوٹی ہے [3]۔ اس عبارت سے عارف کے نزدیک خدا کی حیثیت کا پتہ چل سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سالک راہ خدا کے عشق کا سراغ بھی مل سکتا ہے۔ اس طرح کہ اس کا دل صرف محبت خدا سے پر ہے اور وہ محبوب و معشوق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہاں عشق میں یگانگی ملحوظ ہے اور بس۔ نہج البلاغہ کے ایک شارح کی نظر میں ، معرفت و محبت الٰہی میں جذبۂ الٰہی کے متفاوت ہونے

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۵، ص ۲۵۰

۲۔ ایضاً، خطبہ ۱۲۱، ص ۱۷۷

۳۔ایضاً، خطبہ ۳۰۳، ص ۱۹۳

سے عارف کی نظر میں عظمت خدا متفاوت ہو جاتی ہے۔ اس عظمت کی وجہ سے خدا کے سوا تمام چیزیں چھوٹی لگنے لگتی ہیں[1]۔

نہج البلاغہ میں لفظ انس اور اس کے مشتقات سلبی اور ایجابی دونوں طرح سے استعمال ہوئے ہیں۔ سلبی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو کسی موجود سے انس حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ احساس تنہائی یا وحشت کی بنا پر کسی انیس کو تلاش نہیں کرتا ہے[2]، بلکہ ایسے حالات اس پر عارض ہی نہیں ہوتے ہیں۔ لفظ انس کو ایجابی معنی میں خدا کی طرف نسبت دیا گیا ہے اور اسے بہت زیادہ مانوس ہونے والے کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے: اللھم انك آنس الانسین لاولیائك[3]۔

لیکن انسان کو وحشت و تنہائی کی وجہ سے خدا سے انس کی ضرورت ہے۔ اگر اسے غربت و تنہائی سے وحشت ہوتی ہے تو وہ یاد خدا سے مانوس ہوتا ہے اور رنج و غربت اور تنہائی سے نجات پاتا ہے[4]۔ نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ صرف خدا کو مانوس کی حیثیت سے یاد نہیں فرماتے بلکہ کہیں کہیں آپ حق کو مونس اور باطل کو انسان کی وحشت کا سبب گردانتے ہیں[5]۔ ایک مقام پر آپ نے موت کو بھی مونس کی حیثیت سے یاد کیا ہے لیکن موت بذات خود امر مطلوب نہیں ہے بلکہ وصل الٰہی کا ذریعہ ہونے کی بناپر انسان کے مانوس ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔

انس و محبت پر مبنی رابطہ کا آغاز کرنے والا کبھی خدا ہوتا ہے تو کبھی انسان۔ مندرجہ ذیل عبارت میں حضرت علیؑ کی طرف سے یہ رابطہ عاشق خدا انسان کے عنوان سے واضح کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: واللہ لابن ابی طالب آنس بالموت من الطفل بثدی امہ۔ بچہ جتنا ماں کے سینہ سے مانوس ہوتا ہے، خدا کی قسم (علی ابن ابی طالب) میں موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں[6]۔

۱۔ ابن ہیثم بحرانی، کمال الدین، شرح نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۳۶۹ و ۳۶۲

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۶، ص ۲۷۶

۳۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۷، ص ۳۴۹

۴۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۷، ص ۳۴۵

۵۔ ایضاً، خطبہ ۱۳۰، ص ۱۸۸

۶۔ ایضاً، خطبہ ۵، ص ۵۲؛ خطبہ ۵۵، ص ۹۱

عاشقان الٰہی کا فریضہ ہے کہ وہ فقر کا عظیم بار برداشت کرنے اور دنیا اور اس کی محبت سے دور رہنے کے لئے تیار رہیں۔[۱]

۴۔ تعاون و ہمکاری کا رابطہ

تعاون کے مختلف معانی ہیں۔ کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا اور انسان دونوں مل کر دنیا کے ناقص کام کو سر انجام تک پہنچائیں کیوں کہ ایسے کاموں کے لئے دونوں ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج ہیں اور تعاون کے بغیر ایسے کام انجام نہیں پا سکتے۔ تعاون کا یہ مطلب مشرق زمین کے ادیان بالخصوص دین داؤ میں موجود ہے[۲]، لیکن نہج البلاغہ میں اس طرح کے تعاون کا ذکر نہیں ہے کیوں کہ دنیا کے بنانے میں کوئی بھی مخلوق خدا کا معاون یا شریک نہیں ہو سکتی[۳]۔ نہج البلاغہ میں اللہ تعالی اور بندہ میں جس تعاون کا ذکر ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے حکم کو سنتا جائے اور اس سلسلہ میں اللہ تعالی سے تعاون کرے۔ قرآن کریم (محمد، ۷[۴]) اور نہج البلاغہ میں انسان کے ذریعہ اللہ تعالی کی مدد کرنے کا تذکرہ موجود ہے، ان من احب عباداللہ الیہ عبدا اعانہ اللہ علی نفسہ، خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بندہ وہ ہے ، نفس کو مہار کرنے میں خدا نے جس کی مدد کی ہو[۵]۔ اگر چہ یہ تعاون مساوی طور پر دونوں طرف سے نہیں ہے لیکن اسے خدا اور انسان کے تعاون کا مصداق شمار کیا جا سکتا ہے۔

عقیدتی، معرفتی رابطہ کی معرفت کا فریضہ

نہج البلاغہ میں خدا کے ساتھ انسان کا رابطہ دو طرح سے یعنی "ہے" اور "ہونا چاہئے" کے ذیل میں قابل تحقیق ہے۔ عقیدتی۔ معرفتی رابطہ کے ضمن میں انسان اور خدا کے درمیان جو رابطہ ہے وہ دو قسموں پر منقسم ہوتا ہے۔

۱۔ من احبنا اھل البیت فلیستعد للفقر جلبابا (نہج البلاغہ، حکمت ۱۱۲، ص ۴۸۸)

۲۔ لاؤدزو، داء، دہ جینگ، ص ۲

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱، ص ۱۲۷

۴۔ یا ایھا الذین آمنوا ان تنصر اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم

۵۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۷، ص ۱۱۸

عام فرائض

عام فرائض سے مراد وہ فرائض ہیں جنہیں رابطہ کے تحقق کے لئے انجام دینا ضروری ہے۔ جو شخص خدا سے رب اور عبد کا رابطہ برقرار کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی ان فرائض کے انجام دینے کی ضرورت ہے اور اگر کوئی عاشقانہ رابطہ برقرار کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے، البتہ عمل کے موقع پر دونوں میں باہم فرق ممکن ہے۔

۱۔ **عبادت:** اس کا ایک عام مفہوم ہے جو پرستش خدا کی تمام مشقوں کو شامل ہے اور عام طور پر نہج البلاغہ میں بھی دوسرے دینی متون کی طرح دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ دعا جو درود و ذکر کے ساتھ مشروط ہے اور ایک وہ جو صرف عملی ہے۔ پہلا حصہ نماز، ذکر اور دعا کو شامل ہے اور دوسرا حصہ روزہ، زکوۃ اور خمس کو شامل ہے[۱]۔ حضرت علیؑ کی نظر میں اگر جنت، دوزخ، جزاو سزا کا وجود نہ بھی ہو تو ایسی عبادت واجب ہے: لو لم یتوعد اللّٰہ علی معصیة لکان یجب ان لا یعصی شکر لنعمہ ،اگر خدا نے نافرمانی پر سزا کا وعدہ نہ بھی کیا ہوتا تو اس کے بعد بھی شکر نعمت کے طور پر اس کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے[۲]۔ یہ عبادتیں اور دعائیں مختلف قالب میں عملی شکل اختیار کرتی ہیں۔ نہج البلاغہ میں جو عبادتیں بالترتیب بیان ہوئی ہیں ان کی تحقیق پیش کی جائیں گی۔

۱۔ **نماز** : یہ خدائے بزرگ وبرتر کی تقدیس وتنزیہ ہے۔ صرف کلمات اور آیات خدا کو انفعالی صورت میں دریافت کرنے کے بجائے، انسانوں کو تاکیدی حکم ہے کہ مثبت شکل میں کچھ بدنی اعمال کی انجام دہی کے ذریعہ اپنے جذبات کو انفرادی طور پر یا ان افراد کے ساتھ مل کر ظاہر کرے جو اس احساس میں اس کے شریک ہیں۔ نماز میں سب سے اہم چیز خدا کے ساتھ رابطہ کا اظہار ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے نماز کے قوانین کی رعایت ضروری ہے۔ اس رابطہ کے ذیل میں وہ تمام خاص اذکار و اوراد ہیں جو تقرب خدا کا سبب ہیں۔ دینی مدارک منجملہ قرآن اور نہج البلاغہ میں نماز قرب الٰہی کا ذریعہ ہے[۳]۔ نماز

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۹

۲۔ ایضاً، حکمت ۲۹۰، ص ۵۲۷

۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۹۹، ص ۳۱۹

میں سالک خدا سے وصل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے درد دل پیش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا سے رابطہ کے لئے نماز کا مرتبہ اتنا بلند ہے اور اسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے[۱]۔

۲۔ دعا: دعا طلب کے معنی میں ہے۔ خدا سے رابطہ کی ایک قسم یہ بھی ہے۔ نہج البلاغہ میں بڑی وضاحت سے یہ بات موجود ہے کہ خدا نے خود دعا کا حکم دیا ہے کیوں کہ اسی نے اپنے بندوں پر دعا کا دروازہ کھول رکھا ہے تو وہ ہرگز اجابت کا دروازہ بند نہیں کرتا ہے[۲]۔

وحی اور دعا میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ وحی کے ذریعہ خدا بندوں سے بات کرتا ہے اور دعا کے ذریعہ انسان خدا سے بات کرتا ہے۔ جب انسان پریشانیوں کا شکار ہوتا ہے تو دعا کا سہارا لیتا ہے اور براہ راست خدا سے خطاب کرنے لگتا ہے۔ اسی عمل کو دعا کہتے ہیں[۳]۔ البتہ ایسا نہیں ہے کہ ہمیشہ انسان ہی دعا کرتا ہے بلکہ بہت سی جگہوں پر خدا خود انسانوں کو دعا کی دعوت دیتا ہے۔

شدید تقوائے الٰہی یا موت کا احتمال بھی دعا کا سبب ہو سکتا ہے۔ اور قرآن کے مطابق ایسے موقع پر مشرکین بھی دعا کرنے لگتے ہیں: جب انسان کو کوئی نقصان پہونچتا ہے تو وہ کروٹ لیکر، لیٹ کر، بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دعا کرتا ہے، جب ہم مصیبت ٹال دیتے ہیں تو پھر وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے مصیبت کے وقت اس نے ہمیں پکارا ہی نہ تھا[۴]۔

دعا زبان سے ہوتی ہے لیکن اس کا جواب کبھی زبانی ہوتا ہے اور کبھی عملی۔ دوسرے الفاظ میں جب دعا کرنے والا زبانی جواب طلب کرتا ہے تو زبانی جواب مل جاتا ہے لیکن دوسرے موارد میں خدا کی طرف سے دعا کا جواب عملی طور پر ہوتا ہے۔

۳۔ ذکر: ذکر سے مراد یاد خدا ہے اس طرح کہ زبان و دل ایک ہوں۔ نہج البلاغہ میں مذکورہ معنی کے علاوہ بہت سی جگہوں پر متعلق کی رعایت سے اس کے معنی بیان ہوتے ہیں۔ ذاکر اپنے متعلق یعنی خدا کو یاد کرتا جاتا ہے۔ اس ذکر کا سب سے عظیم متعلق خدا ہے جس کی کثرت پر حضرت علیؑ تاکید کرتے

۱۔ نہج البلاغہ، نامہ ۴۷، ص ۴۲۲

۲۔ ایضاً، حکمت ۴۳۵، ص ۴۹۴؛ خطبہ ۲۳۰، ص ۳۵۶

۳۔ ایزوتسو، توشی ہیکو، خدا و انسان در قرآن، ص ۲۴۶

۴۔ سورہ یونس، آیت ۱۲

ہیں: افیضوا فی ذکر الله [۱]۔ کبھی کبھی دوسروں سے یہ درخواست کی جاسکتی ہے کہ آپ خدا سے ہمارے لئے دعا کردیں: ذکرنا عند ربك [۲]۔ یہ صرف آخرت میں یاد دہانی نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی ہو سکتا ہے انا اذکّر اللّٰہ من بلغه کتابی هذا۔ جس تک میرا یہ خط پہونچے میں خدا کو اس شخص کی یاد دلاتا ہوں [۳]۔

نہج البلاغہ میں یاد خدا کے بہت سے نتائج بیان ہوئے ہیں۔ حضرت علیؑ نے ان بنیادی نتائج کی طرف اشارہ فرمایا ہے [۴]:

دلوں پر صیقل

قوائے نفسانی کا فعال ہونا

خدا کے ساتھ تقابلی گفتگو۔ وما برح للّٰہ عزت آلاؤہ فی البرهة بعد البرهة و فی ازمان الفترات ، عباد ناجاهم فی فکرهم و کلمهم فی ذات عقولهم، ہر زمانہ میں اور پیغمبر سے خالی زمانہ میں بھی کچھ بندے ہیں کہ اللہ جن کی فکر میں راز کی باتیں کرتا ہے اور ان کے دلوں میں بات ڈال دیتا ہے۔

خاص فرائض

خاص فرائض سے مراد وہ فرائض ہیں جس میں اصناف رابطہ میں سے کسی ایک کی مناسبت کی رعایت ہو، جسے ہم مندرجہ ذیل سطور میں بیان کریں گے:

۱۔ **عبد اور رب کا رابطہ** : حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ انسان بندہ ہے اور خدا رب ہے: فان العبد انما یکون حسن ظنه بربه علی قدر خوفه من ربه، بندہ کا اپنے رب کے بارے میں حسن ظن اتنا ہی ہونا چاہئے جتنا وہ اس سے خوف رکھتا ہے۔ اس رابطہ کو بہت سے مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ **جانشینی** : حضرت علیؑ چاہتے ہیں کہ انسان خدا کی جانشینی کے رتبہ سے اپنے آپ کو نیچے نہ گرائے۔ اپنے آپ کو اس منزل پر تصور کرے اور اپنے معاملات کو منظم کرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کچھ

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۰، ص ۱۶۳

۲۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۵، ص ۳۵۵

۳۔ ایضاً، نامہ ۵۷، ص ۴۶۶

۴۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۲، ص ۳۴۲

افراد خاص جانشینی کے مرتبہ پر فائز ہیں[۱] جو ایسے فرائض انجام دیں گے جو خاص جانشینوں کا فریضہ ہے تاکہ ان کے اندر وہ اوصاف پیدا ہو جائیں۔ معرفت و بصیرت کے ساتھ بلند سطح تک حصول علم بھی ان کا فریضہ ہے۔ جو افراد الٰہی خلافت کے خاص مقام تک پہونچ گئے ہیں وہ علم میں راسخ ہیں۔ وہ علم لدنی کے مالک، عقل کو زندہ کرنے والے اور خدا کے امانت دار ہیں[۲]۔ اس سے بالاتر یہ ہے کہ ایسے خلفاء مستخلف عنہ کی صفت سے متصف ہوں تاکہ اسی کے حکم میں آجائیں ورنہ ان کو ایسا مرتبہ نہیں حاصل ہو سکتا۔

۳۔ **رابطۂ عاشقانہ**: خدا سے بہت گہرا رابطہ ہے۔ اس رابطہ کو قائم کرنے کے لئے سیر و سلوک سے مربوط تمام فرائض پر عمل کرنا ضروری ہے جس کا ذکر نہج البلاغہ کے ۸۷، ۱۹۳ نمبر خطبہ میں موجود ہے۔

۴۔ **تعاون**: خدا اور انسان کے درمیان تعاون کا سب سے بنیادی مصداق نفس کے ساتھ مبارزہ میں تعاون ہے۔ مبارزہ نفس کے سلسلہ میں خدا کے ساتھ تعاون کا آخری مرتبہ اعلیٰ عرفانی درجات کا حصول ہے۔ حضرت علیؑ نے مختلف مقامات پر اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ حزن و خوف اختیاری، اغیار کے تصور سے دل کا خالی ہونا، لباس شہرت اتار پھینکنا، غیر خدا سے دوری اور خدا کی جانب توجہ وہ مقامات ہیں جو نفس کے ساتھ مبارزہ میں خدا کے تعاون کے مصادیق ہیں[۳]۔

عقیدتی، معرفتی رابطہ کی غرض و غایت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا سے رابطہ کا نتیجہ یا مقصد کیا ہے؟ خدا سے چاروں قسموں کے رابطوں کے نتیجے الگ الگ ہیں۔ جب انسان اور خدا کے درمیان عبد و رب کا رابطہ قائم ہوتا ہے تو اس سے وہ نتائج سامنے آتے ہیں جو دوسرے روابط کے نتائج نہیں ہیں۔ مثلاً خدا کی رحمت سے بہرہ وری اس رابطہ کا یقینی نتیجہ ہے کیوں کہ بندہ اس خدا کی عبادت کرتا ہے جو رحمت ہی رحمت ہے۔ ایسی نہ ختم ہونے والی رحمت ہے جس سے ناامید نہیں ہو سکتے۔ اپنے بندوں پر اس کی نعمتوں کی بارش ہمیشہ ہوتی رہتی ہے۔ اس کی بخشش و عطا میں مایوسی کا کہیں گذر نہیں ہے[۴]۔ ایسے رابطہ کے نتیجے میں جزاء اور پاداش کے سوا کوئی دوسری چیز اہم نہیں

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۱، ص ۴۹۷
۲۔ انسان کامل در نہج البلاغہ، ص ۵۹
۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۷، ص ۱۱۸
۴۔ ایضاً، خطبہ ۴۵، ص ۸۵

ہے۔ جس اونٹنی کا بچہ گم ہو جائے وہ بہت گریہ کرتی ہے۔ بے یار ومددگار کبوتر نالہ وفریاد کرتے ہیں، راہب فریاد وفغاں میں مصروف رہتے ہیں۔ مولا علی ان سب کی مثال دیکر بیان کرتے ہیں کہ اگر انسان اپنی نجات کے لئے اس طرح نالہ وشکوہ کرنے لگے تو وہ خدا کی جزاوسزا سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے[۱]۔

رب اور عبد کے رابطہ سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ عبودیت کے اعلی درجات ہیں۔ ایسا رابطہ قائم کرنے کے بعد اسے خدائے واحد پر یقین ہو جائے گا بلکہ ایسے میں عبودیت اخلاص کی معراج پر پہونچ جائے گی[۲]۔ خدا کے ساتھ انسان کے ایسے رابطہ کے باعث جذبات اور عاطفہ کی دنیا میں انسان کو قلبی حیثیت حاصل ہو گی اور وہ عمل خالص انجام دے گا[۳] پھر وہ اس کے سایہ میں آخرت میں شہداء اور انبیاء کی جگہ پہنچ جائے گا۔

عاشقانہ رابطہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا رابطہ پیدا کر سکتا ہے اور اگر ایسے رابطہ کو استمرار حاصل ہو جائے تو پھر وہ شخص عارف باللہ کے درجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں موجود خامیوں کو بر طرف کرکے منزل کمال تک پہونچ سکتا ہے اور اگر وہ اس مرحلہ میں بلند مقام تک پہنچ گیا تو وہ پچھلے تمام مرحلوں سے گذرتا ہوا اور ماسوا اللہ سے اعراض کرتا ہوا تمام موجودات سے جدا ہو کر اپنے آپ کو خدا کے حضور میں دیکھنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ عرفان کے آخری مراحل سے گذر جاتا ہے پھر اپنے آپ سے بھی صرف نظر کر لیتا ہے اور صرف خدا کو دیکھتا ہے اس طرح وہ خدا کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے[۴]۔ نہج البلاغہ کے توحیدی مکتب کے مطابق ایک ہو جانے کا مطلب صفاتی اور فعلی اتحاد ہے جس کا ذکر نہج البلاغہ کے مختلف خطبوں میں آیا ہے[۵]۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵۲

۲۔ ایضاً، خطبہ ۲۳

۳۔ ایضاً، خطبہ ۲۳

۴۔ شرح نہج البلاغہ، ج ٦، ص ۳٦۷، ۳٦٦

۵۔ بعنوان نمونہ خطبہ ۹۷ ملاحظہ فرمائیں

نتیجہ

نہج البلاغہ میں انسان اور خدا کے عقیدتی، معرفتی رابطہ پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سلسلہ میں انس، محبت جیسے مفاہیم اور نماز و ذکر و دعا اور دوسری طرح کی عبادتوں سے استفادہ ہوا ہے۔ اس طرح رابطہ کے ایجاد کے مفہوم کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اس طرح کہ عارفانہ دینداری اس کی دستیابی میں سمٹ جاتی ہے۔ اس رابطہ کے اصناف بھی چار قسموں میں منحصر ہو گئے ہیں جس میں تین اصناف یعنی عبودیت، خلافت اور عشق کا تذکرہ صراحت کے ساتھ نہج البلاغہ میں موجود ہے اور حضرت علیؑ نے عاشقانہ روابط کی بھی اس درمیان بڑی تاکید کی ہے۔ رابطہ کی چوتھی صنف یعنی تعاون کا اس کے معنی کی بنیاد پر یہاں بیان نہیں جاسکتا لیکن ادیان مشرق کی تفسیروں کے علاوہ دوسری تفسیروں میں عالم کی حالت اور انسان کے اخلاق کی بہتری کے لئے انسان اور خدا کے تعاون کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے شواہد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

منابع و مآخذ

- قرآن کریم
- نہج البلاغہ، ترجمہ حسین استادولی، اسوہ، تہران، ۱۳۸۴
- نہج البلاغہ، ترجمہ محمد مہدی جعفری، مؤسسہ نشر و اشاعت ذکر، تہران، ۱۳۸۹
- ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۳۔ ۴۔ ۵، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، داراحیاء العربی، بیروت، ۱۳۸۵
- ابن ہیثم بحرانی، کمال الدین، شرح نہج البلاغہ، دارالثقلین، بیروت، ۱۴۳۰ق
- استیس، وت، فلسفہ عرفان، ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی، سروش، تہران، ۱۳۷۵
- ایزوتسو، توشی ہیکو، خدا و انسان در قرآن، ترجمہ احمد آرام، شرکت سہامی انتشار، تہران، ۱۳۸۱
- جعفری، محمد تقی، ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ج ۱۶، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۶۸
- حسن زادہ آملی، حسن، انسان کامل در نہج البلاغہ، قیام، قم، ۱۳۷۹
- فورمن رابرٹ کی، سی، عرفان ذہن آگاہی، ترجمہ عطا اثری، دانش گاہ مفید، قم، ۱۳۸۴
- قنبری، بخش علی، رنج تنہائی و مثنوی معنوی، پژوہش زبان و ادبیات فارسی، شمارہ ۲۱، تابستان ۱۳۹۰

❖ قنبری بخش علی وهمکاران، طرح پژوهشی بحران های انسان معاصر وراه حل آن در قرآن ونہج البلاغہ ، سازمان تبلیغات اسلامی وپژوهشگاہی علوم انسانی ومطالعات اجتماعی جہاد دانشگاہی، ۱۳۹۱
❖ کربن، ہانری، تخیل خلاق در عرفان ابن عربی، ترجمہ انشاء اللہ رحمتی، جامی، تہران، ۱۳۸۴
❖ لاؤدزو، داء، دہ جینگ، ترجمہ پاشائی، نگاہ معاصر، تہران، ۱۳۸۵
❖ مجلس، محمد باقر، شرح خطبہ متقین، بہ کوشش جویا جہان بخش، اساطیر، تہران، ۱۳۸۰
❖ نصر، سید حسین، معرفت ومعنویت، ترجمہ انشاء اللہ رحمتی، دفتر پژوهش ونشر سہروردی، تہران، ۱۳۸۰

پیغمبر اکرمؐ کی محبوبیت

مؤلف: سید محمد طباطبائی
مترجم: مولانا مقداد حیدر روحانی

محبت معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اسی طرح جیسے اطاعت بغیر محبت کے ممکن نہیں ہے۔ محبت تعلیم وتربیت کا محور ہے۔ حق تعالیٰ نے رسول خدا کی اطاعت کو معیار محبت قرار دیا ہے۔ حبیب خدا کی محبت اور ان کی پیروی انسان کو خدا کا محبوب بناتی ہے۔ اگر نور محبت سے دل روشن ہو جائے تو نسیم محبت کے جھونکے اس پر بغیر وقفہ کے چلنے لگتے ہیں۔ اگر فرشتے کثرت عبادت سے نہیں تھکتے، تو انسان بھی اسی طرح ہو جائے تو اس کے لئے بھی پر تو محبت میں، عبادت سے انس ملال آور نہ ہوگا۔

دعاؤں میں محبت خدا کی اصل شرط اس کے حبیب کی پیروی بتائی گئی ہے اور اس امر کا گناہ اور معصیت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایسے محبوب کا محب ہر رجس سے دور رہتا ہے۔ محبت کی دلپذیر بحث، خصوصاً اللہ اور اولیاء اللہ کی محبت، تڑپتے دلوں کو ترنم بخشتی ہے۔ پس محبت کی بحث کا آغاز ہمیشہ معرفت اور اطاعت کے ساتھ ہوگا۔ انبیاء کرام اپنی محبوبیت کے مطابق مجذوب ہیں اور اس گلدستہ محبت کے حسین ترین پھول پیغمبر اعظمؐ ہیں۔

قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللہَ فاتّبعُونی یُحبِبکُمُ اللہُ وَ یَغفر لَکُم ذُنوبکُم وَاللہُ غَفُورٌ رَّحیمٌ [1] حمد خدای سرمدی کے لئے موزوں ہے جس نے اپنی دعوت اور اپنے محبوب بندوں کی دعاؤں سے، فیضِ دائم کو تضمین فرمایا، تمام تعریفیں اسی کے لئے مناسب ہیں۔ حمد کو نعمتوں کی قیمت، بلاؤں سے حفاظت کا ذریعہ، نعمتوں اور بہشت جاوداں تک پہونچنے کا وسیلہ اور اپنے احسان وکرم میں اضافہ کا وسیلہ قرار دیا۔ انبیاء کرام کی تحیت ابدی خصوصاً حضرت پیغمبر اکرمؐ کو مناسب ہے جو کہ خاتم رسولاں، صدر نشین

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۳۱

محفل کروبیان، معلم ومدرس فرشتگان، ہستیِ عالم کے نور، محبوب حق تعالیٰ اور عالَم کے گوہر یکتا تھے۔ یہ تمام لباس کی منزل میں ہیں جو صرف پیغمبر اسلامؐ کے جسم رعنا ونفیس کے لئے مناسب ہیں۔ بیشمار درود اہل بیت عصمت وطہارتؑ پر مناسب تر ہے جو تاریکیوں میں شمع روشن اور امتوں کی نجات کا وسیلہ ہیں۔ گرانقدر فضیلتوں کا مرکز، برتر اور ہر رجس و نجاست سے پاک۔ حکم خداوند سے ہر بات کا علم رکھنے والے، خصوصاً حضرت خاتم امامت، مہدیِ موعود موجود جو کہ ہر تلخ حادثہ سے حفاظت وصیانت کا اہم ترین وسیلہ ہیں۔ ان ذوات مقدسہ سے تولا اور ان کے معاندین سے تبرا کرتے ہیں۔

اس مقالہ میں پیغمبر اعظمؐ کے کمالات کے بارے میں کچھ گوشے اجمالاً بیان ہوئے ہیں۔ بحث کے ضمن میں اطاعت و معرفت اور محبت کے مابین گہرے تعلق کے بارے میں بھی معلوم ہوگا جن کا شمار معارف اسلامی کے اہم موضوعات میں ہوتا ہے۔

محبت کی بنیاد اور معنی:

کلمہ محبت "حبّ" سے ماخوذ ہے جس کا مخالف "بغض" ہے۔ فارسی میں محبت کے کئی معنی ذکر ہوئے ہیں: دوست داشتن (دوست رکھنا، مصدر متعدی) اور دوستی اور دوست رکھنا (دوست داری، اسم مصدر)[۱]۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں: بندہ سے خدا کی محبت یہ ہے کہ اپنی نعمتوں کو اس پر نازل کرے اور بندہ کی خدا سے محبت یہ ہے کہ خدا سے قریب ہونے کی چاہت رکھے۔ بندہ سے خدا کی محبت حقیقت میں خود اس سے محبت ہے کیونکہ بندہ کا کمال، خدا کے کمال کا جلوہ ہے۔

محبت یعنی چاہت اور جھکاؤ اس شیٔ کی طرف جسے شخص دیکھتا ہے اور خیر سمجھتا ہے جیساکہ آیات اور روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ محبت کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ خوشنودیِ خدا کے لئے محبت و دوستی، جیسا کہ سورہ انسان آیت نمبر ۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ یُطعِمُونَ الطَّعٰامَ عَلیٰ حُبِّہِ مِسکِیناً وَ یَتِیماً وَاَسِیراً یعنی اس کی دوستی اور خوشنودی کیلئے فقیر، اسیر اور طفل یتیم کو کھانا کھلاتے ہیں۔

۱۔ فرہنگ معین، ج ۳، ص ۳۸۹۲

۲. وہ محبت جو فائدہ کی بنیاد پر ہے، جیساکہ سورہ صف آیت نمبر ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے: وَ اُخریٰ تُحِبُّونَهَا نصرٌمِنَ اللهِ وفَتحٌ قَرِیب وَ بَشِّرِ المُومِنِینَ ۔اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو، خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو خوشخبری سنادو۔

۳. فضیلت و بزرگی کے لئے محبت، جیسے اہل علم کی علم سے محبت۔ اکثر محبت کی تفسیر چاہت اور ارادہ کے طور پر کی جاتی ہے، جیسے سورہ توبہ آیت نمبر ۱۰۸ میں ارشاد ہوتا ہے: فِیهِ رِجَالٌ یُحِبُّونَ اَن یَتَطَهَّرُوا واللهُ یُحِبُّ المُطَّهِّرِینَ یعنی اس مسجد میں وہ پاک طینت لوگ جو تہذیب نفس کے مشتاق ہیں، آتے ہیں اور اللہ پاک طینت اور مہذب لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

ہر محبت ارادہ ہے لیکن ہر ارادہ و چاہت، محبت نہیں ہے۔ پس خداوند متعال کی بندوں سے دوستی و محبت وہی بخشش اور نعمتوں کا عطا کرنا ہے اور خدا سے بندوں کی محبت اس کا تقرب چاہنا اور ارادہ کرنا ہے اور اس کے نزدیک قدر و منزلت کا پانا ہے[۱]۔ اصل کلمہ "حُبّ"، "حَبّ" اور "حَبَّہ" ہے جس کا مطلب بیج یا دانہ ہوتا ہے کیونکہ محبوب قلب کے مرکزی حصہ (بیج و دانہ) میں موجود رہتا ہے، اسی وجہ سے محبت کے عنوان کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ حب و محبت بمقابلہ بغض و نفرت، اس چیز کے چاہنے کے معنی میں ہے جسے خیر (اچھا) جانتے ہیں یا خیر کا گمان ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے محبت کو طبیعت کے میلان کی جنس سے مانا ہے، ارادہ کی جنس سے نہیں جیسے باپ کا بیٹے کی طرف طبعی رجحان[۲]۔

معرفت اور اطاعت سے محبت کا رابطہ

محبت، معرفت اور اطاعت کے بیچ ایک واسطہ ہے۔ محبت ایک طرف سے معلول معرفت ہے اور دوسری طرف سے اطاعت کی علت کیونکہ معرفت کے بغیر محبت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح اطاعت بھی بغیر محبت کے حاصل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ محبت تعلیم کا محور قرار پائی۔ پیغمبر اکرمؐ جو حبیب خدا ہیں، اور لوگوں کے لئے معلم و رہنما بنائے گئے ہیں، اپنی اجر رسالت کو عترت طاہرین کی مودّت قرار دیا ہے،

۱۔ مفردات، ج۱، ص ۴۴

۲۔ مجمع البیان، ج۲، ص ۴۵۳

قُل لا اسئلکم علیه اجراً اِلّاالمودۃ فِی القُربیٰ [1] ۔ ترجمہ: اے پیغمبر کہو میں سوائے قرابتداروں کی مودّت کے اجر رسالت کچھ نہیں چاہتا۔

امام جعفر صادقؑ بھی فرماتے ہیں: " جو خدا کی نافرمانی کرے وہ محب خدا نہیں ہے"، اس کے بعد ان اشعار سے استشہاد فرمایا:

تعمی الا لـه وانـت تظهـر حبـه　　　هـذا محـال فـی الفعـال بـديع

لو كـان حبـک صـادق لاطعتـه　　　ان المحـبَّ لمـن يحـب مطيـع

محبت دو چیزوں سے وابستہ ہے، ایک محبوب میں کمال کا ہونا دوسرا اس کی محبت کی معرفت۔ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"اگر نور معرفت دل میں ضیابار ہو جائے تو محبت کی خوشبو پھیلنے لگتی ہے۔" [2]

اسی بنیاد پر ائمہ اطہارؑ معرفت الٰہی کے باب میں کمال کی آخری منزل پر پہونچے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے خدا سے ان کی محبت مکمل محبت ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے اعمال خدا سے عشق و محبت کی مناسبت سے ہیں۔

انسان کامل کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی اور وہ لوگوں کو اپنی طرف نہیں بلاتا بلکہ فقط خدا کی طرف دعوت دیتا ہے اسی وجہ سے اس کی محبت خدا کی محبت ہے۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے: محبت ایسی شئے ہے جو اطاعت اور پیروی کے لئے راہ ہموار کرتی ہے ۔

اطاعت محبت کی پیداوار ہے اور محبت، معرفت کی مرہون منت۔ گویا معرفت، رجحان اور اعمال میں علت و معلول کی نسبت ہے۔ اگر کوئی حق تعالیٰ کا محبوب ہو گیا تو افعال خدا کے آثار اس سے ظاہر ہونگے ۔ دوسری طرف محبت میں کی گئی عبادت کمزوری نہیں لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتوں میں عبادت خستگی کا سبب ہرگز نہیں بنتی۔ عبادت میں عدم نشاط اور تھکاوٹ، فقدان محبت کی وجہ سے ہے۔ دوست سے گفتگو، ہم نشینی اور انس لذت بخش ہوتی ہے نہ ملال آور۔

۱۔ سورہ شوریٰ، آیت ۲۳

۲۔ اذا تجلی ضیاء المعرفت فی النواد هاج ریح المحبت

محبت کی قیمت اور اجرت

عشق یعنی محبت کامل اور صرف عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے بلکہ اس کی قیمت محبوب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جس طرح علم کی قیمت، معلومات سے اور ہنر کی قیمت ہنر کے تعلق سے ہے۔ اس بنیاد پر اگر کوئی پتھر یا پیڑ پودوں کو دوست رکھتا ہے تو اس محبت کی قیمت اس پتھر یا اس پیڑ پودوں کے اندازہ کے مطابق ہے۔ اگر کوئی شخص بہشت سے محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کی قیمت بہشت کی قیمت کے برابر ہے۔ لیکن اگر محبت کا تعلق اللہ کی ذات اقدس سے ہو، تو وہ محبت بے حد و اندازہ ہوگی۔ اگرچہ عشق حیوانی کا مرتبہ وصال محبوب کے بعد سرد پڑ جاتا ہے لیکن عشق الٰہی ہر وقت، سوزندہ تر ہوتا جاتا ہے۔ اس وجہ سے حق کا عاشق اپنے سوز و گداز کو اس طرح بیان کرتا ہے وقلبی بحبک متیّماً [1]۔ امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ انہ کان یقول: اللھم انی اسئلک ان تملا قلبی حبا لک۔ [2] کان یقول کی عبارت استمرار کو بیان کرتی ہے اور یہ قول آنخضرت کی سیرت پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت سید الساجدینؑ بھی فرماتے ہیں: اللھم انی اسئلک ان تملاء قلبی حباًلک، پروردگارا! تیرے محبوں کی دوستی آب حیات ہے اور اس کے علاوہ وبال جان۔ اسی لئے محبت سے لبریز دل کو متیّم کہتے ہیں۔

اگر دل محبت خدا سے لبریز ہو گیا تو غیر خدا کے لئے کوئی جگہ باقی ہی نہیں بچتی، کیونکہ یہ محبت عقلی ہے، محبوب جتنا کامل تر ہوگا، محبت پر فروغ تر ہوگی۔ کبھی کبھی انسان حبّ حلال میں مبتلا ہوتا ہے یعنی کسی چیز سے محبت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتا جیسے اپنے فرزند اور مال سے محبت کرتا ہے لیکن اپنے اعمال عبادی کو بھی انجام دیتا ہے۔ یہ محبت جو دنیاوی امور کے لئے ہے جیسا کہ خداوند سبحان نے فرماتا ہے وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَوَدَّةً وَرَحمَةً [3] یہ حرام نہیں ہے لیکن مانع کمال ہے مگر یہ کہ وہ دینی رنگ میں ہو جیسے حضرت رسول اکرمؐ کی محبت اپنے اہل بیت عصمت و طہارت کے لئے، جیسے ماں باپ کی محبت اپنے مومن فرزند کے لئے۔ اگر ایسے دل کو متیّم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اس محبت کی لذت کو چکھ لے گا تو دوسری محبت کے پیچھے نہیں دوڑے گا کیونکہ اس کے بعد عاشق حق کا عشق متواتر بڑھتا جائے گا۔

۱۔ دعاء کمیل
۲۔ دعای ابو حمزہ ثمالی
۳۔ سورہ روم، آیت ۲۱

آدمی مادی نشہ میں ایک پیالے سے سیراب ہوجاتا ہے لیکن ملکوتی نشہ میں ایک پیالہ آب پینے سے درد عطش کے بغیر پینے کا شوق اور بڑھ جاتا ہے، اس بناپر، محبت ایک ایسا کمال ہے جس سے انسان جتنا زیادہ آراستہ ہوگا، اتناہی عالم ،شایق اور طالب ہوگا۔قرآن میں ارشاد ہوتا ہے مَن جَاء بالحَسَنَة فَلَهُ خَيرٌ مِّنْها[۱] ہر شخص جو نیک عمل انجام دے تو اس سے بہتر جزا پائے گا۔ مَن جَاء بالحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمثَالها ہر شخص جو نیک عمل انجام دے، اس کے دس برابر جزا پائے گا۔[۲]

اصل الٰہی کی محکم بنیاد یہ ہے کہ انسان محبت کے ذریعہ محبوبیت حاصل کرتا ہے جبکہ ان دونوں کے بیچ بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ حق تعالیٰ نے مغفرت کے اجر کا بھی وعدہ فرمایا ہے: وَ يَغفِر لَكُم ذُنُوبَكُم۔ جیسا کہ بندہ کی نصرت کے بدلے میں مدد اور استقامت کا بھی وعدہ فرمایا ہے: اِن تَنصُرو اللهَ يَنصُركُم وَ يُثَبِّت اَقدَامَكُم[۳] ترجمہ: اگر خدا کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدم بھی رکھے گا۔

خداوند متعال، ظرف محبت کو جام محبت سے بھر دیتا ہے اور گناہوں کو بھی بخش دیتا ہے، کیونکہ محبت سے جو فعل حق تعالیٰ ہے مغفرت سمجھ میں آتی ہے لیکن مغفرت سے محبت کو نہیں سمجھا جا سکتا چونکہ ایسا نہیں ہے کہ جہنم سے نجات پانے والے تمام افراد حق تعالیٰ کے محبوب ہوں، جو محبوب ہوتا ہے اس کا حساب الگ ہے۔ پیغمبرؐ کی اطاعت و پیروی، خدا سے دوستی و محبت کی علامت ہے اور یہی عفو الٰہی کا سبب ہے اور پیغمبر اسلامؐ کا گفتار و کردار انسانوں کے لئے محبت ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت کے ساتھ ہے۔اس لئے جہنم سے نجات پانا کہاں اور حوض کوثر کے کنارے حق تعالیٰ سے ملاقات کی نعمت اور اس کے محبوبوں سے بہرہ مند ہونا کہاں؟

حق تعالیٰ کی محبت کے آثار

محبت فعل خدا کا اثر ہے اور ہر محبت اپنے آثار کو محبوب میں ظاہر کرتی ہے۔ اسی لئے محب خدا، رسول اعظمؐ کی پیروی کی وجہ سے محبوب خدا ہو جاتا ہے اور اس منزل پر پہونچ جاتا ہے کہ اپنا سب کچھ راہ خدا میں نثار کر دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ آیت نمبر ۵۴ میں اس طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ سورہ نمل، آیت ۸۹
۲۔ سورہ انعام، آیت ۱۶۰
۳۔ سورہ محمد، آیت ۷

" اگر کوئی دین سے خارج ہو جائے تو نظام دینی کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا ہے کیونکہ خداوند عالم ایسوں کو لاتا ہے جو اسکے محب اور محبوب ہیں۔ مومنین خاضع اور سرفراز، سرکش کافروں کے مقابلہ میں آخری لمحہ تک مقاومت کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں، وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتے اور خدا کے فضل خاص کے حامل ہیں۔"

اس طرح کے افراد تین قسم کے رابطے رکھتے ہیں:

۱. محبت کی بنیاد پر حق تعالی سے رابطہ
۲. تواضع کی بنیاد پر مومنین سے رابطہ
۳. عزت کی بنیاد پر کافروں سے رابطہ (بلند فطرت اور گردن نہ جھکانا)

اس منظر سے انسان اس دنیا میں ہر گز بغیر کسی ذمہ داری کے نہیں ہے بلکہ ہر مرحلہ میں اس پر خاص ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ دوسروں کے ساتھ ولا یخافون لومة لائم کی بنیاد پر احیائے دین کے لئے ہمت کرے اور ہر حال میں خوف و رجاء کی حالت میں اپنے عمل کے ذریعہ محبت کی آبیاری اور اس کی حفاظت کرے اور اس منزل پر پہنچ جائے جہاں خدا کے علاوہ اسے کچھ نظر نہ آئے۔

محبت کی وادی میں دعاؤں کے ساتھ

ائمہ اطہارؑ کی دعاؤں میں خصوصاً مناجاتوں میں محبت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ ان دعاؤں میں محبت کی تصویر اس حد تک ہے کہ اگر اس کو نکال دیا جائے تو دعائیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ اس طرح کی دعاؤں میں اللہ تعالی سے محبت کی اصل شرط، حبیب خدا کی پیروی بتائی گئی ہے اور محبت اور محبوب ہونا، محبوب کی اطاعت اور اس کی ترک معصیت میں مضمر ہے۔

انسان جب محبت الٰہی کے ذائقہ کو چکھ لیتا ہے تو اس کی گفتگو کا انداز کچھ اس طرح ہو جاتا ہے:

الهی مَن ذاالذی ذاق حلاوة محبتك فرام منك بدلاً

ترجمہ: جس نے محبت کی شیرینی کو چکھ لیا، دوسری کون سی چیز بچتی ہے کہ تجھے چھوڑ کر اس کی طرف جائے؟

پھر دوسرے فقرہ میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

ما جعلنا ممن اصطفیته لقربك و ولایتك...واخلصته لودّك و محبتك- حضرت اس قیمتی تعبیر میں خدا سے خالص ہونے کے لئے چاہ رہے ہیں۔یعنی مجھے ان لوگوں میں قرار دے جن لوگوں کو تو نے اپنی محبت اور دوستی کے لئے خالص بنایا اس طرح سے کہ خدا کے علاوہ ان کے دلوں میں کچھ نہیں ہے۔

امام علیہ السلام نے اس کے بعد فرمایا: وفرغت فرادة لحبك یعنی خدایا مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے، جن کے دلوں کو اپنی محبت کے لئے دیگر چیزوں سے خالی کر دیا ہے۔انسان کا دل جب تک غیر خدا سے خالی نہ ہو تب تک محبت خدا کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔انسان کا پہلا کام یہ ہے کہ دل کے باغیچہ میں کھلنے والے غنچے کو دیکھے کہ کیا وہ محبت کے غنچے ہیں یا غضب کے؟ محبت کے غنچوں کی حفاظت اور آبپاشی کرنا چاہئے تاکہ کونپلیں نکل سکیں لیکن غضب کی گھاس وپھوس کو صاف کر لینا چاہئے تاکہ قلب محبت کے لئے آمادہ ہو جائے۔ عرفان ہے جو محبت لاتا ہے، شناخت ہے جو شوق پیدا کرتی ہے۔عرفان اور شناخت کے بغیر محبت ممکن ہی نہیں ہے۔عارف عاشق خلوت خانہ راز میں اپنے محبوب اور معشوق حقیقی سے اس طرح راز و نیاز کرتا ہے:

یا منی قلوب المشتاقین ویا غایة آمال المحبین اسئلك حبك و حبُّ من یحبك وحبُّ كل عمل یوصلنی الی قربك۔

یعنی اے چاہنے والوں کے دلوں کی آرزو! اے محبوں کی چاہت کی آخری منزل! تیری محبت، تیرے دوستوں کی محبت اور ہر اس کی محبت جو مجھے تجھ تک پہونچائے، تجھ سے درخواست گذار ہوں۔ محبین کا اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہے اور وہی ہستی کی حقیقت، کمال مطلق، جمال مطلق، وہی حقیقۃ الحقائق، محبوں کی چاہت اور عارفین کی نورانی جان ہے۔

اتباع دو طرفہ محبت ہے

قرآن کریم میں رسول خداؐ کی تبعیت کو محبوب ہونے کا واحد راستہ بتایا گیا ہے [۱]۔اگر ہر تابع اپنے متبوع سے مربوط ہے اور ہر بچہ اپنے والد سے متعلق ہے تو حبیب خدا کا پیروی کرنے والا، حبیب خدا اور

۱۔ قل ان كنتم تحبون الله... (سورہ آل عمران، آیت ۳۱)

خلیل خدا کا تابع ہوگا۔ یہ اصل کلی قرآن کریم کی اس آیہ کریمہ سے ماخوذ ہے: فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَن عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ ترجمہ: جو بھی میری پیروی کرتا ہے وہ مجھ سے ہے اور جو بھی میری مخالفت کرتا ہے پس بیشک تو مغفرت کرنے والا اور مہربان ہے۔[1]

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۸ میں ارشاد ہوتا ہے إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ۔ ترجمہ: ابراہیم سے سب سے قریب وہ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ پیغمبر اور وہ امتی جو اہل ایمان ہیں، اور خدا مومنین کا دوست ہے۔ یہ آیت شریفہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ محبت دوطرفہ ہوتی ہے اور پیغمبرؐ کے پیروکار بھی محبوب ہونگے۔

اس کے بعد دوسری جگہ پر ارشاد ہوتا ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ[2]
ترجمہ: جو لوگ آپ کی پیروی کرتے ہیں، ان کے لئے اپنے بازؤں کو جھکادو۔

اس آیت میں جس چیز کا حکم ہوا ہے اسے محبت آمیز اور عاطفی عمل کہتے۔ پس اگر کوئی نبی اکرمؐ کا تابع ہوگا تو وہ حبیب خدا بھی ہوگا اور رسول خدا کا بھی محبوب ہوگا۔ اس طرح سے کہ آنخضرت اس پر مہربانی کا سایہ ڈال دیں گے اور یہ تمام آثار اس صورت میں ہیں جب محبت دوطرفہ اور سچی، مکمل اور مستمر پیروی ہو۔

ابو بصیر حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ پانچ گروہ کو نیند نہیں آتی، ان میں سے ایک گروہ محبوں کا ہے، محبوب کے دور ہوجانے کے ڈر سے ان کی آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔[3] یہ سنت رسول خداؐ ہے اور ہم بھی اس کی پیروی کے لئے مکلّف ہیں۔

جی ہاں! محبوب کے دور ہوجانے کے ڈر سے محب کی نیند اڑ جاتی ہے[4]۔ رسول خداؐ اللہ تعالی کے حبیب ہیں اور محبوب سے دور ہونے کے خوف سے ہمیشہ وصال میں ہیں اور ہم سے بھی آپ نے فرمایا ہے کہ اگر خدا کے محب ہو تو حبیب خدا کی پیروی کرو تاکہ محب سے محبوب بن سکو۔ اگر خدا انسان کا محب ہوجائے تو ایسے محبوب انسان سے خدائی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کی پیروی اور ان

۱۔ سورہ ابراہیم، آیت ۳۶
۲۔ سورہ شعراء، آیت ۲۱۵
۳۔ وَالمُحبُّ حَبِيباً يَتوقَّعُ فِرَاقُه (من لا يحضره الفقيه، ج۱، ص ۵۰۳)
۴۔ عجباً لِمُحِبِ كَيفَ يُنام (معراج السعاده، ص ۷۴۴)

جیسا بننے کا طریقہ محبت ہے۔ خلیل اللہ کا اتباع اور حبیب اللہ کی اطاعت کے نتیجہ کے بارے میں حضرت حق تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ سے حکایت فرماتا ہے فَمَن تَبِعَنِي فَاِنَّهُ مِنِّي [1]۔ ترجمہ: جو بھی میری پیروی کرے بیشک وہ مجھ سے ہے۔

رسول خدا کی اطاعت کے بارے میں بھی آیا ہے: وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيهِم مِنَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَ حَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقاً [2]۔ ترجمہ: جو لوگ خدا اور رسول کی پیروی کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہونگیں جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی پیامبروں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین، اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔

محبت الٰہی میں سب کچھ قربان

جیسا کہ کہا گیا ہے ایک دل میں دو محبوب کی جگہ نہیں ہوتی کیونکہ اصلی محبوب کو حاصل کرنے کے لئے دل وجان کو فرعی اور نقلی محبتوں سے خالی ہونا چاہئے۔ یہ محبت مندرجہ ذیل خصوصیات کے قالب میں ہوتی ہے:

۱. طبعی لذائذ سے دوری اور خصوصاً پرخوری سے پرہیز: امام صادقؑ، پیغمبر اسلامؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ثلاث اخافهن علی امتی من بعدی: الضلالة بعدالمعرفة ومضلات الفتن وشهوة البطن والفرج [3]۔

۲. اچھے اور پاکیزہ مال سے انفاق: سورہ آل عمران آیت نمبر ۹۲ میں ارشاد ہوتا ہے: لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ ۔ ترجمہ: ہر گز نیکی کے درجہ پر فائز نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے راہ خدا میں خرچ نہ کروگے۔ جو بھی شئے تم خرچ کرتے ہو بیشک اس کو خدا جانتا ہے۔ مقام ابرار کو نہیں پہونچ سکتے اور محبوب حق نہیں بن سکتے مگر اس چیز سے جسے تم دوست رکھتے ہو انفاق کرو،

۱۔ سورہ ابراہیم، آیت ۳۶
۲۔ سورہ نساء، آیت ۶۹
۳۔ کافی، ج۲، ص۷۹

انفاق کرنے سے ہر چیز سے انس ختم ہو جاتا ہے اور انسان آزاد ہو جاتا ہے۔ اس وقت محبت خدا کے راستے انسان کے لئے کھول دئے جاتے ہیں۔

۳۔ دنیا سے بغض: کیونکہ دنیا کی دوستی ہر خطا کی بنیاد ہے[۱]۔ پس محبت حق تعالیٰ تک پہونچنے کے لئے جس کا ہر شخص طالب ہے، دنیا سے نفرت کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سب سے اہم عامل جو انسان کو محب خدا بناتی ہے وہ دنیا سے نفرت ہے۔ دو شئے متضاد کو ایک ظرف میں رکھنا دونوں کے فساد کا باعث ہے یا کم از کم ان میں سے ایک کے لئے فساد کا باعث ہوتا ہے۔ حب الٰہی روشن خورشید کے مانند ہے اور محبت دنیا تاریک رات جیسی ہے۔ وہ لوگ پاک دلوں اور عشق خدا سے مالا مال فقط اسے طلب کرتے تھے اور حضرت حق سے چاہتے تھے کہ نونہال شوق کو ہمارے دلوں میں سر سبز اور با صفا بنائے۔ اپنی سوز محبت کو ان کے قلب پر مسلط کردے اور دوسروں کو بھی اسی طرح سفارش کرتے تھے[۲]۔

پس تنہا خداوند متعال محبوب حقیقی ہے اور دوسرے محبوں سے محبت چونکہ محبت الٰہی کی طرف لیجاتی ہے لہذا جائز ہے اور اگر ان دونوں کے بیچ تعارض پیش آئے، تو عشق الٰہی کو چننا چاہئے اور اسے تمام دوستیوں پر ترجیح دینا چاہئے۔

پیامبر اعظمؐ مدرّس محبت

اگر انسان کی بندگی آنحضرتؐ کی محبت کے محور پر استوار ہو تو رسول اعظمؐ کا وجود مبارک مدرس محبت ہوگا۔ محبت کی راہ کے مسافر جب تک کہ محب ہیں، طالب ہیں لیکن جب محبوب بن گئے تو خوشحالی میں ہیں اور کوئی رکاوٹ ان کی وضع قطع کو مٹا نہیں سکتی۔ حضرت حق تعالیٰ سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۸ میں ارشاد فرماتا ہے: لاتَقُم فیهِ اَبداً لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِن اَوَّلِ یومٍ اَحَقُّ اَن تَقُومَ فیه فیه رِجالٌ یُحِبّونَ اَن یَتَطَهَّروا واللهُ یُحِبُ المُطَّهّرینَ۔ آیت مذکورہ سے استفادہ ہوتا ہے کہ تقویٰ

۱۔ حبُّ الدنیا راس کل خطیئة (کافی، ج۲، ص۱۳۱)

۲۔ احبوا الله من کل قلوبکم (کنز العمال، ج۱۶، ص۱۲۶)

محبت تک پہونچنے کا راستہ ہے اور رسول خدا مدرس اور مربی محبت ہیں۔ نبی اکرمؐ نے خداوند متعال سے چاہا کہ اپنی ذات اقدس کی محبت کو ان کے لئے آب شفاف سے زیادہ شیرین اور محبوب قرار دے[۱]۔

اگر چہ اہل تقویٰ، توبہ اور طہارت محبوب خدا ہیں لیکن کوئی بھی محبوب پیغمبر اسلامؐ جیسا عظیم نہیں ہے کیونکہ آنحضرتؐ حق تعالیٰ کی محبت کاملہ کا مظہر ہیں۔ اسی وجہ سے خدائے سبحان نے رسول خداؐ کو محور و مدرس محبت بنایا ہے۔ حبیب اللہ کی محبت انسان کو محبوب خدا بناتی ہے، کیونکہ جو پیغمبرؐ کو دوست رکھتا ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ آپ کے جیسے اخلاق سے متصف ہو جائے، اسی لئے آپ کی اطاعت کرتا ہے اور اس طرح کی اطاعت انسان کو متعالی اور محبوب خدا بناتی ہے۔

اسی لئے امام حضرت باقر العلومؑ نے فرمایا: ایک دن رسول اعظمؐ نے لوگوں کے درمیان فرمایا: واحبوا الله لما یغذوکم به من نعمه واحبونی الله عزوجل واحبوا قرابتی لی[۲]۔ خداوند متعال کی طرف راغب رہو کیونکہ تمہارے جسم وجان کی غذا فراہم کرتا ہے۔ رضائے خدا کے لئے میری طرف راغب رہو کیونکہ اس کے فیض کا خزانہ مَیں ہوں، میرے اہل بیت کی طرف راغب رہو کیونکہ میرے اہلبیتؑ میرے اور تمہارے درمیان واسطہ ہیں۔

مشہور ومعروف عارف جناب محی الدین ابن عربی اور علامہ قیصری شرح فصوص الحکم میں حضرت نوح سے مربوط ایک ظریف نکتہ بیان فرماتے ہیں: رسول اکرم کی منزلت اسم اعظم اور قرآن کی منزلت کے برابر ہے جو مقام فرقان اور مقام جمع الجمع سے بالاتر ہے۔ آپ نے لوگوں کی تبلیغ میں تنزیہ و تشبیہ کے بیچ جمع کر دیا ہے لَیسَ کَمِثلِهِ شَیءٌ وَهُوَ السَّمیعُ البَصیرُ[۳]۔ اسی لئے آنحضرتؐ کی تبلیغ کامیاب تھی۔

محبت کی دلپذیر خوشبو، خصوصاً خداوند اور اولیاء الٰہی کی محبت نے مردہ دلوں کو ترنم عطا کی۔ محبت کی شیرینی ہر شخص کے لئے وہی ہے جو وہ شخص دل میں رکھتا ہے۔ اسلام محبت کا قانون ہے اور پیغمبر اسلامؐ کائنات عالم کے لئے رحمت بنائے گئے ہیں[۴]۔

۱۔ واجعل حبك احب الی من الماء البارد (محجۃ البیضاء، ج۶، ص۸)

۲۔ بحار الانوار، ج۱۷، ص ۱۴

۳۔ سورہ شوریٰ، آیت ۱۱

۴۔ وما ارسلناك الا رحمة للعالمین، (سورہ انبیاء، آیت ۱۰۷)

پیغمبر اسلامؐ عشق و محبت کے آئیڈیل ہیں لیکن وہ محبت جس کا حکم قرآن کریم دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص سے اس طرح پیش آیا جائے جس سے وہ خوش ہو جائے اور دین حق کو قبول کرے۔ محبت وہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو اس کی میلان طبع پر آزاد چھوڑ دیا جائے اور ان کے میلانات کو صحیح ٹھہرایا جائے۔ محبت وہ ہے جو حقیقت کے ساتھ ہو۔ محبت بھلائی پھیلانا ہے ۔

محبت وہ ہے جس میں جامعہ بشریت کے لئے بھلائی اور مصلحت ہو نہ کہ ایک فرد یا ایک گروپ کے لئے۔ البتہ محبت واقعی ہمیشہ کافی نہیں ہے، بلکہ کبھی کبھی ایک طرح کی گرمی و شدت کی بھی ضرورت ہے۔ جذابیت کے ساتھ ساتھ مدافعت بھی لازم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے محمدؐ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں ان کے ساتھی کافروں پر بہت سخت گیر ہیں اور آپس میں دلسوز و مہربان ہیں۔ [1]

پیغمبر اعظم محبوب اور مجذوب حق تعالیٰ

خداوند متعال سورہ آل عمران آیت نمبر ۳۱، میں اس اہم موضوع کو بیان فرماتا ہے: قُل اِن کُنتُم تُحِبّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونی یُحبِبْکُمُ الله، جو بھی خداوند متعال کا محبوب بننا چاہتا ہے اسے حبیب خدا کا تابع ہونا چاہئے۔

آنحضرتؐ کے محبوب ہونے کا راز تفصیل سے الگ الگ آیتوں میں بیان ہوا ہے، جیسے :

اِنَّ اللهَ یُحِبُّ التَّوّابِینَ وَ یُحِبُّ المُتَطَهِّرِینَ [2]

اِنَّ اللهَ یُحِبُّ المُقسِطِینَ [3]

پیغمبر اکرمؐ طہارت کے لئے آئیڈیل ہیں ان کے متبعین کو چاہئے کہ طہارت میں ان کی اقتدا کرکے مطہر و محبوب بن جائیں ۔آنحضرتؐ قسط و عدل کا نمونہ ہیں لہٰذا انصاف چاہنے والے آپ کی پیروی کرتے ہیں یعنی پیغمبر اکرمؐ ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں خداوند متعال کے تمام اسماء حسنیٰ کا عکس نظر آتا ہے۔ کوئی بھی

۱۔ محمد رسول الله والذین معه اشدّاء علی الکفار رحماء بینکم ....۔(سورہ محمد، آیت ۲۸)
۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۲۲
۳۔ سورہ مائدہ، آیت ۴۲

شخص ایسا نہیں ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے مانند توحید اور خدا کے اسماء حسنیٰ کا عکس کامل نظر آئے۔اس لئے آپ محبوب ہیں اور آپ کے ساتھ رہنے والے بھی محبت سے اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ،لوگوں سے کہو اگر دوست اور محب خدا ہو تو میری پیروی کرو تاکہ محبوب خدا بن جاؤ۔محب خدا اور مجذوب خدا کو چاہئے کہ کوشش کرے تاکہ محبوب خدا بن جائے۔حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ خود خدا کی طرف گئے لیکن پیغمبر اسلامؐ کو خداوند متعال نے خود بلایا۔جانے اور لے جانے میں سلوک اور جذبہ کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔سالک لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے جاتا ہے لیکن مجذوب برق رفتاری سے جاتا ہے۔نبی اکرمؐ کی معراج کے بارے میں آیا ہے: خطوته مدّالبصر ،معراج میں پیغمبرؐ کے براق کا ہر قدم چشم زدن جیسا تھا۔ یہ امر اسی نکتہ کی حکایت کر رہا ہے۔یعنی ہر ایک قدم دید چشم کے مطابق مسافت طے کی ہے۔ چنانچہ سالکان حقیقی کے بارے میں حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ (خ۲۲۰) میں فرمایا: قد احيا عقله و امات نفسه ...و برق له لامع كثير البرق فابان له الطريق و سلك به السبيل ...،خداوند متعال اپنے محبوب کو سرعت کے ساتھ لے جاتا ہے،لازم نہیں ہے وہ تدریجاً اور آہستہ قدم رکھے۔

اسی بنیاد پر حضرت سجادؑ نے بھی دعای ابوحمزہ ثمالی کے الفاظ میں ارشاد فرمایا: بحبّی النبی الامّی القريشی الهاشمی العربی التهامی المكی ارجو الزلفه لديك، پیغمبر امی ،قرشی ،ہاشمی ،عربی ،تہامی، مکی ،مدنی کی دوستی کے وسیلہ سے تیرے نزدیک تقرب کی امید رکھتا ہوں۔وہ حق تعالیٰ سے چاہتا ہے کہ اس کی جان کو اپنے طریقہ سے اور اپنے پیغمبر کے دین پر قبض کرے۔ وتوفنی فی سبيلك وعلی ملة رسولك۔

انبیاء الٰہی محبوبیت کے مطابق مجذوب ہیں اور اگر صرف محب ہیں اور ابھی تک محبوب نہیں ہوئے ہیں تو سالک ہیں لہٰذا ان کی سیر ، سلوک و جذبہ کے ساتھ ہے۔اس کے برخلاف پیغمبر اکرمؐ محبوب خالص اور مجذوب محض ہیں اور لازماً تفسیر انبیاء جو مفسران کلام الٰہی ہیں جذبہ اور سلوک کا معجون ہے لیکن پیغمبر اعظم کی تفسیر ، تفسیر خالص اور جذبہ محض ہے۔اسی لئے بہشتیوں کی شراب بھی ایک جیسی نہیں ہے۔

بعض باب تسنیم کے چشمہ خالص سے اپنا جام پُر کریں گے ۔بعض ملی ہوئی شراب نوش کریں گے [1] یعنی چشمہ تسنیم کی خالص شراب مقربوں کے لئے ہے اور اس کا مخلوط پرہیزگاروں کے لئے ، اور اسی طرح شراب کافور اور شراب زنجبیل۔ایسی جگہوں پر امتزاج سے مراد وہی ممزوج محبت اور محبوبیت و سلوک ہے نہ کہ فاسد شراب یعنی حق سے باطل کی طرف کیونکہ سارے اولیاء الٰہی کی شخصیت اس سے مطہر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالی جب اپنے محبوبوں کا تعارف کراتا ہے تو انہیں محسنین، مطہّرین، توابین، متّقین ، صابرین ، متوکلین اور مقسطین جیسے صفات سے یاد کرتا ہے اور فرماتا ہے وہ مجاہد جو مثل آہن دشمنان دین الٰہی کے مقابلہ میں مقاوم اور مستحکم ہوتا ہے، اللہ تعالی اسے دوست رکھتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ بھی کفر، نفاق اور شرک کے مقابلہ میں شیشہ پلائی ہوئی دیوار جیسے تھے۔ حضرت علیؑ کی فرمائش کے مطابق کامل بن اثیر کی نقل کی بناپر، پیغمبر اکرمؐ شیشہ پلائی ہوئی دیوار کے جیسے سنگین سانحات سے امان میں تھے۔جس وقت جنگ کے شعلے بھڑکتے تھے ہم آنحضرتؐ کے نزدیک پناہ لیتے تھے جب میدان جنگ میں آنحضرتؐ کے نزدیک ہوتے تھے تو ایسے امن کا احساس کرتے تھے جیسے پناہ گاہ میں پہونچ گئے ہوں جب کہ آنحضرت میدان کے درمیان میں ہوتے تھے [2]۔

نبی اعظم محور محبت ہیں لہٰذا آپ خود حق اور باطل کے درمیان فارق بھی ہیں۔آپ کی پیروی بہت زیادہ برکتوں کی حامل ہے۔

حضرت ختم المرسلینؐ ایسے جاذبہ کے حامل تھے کہ خداوند عالم نے ان کے خلق عظیم پر فائز ہونے کی تعریف کی ،اور ایسے ہی فرد کو ہر طرح سے لوگوں کے لئے نمونہ ہونا چاہئے ،چنانچہ خداوند متعال نے آنحضرتؐ کا نمونہ اور اسوہ کے عنوان سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا: ”اگر بعض مشکلوں میں تنہا ہو تو اس مشکل کے حل کے لئے پیغمبر کی اقتدا کرو۔“ کیونکہ صدر اسلام میں جنگ کی مشکلوں کو صرف رسول خداؐ حل کرسکتے تھے۔

۱۔ مزاجہ من تسنیم عیناً یشرب بھا المقربون (سورہ مطففین، آیت ۲۷۔۲۸)
۲۔کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۳۰۴

پیغمبر اعظمؐ کی مہربانی اور رحمت

خداوند متعال نے بعض انبیاء کے بارے میں لفظ برادر یعنی بھائی کا استعمال کیا ہے، مثال کے طور پر ارشاد ہوتا ہے :

قوم ثمود کے لئے ان کے بھائی صالح کو مبعوث کیا [۱]۔

قوم عاد کے لئے ان کے بھائی ہود کو بھیجا [۲]۔

اس وقت جبکہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا [۳]۔

لیکن نبی رحمۃ للعالمین کے لئے ارشاد ہوتا ہے: ھوالّذی بعث فی الامیین رسولاً منھم۔ [۴]

دوسری جگہ ارشاد ہوتا لقد جائکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم [۵]۔ایک پیغمبر تم میں سے تمہارے لئے مبعوث ہوا تمہارا انحراف اس کے لئے بہت سخت ہے، حرص اور شوق کے ساتھ کوشش کرتا ہے تاکہ تم سب مومن بن جاؤ، وہ مومنین کے لئے مہربانی اور رحمت خدا کا مظہر ہے۔

ہر فعل کی صفت ، فعل کے مقام اور اس کے موصوف سے نکلتی ہے ،نہ کہ اس کی ذات سے۔وہ مکان جو مہربانی اور رحمت کے ظاہر ہونے کی جگہ ہے وہ جگہ امکانی ہے اور وہی رؤف اور رحیم کی جگہ ہے اس کا بارز مصداق اور مظہر پیغمبر اعظمؐ ہیں۔

خداوند متعال خود اپنے لئے رحمت عام اور رحمت خاص کا قائل ہے اور ان دونوں خصوصیات کو قرآن اور پیغمبر اسلامؐ سے بھی نسبت دی ہے : رحمتی وسعت کل شئی [۶]۔ پیغمبر اکرمؐ وہ رحمت عامہ ہیں جس سے ہر کوئی تکوینی اور غیر تکوینی فائدہ حاصل کرتا ہے۔حضرت امیر المومنینؑ سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبر

۱۔ سورہ اعراف، آیت ۷۳

۲۔ سورہ ہود، آیت ۵۰

۳۔ سورہ شعراء، آیت ۱۰۶

۴۔ سورہ جمعہ، آیت ۲

۵۔ سورہ توبہ، آیت ۱۲۸

۶۔ سورہ اعراف، آیت ۱۵۶

اسلامؐ کے ساتھ ہم چل رہے تھے، کسی بھی درخت یا پتھر کے پاس سے جب ہم گزرتے تو وہ پتھر یا درخت آنحضرت کو سلام کرتا [۱]۔ ہاں ہر شئے رحمت خاصہ کے سامنے خاضع ہے۔ نبی اعظم اسلام اسم اعظم بھی ہیں اور مظہر اسم اعظم بھی، خدائے سبحان کی رحمت مطلقہ کے مرتبہ میں حضور اور ظہور رکھتے ہیں لیکن آپ کی اساس تعلیم اور تربیت فقط رحمت خاصّہ ہے۔ رحمت خاصّہ، غضب کے مقابل میں ہے۔ خدائے سبحان فقط مومنین کے لئے رؤف ہے گرچہ اس کی رحمت عامہ ہر ایک کے شامل حال ہے۔

حق تعالیٰ نے رحمت خاص کے حدود کو معین کرنے کے بعد اس کے مظہر کو بھی دنیا والوں کے سامنے پیش کیا: وَمَا اَرسَلنٰكَ الاّ رَحمَة للعَالمین [۲]۔ آپ عالمین کے لئے رحمت خاص ہیں کیونکہ آپ کا راستہ راہ ہدایت اور سعادت ہے جو بھی ان دونوں کو قبول کرے گا، وہ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کامیاب ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں ارشاد ہوتا ہے فَبِمَا رَحمَةٍ مِنَ اللهِ لِنتَ لَهُم وَلَو کُنتَ فَظّاً غَلیظَ القَلبِ لَانفَضُّوا مِن حَولِكَ۔ ترجمہ: (اے محمد) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتاد طبع ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

خداوند متعال پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: حق تعالیٰ کی رحمت خاص اس میں جلوہ گر ہے اور وہ اس کا مظہر بن گیا ہے کیونکہ خداوند عالم مومنین پر مہربان ہے [۳] اور پیغمبر بھی ایسے ہی ہیں [۴]۔ اس لئے خدا کا فضل، آئینہ پیغمبر میں منعکس ہو کر دوسروں تک پہونچتا ہے۔ قرآن کریم اس آئینہ کا ہمیں تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: اگر چاہتے ہو کہ رحمت خداوند تمہارے شامل حال رہے تو اس آئینہ کے سامنے کھڑے رہو اور پیغمبر کی پیروی کرو۔

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: گویا غم واندوہ کی زیادتی سے جان دیدوگے [۵]۔ اور دوسرے

۱۔ کافی، ج ۱، ص ۴۴۶

۲۔ سورہ انبیاء، آیت ۱۰۷

۳۔ وکان بالمومنین رحیماً (سورہ احزاب، آیت ۴۳)

۴۔ بالمومنین رؤف رحیم (سورہ توبہ، آیت ۱۲۸)

۵۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفسَكَ عَلٰی آثَارِهِم اِن لَم یُومِنوا بِهٰذا الحَدیثِ اَسفاً (سورہ کہف، آیت ۶)

موقع پر ارشاد ہوتا : فَلا تَذهَب نَفسكَ عَلَيهِم حَسَرات ،ایسا نہ ہو کہ تمہاری جان ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر چلی جائے۔

محب سے محبوب حق ہونے تک

خداوند عالم قرآن کریم میں ہمیں حکم دے رہا ہے کہ جب راہ طے کرکے محب حق ہو گئے تو اسی مرحلہ پر اکتفانہ کرنا اور صراط مستقیم کے لئے ہمت رکھنا تاکہ خداوند متعال بھی آپ کا محب ہو جائے اور تم اس کے محبوب بن جاؤ۔اس راہ کے طے کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ سے انسان زیادہ متواضع، پاک، صادق، عادل اور متقی بن سکتا ہے۔یہاں تک کہ دوسروں کو بھی تیز رفتاری اور سبقت کے لئے آمادہ کیا جاسکتا ہے۔سالکین اور متقین کا پیشوا بنا جاسکتا ہے۔اگر چہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۱ میں محب رہنا اور محبوب خدا ہونا، حضرات ائمہ اطہار سے مختص نہیں کیا گیا ہے لیکن وہ حضرات نمونہ اور رہبر کامل ہیں اور ایسی خصوصیات کے حامل ہیں جن کو یہ آیت بیان نہیں کرتی ہے۔

انسان کسی راستہ کو طے کرنے کے لئے رہنما کا محتاج ہے۔دوست ہونے کے لئے بھی خداوند متعال نے اپنے حبیب سے فرمایا کہ لوگوں سے کہو: اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اس کے محبوب بن سکو[۱]۔ حضرت خاتم الانبیاء اس جہت سے حبیب خدا ہیں، ان کی رسالت پیغام محبت کا پہونچانا ہے کیونکہ سالکان کی علمی اور عملی سیرت درس محبت دینا ہے۔اسی طرح آنحضرت نے اپنی وصیت میں جناب ابوذر غفاریؓ سے فرمایا: اے اباذر اگر سمجھنا چاہتے ہو کہ خداوند متعال کے نزدیک محبوب ترین انسان کون ہے تو دیکھو کہ کون شخص دوسروں سے زیادہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے[۲]۔ خداوند متعال کے نزدیک محبوب ترین انسان، متقی ترین شخص ہے۔اس بات کو سورہ حجرات آیت نمبر ۱۳ سے اخذ کیا جاسکتا ہے[۳]۔

محبت الٰہی اور اس راستہ کو طے کرنے کے بارے میں حدیث شریف معراج کے فقروں میں آیا ہے:یا محمد وجبت محبتی للمتحابین فی و وجبت محبتی للمتقاطعین فی و وجبت محبتی

۱۔ قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونی ...
۲۔ اِنَّ اَحَبَّکُم اِلَی اللهِ اَکثَرُکُم ذِکرًالله
۳۔ اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَاللهِ اَتقَاکُم

للمتواصلین و وجبت محبتی للمتوکلین علیّ و لیس لمحبتی علم ولا نهایة و کلما رفعت لهم علماً[1]۔

خداوند متعال، پیغمبر اسلام کو مخاطب کرکے فرماتا ہے: میری محبت چار قسم کے انسانوں پر واجب ہے:

۱. وہ لوگ جو میرے لئے ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں۔

۲. وہ لوگ جو میری محبت میں، ان لوگوں سے دوستی اور رابطہ نہیں رکھتے جن لوگوں سے دوستی اور رابطہ کو میں ناپسند کرتا ہوں۔

۳. وہ لوگ جو میری خاطر ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے ہیں۔

۴. وہ لوگ جو مجھ پر توکل کرتے ہیں۔

محبت خدا کو حاصل کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ رسول خداؐ سے قریبی تعلق ہے کیونکہ آپ خدا کے محبوب ہیں اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خداوند متعال کی تمام محبتیں اس محبت کے ذیل میں ہیں جو اس محبوب خاص میں ہیں۔ یاد اور ذکر کے چشمے خداوند متعال اور آنحضرت کی محبت سے پھوٹتے ہیں۔ خداوند سے محبت جس قدر زیادہ ہوگی اس کی یاد انسان کے دل پر زیادہ حاوی رہے گی جسے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۵ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَالَّذِینَ آمَنُوا اَشَدُّ حُبّاً لِلّٰه ، محبت خدا سے لبریز دل اپنے لئے محبت خدا سے خالی دل کی بنسبت موت کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ محبان الٰہی کے دل کی خوشحالی، تازگی اور شادابی یہ ہے کہ زندگی محبت خدا میں گذرے۔ محبت کے لئے سب سے اچھی لذت یہ ہے کہ احساس کرے کہ اس کا محبوب اس سے خوشنود ہے۔ اسی لئے وہ لوگ ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ اپنے اعمال اور کردار سے اس کی محبت اور تمایل کو جلب کریں اور دشواریوں کو راستہ سے دور کریں۔

معلم محبت کے پیروکاروں کی ذمہ داری

اگر انسان حبیب خدا کے امر و نہی کا پیروکار ہو گیا اور وما اتاکم الرسول فخذوه وما نهاکم عنه فانتهوا[2] کی بنیاد پر عمل کیا تو اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا اور وہ دوسروں کو ہدایت کی طرف

۱۔ بحار الانوار، ج۲۱، ص۷۷

۲۔ سورہ حشر، آیت ۷

دعوت دے گا۔اسی طرح جیسے حق تعالیٰ اپنے رسول کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے : قل هٰذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني و سبحان الله وما انا من المشركين [۱]، یعنی میں اور میرے پیروکار، لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں گے۔ پیغمبر اسلامؐ کا کلام بہترین کلام ہے ان کے پیروں کاروں کے کلام بھی بہترین کلام ہوں گے۔

حق تعالیٰ نے متفکروں کو مختلف مکاتب فکر کے سلسلہ میں تحقیق کرنے اور ان میں سے بہترین مکتب فکر کو انتخاب کرنے کی دعوت دی ہے۔اللہ تعالیٰ مکتب توحید کو بہترین مکتب فکر اور اس کے مصداق کو خدا کی طرف دعوت دینے والا بتایا ہے۔ نتیجتاً، حبیب خدا کی پیروی فقط اعمال فردی میں نہیں ہے بلکہ مکمل پیروی کے لئے اسلامی تہذیب اور طرز فکر کی شناخت اور علم و عمل کے ذریعہ اس کی نشر و اشاعت ضروری ہے اور اسی وقت انسان رسول خدا کا پیروکار اور خدائے سبحان کا محبوب گا کیونکہ آپ کا وجود مبارک مدرس اور معلم محبت ہے۔

مرحوم علامہ طباطبائی سورہ حشر کی آیت نمبر ۸ کے ذیل میں فرماتے ہیں : اس آیت کے سیاق و سباق کو نظرانداز کرتے ہوئے، صرف فئی کے حصے کو دینے یا نہ دینے میں منحصر نہیں ہے،بلکہ تمام اوامر و نواہی جو رسول خداؐ سے صادر ہوئے ہیں، اس میں شامل ہیں۔ پس یہ آیت دین اسلام کے لئے ایک اصل کلّی اور قانون ہمیشگی ہے۔نبی مکرم اسلام نے فرمایاہے: المرء مع مَن اَحَبَّهُ ،انسان اپنے محبوب کے ساتھ محشور ہوگا۔

امام محمد باقرؑ سے بھی منقول ہے کہ ایک روز رسول اکرمؐ نے لوگوں کے درمیان فرمایا: اَحِبُّوا الله لِمَا يَغذُوكم به مِن نِعمَةٍوَاَحِبُّونِي الله عَزَّو جَلَّ وَاَحِبُّو قَرَابَتِي لِي۔

حضرت باقرالعلومؑ نے جابرؓ سے فرمایا : يا جابر بلغ شيعتي عنّي السلام واعلمهم انه لا قراباً بيننا وبين الله عزوجل ولا يتقرب اليه الّا بالطاعة له ،يا جابر من اطاع الله و احبنا فهو ولينا ومن عصى الله لم ينفعه حُبُّنا، اے جابر میرے شیعوں کو میرا سلام پہونچاؤ اور ان میں یہ اعلان کردو کہ ہمارے اور خداوند عزّوجلّ کے بیچ کوئی قرابت نہیں ہے اور کوئی بھی قربت ہمارے اور ان

۱۔ سورہ یوسف،آیت ۱۰۸

کے درمیان نہیں ہے سوائے اس کی اطاعت کے ،جو بھی خداوند متعال کی اطاعت کرتا ہے اور ہمیں دوست رکھتا ہے وہ ہمارا ولی ہے اور جو شخص خداوند سبحان کی معصیت کرتا ہے اسے ہماری دوستی نفع نہیں پہونچا سکتی۔

اللہ تعالی کی محبت ،انسان کو اس کی نافرمانی سے روکتی ہے۔اس بارے میں حضرت سید العارفین والعابدین امام سجادؑ ابو حمزہ ثمالی جیسی نورانی دعا کے جملوں میں فرماتے ہیں :

"اگر تیری محبت میرے دل سے نہیں نکلتی ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ میں اپنے حق میں تیری نعمتوں کو فراموش نہیں کرتا، اپنے گناہوں پر تیری پردہ پوشیوں کو فراموش نہیں کرتا۔"

پس اگر محبت خدا انسان کے دل میں برقرار ہو جائے تو اسے مسلسل خدا اور اس کی نعمتوں کو یاد کرنا چاہئے۔اسی بنیاد پر نبی مکرم اسلام نے فرمایا: اَحِبُّوا اللہ لِمَا یَغذُوکُم بِہ مِن نِعمَۃ [1]۔خدا کو دوست بنائے رکھو کہ وہ اپنی نعمتوں سے تمہارے لئے غذا فراہم کرتا ہے۔

درگاہ احدیت کے شیدائی اس طرح اللہ تعالی سے مناجات کرتے ہیں :

پروردگارا ہم دنیا میں معصیت کرتے تھے تو تیرا محبوب محمد غمگین ہو جاتا اور تیرا دشمن ابلیس شاد و خوشحال۔ اگر کل روز قیامت تو سزا دے گا تو بھی، تیرا محبوب محمد غمگین ہوگا اور تیرا دشمن ابلیس خوشحال ہوگا۔ پروردگارا دشمن کو دوخوشحالی نہ دے اور اپنے محبوب کے دل پر دو غم واندوہ نہ ڈال [2]۔

حضرتؐ نے دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: لا یُومِن عبد حتّٰی اکون احب اللہ من نفسہ و تکون عترتی احب الیہ من عترتہ ویکون اھلی احب اللہ من اھلہ ویکون ذاتی احب اللہ من ذاتہ یعنی بندہ کا ایمان کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنی ذات سے زیادہ مجھے دوست نہ رکھے ،اپنی عترت سے زیادہ میری عترت اس کے نزدیک محبوب نہ ہو ،اپنے اہل بیت سے زیادہ میرے اہل بیت کو نہ چاہے اور خود اس کی ذات سے زیادہ میری ذات محبوب نہ ہو۔

۱۔ بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۷۰

۲۔ الٰہی نامہ خواجہ عبداللہ انصاری

حضرت امیر المومنینؑ نے رسول خدا کی پیروی کو محبت خدا اور اس کی رضا کو گناہوں سے بخشش کا ذریعہ بتایا ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنینؑ نے حبیب خدا کی پیروی کرنے والے کو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بتایا ہے۔علامہ مجلسی کی روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادقؑ نے حب دنیا اور غیر اہلبیت کی ولایت کو محبت خدا کے منافی اور معرفت و محبت رسول خدا کو محبت خدا کا مصداق بتایا ہے۔مرحوم علامہ کلینی حضرت امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ مطیع خدا اور اہل بیتؑ کا تابع، محبوب خدا ہے، کیونکہ گناہ اور محبت خدا میں کوئی میل نہیں ہے[۱]۔

منابع و مآخذ

- ❖ قرآن کریم
- ❖ راغب اصفہانی، حسین ابن محمد، مفردات قرآن کریم، دار القلم، دمشق، ۱۴۱۶
- ❖ راغب اصفہانی، حسین ابن محمد، ترجمہ و تحقیق مفردات الفاظ قرآن، انتشارات مرتضوی، قم، ۱۳۸۳
- ❖ طبرسی، ابو علی فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۰۸ھ
- ❖ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۳ھ
- ❖ صدوق، محمد بن علی بن حسین، امالی، موٴسسہ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۴۱۰ھ
- ❖ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، دار التعارف، بیروت، ۱۴۰۱ھ
- ❖ طوسی، ابو جعفر محمد بن حسن، مصباح المتہجد، چاپ سنگی
- ❖ قمی، شیخ عباس، مفاتیح الجنان، انتشارات علامہ، قم، ۱۳۸۰
- ❖ صدوق، محمد بن علی بن حسین، من لایحضرہ الفقیہ، ج۱، منشور جامعہ المدرسین الحوزۃ العلمیہ، قم، ۱۴۰۴ھ
- ❖ نراقی، ملا احمد، معراج السعادۃ، انتشارات رشیدی، تہران، بی تا
- ❖ دیلمی، ارشاد القلوب، انتشارات شریف رضی
- ❖ فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضاء، دفتر انتشارات اسلامی
- ❖ دہخدا، علی اکبر، امثال و حکم، انتشارات دانشگاہ تہران

۱۔ کافی، ج۸، ص ۱۴

❖ طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیزان، جلد ۲۰، مؤسسہ الاعلمی للمطبوعات
❖ قمی، شیخ عباس، مفاتیح الجنان، دعای ابوحمزہ ثمالی
❖ قیصری، داود، شرح فصوص الحکم، جزء اول، تحقیق آیۃ اللہ حسن زادہ آملی

پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغی راہ وروش

مؤلف: ہاشم محمدی
مترجم: ڈاکٹر مولانا رضوان حیدر

انسانی تاریخ میں خود ساختہ حکومتوں اور طاقتوں کے ثبات کی وجہ غلط شیطانی تبلیغات رہی ہیں لیکن انبیائے کرام کی تبلیغات کی بنیاد انسان سازی رہی ہے اور یہ بات طے ہے کہ اگر تبلیغ کا مناسب اور کارآمد طریقہ نہ ہو تو تبلیغ ممکن نہیں ہے۔ تبلیغی طریقوں کے مفید اور کارآمد ہونے کے لئے اس کی ظرافت اور حساسیت کے پیش نظر وحی الٰہی سے استفادہ کرنا چاہئے۔ اس مقالہ کا مقصد وحی کے مظہر وترجمان یعنی پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغی راہ وروش کو معلوم کرنا ہے۔

قرآن کریم کی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ کا مطلب ہے ایسے احکام و معارف الٰہی کو پہنچانا اور بیان کرنا جس سے ہدایت اور بشارت کا پہلو عیاں ہو، تاکہ انسان اپنے ارادہ واختیار کے ذریعہ حق کی راہ کو طے کرسکے۔ یہ ذمہ داری انبیاء و اولیائے الٰہی کے سپرد کی گئی ہے جس کی دو اہم بنیادیں ہیں: ایک آزادی اور دوسرے برہان و دلیل۔ اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے تمام اعمال وافعال اور سیرت و کردار کے ہر پہلو کو تبلیغی راہ وروش کے عنوان سے دیکھا جاتا ہے۔

تبلیغی نظام کے چار اہم عناصر ہیں: پیغام لانے والا، اصل پیغام، پیغام حاصل کرنے والا اور اس کے پہنچانے کا طریقہ۔ ہمارے آخری نبی پیغام لانے والے، قرآن مجید ان کا پیغام، زمانہ جاہلیت کے عرب پیغام حاصل کرنے والے اور پیغام پہنچانے کا طریقہ حضور اکرمؐ کے اعمال وافعال اور سیرت و کردار ہیں جس کا مقصد دین الٰہی کی تبلیغ ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے تبلیغ کے لئے مختلف راہ وروش سے استفادہ کیا جسے پیغام پہنچانے کا طریقہ، لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کیفیت اور اپنی تبلیغ کو وسعت دینے کے طریقے کی بنیاد پر انفرادی، اجتماعی، علاقائی اور عالمی زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ اسی طرح ہم دوسرے اعتبار سے

بھی آپ کی تبلیغ کے طریقوں کی تقسیم کر سکتے ہیں جیسے اخلاقی، ہنری، اصولوں کی رعایت، تربیتی (جس میں تشویق وتنبیہ بھی ہو)، حفاظتی اور دور اندیشی وغیرہ۔

پوری انسانی تاریخ میں خود ساختہ طاقتیں ہمیشہ تین بنیادوں پر ٹکی رہی ہیں اور وہ ہیں: تبلیغات، تسلیحات (اسلحہ کا استعمال) اور اطلاعات (معلومات یا information) جن میں تبلیغات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ البتہ ان کی پسندیدہ تبلیغات شیطانی تبلیغات رہی ہیں اور انہوں نے اس کے ذریعہ عوام کے احساسات وخیالات پر غالب آنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کے دل ودماغ کو ایک اسلحہ کے عنوان سے استعمال کرکے سماجی طاقت سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ آج کی دنیا میں اس طریقہ کا حیرت انگیز طور پر عام ہونا اقدار واخلاق کی نابودی اور انسانی فکر ونظر کی کمزوری کا باعث ہوا ہے اور آج کا انسان شیطانی تبلیغات کے زیر اثر اپنی پہچان کھو چکا ہے اور صاحبان قدرت کے لئے آلہ کار بن کر رہ گیا ہے۔

تبلیغات کا تسلیحات اور اطلاعات پر مقدم ہونا واضح ہے، اس لئے کہ اسلحے بغیر ایسے ارادہ کے جو ان اسلحوں کا استعمال کرے بے فائدہ ہیں اسی طرح اطلاعات بنا ایسی فکر ونظر کے جو اس کا تجزیہ کر سکیں سیاسی اعتبار سے کسی کام کی نہیں ہیں اور فکر ونظر اور ارادہ واعتقاد کی تبلیغات کے ذریعہ ہی حفاظت وترقی ہونی چاہئے۔

اس کے برعکس حقیقت، عدالت اور آزادی کے حامی افراد اگرچہ تعداد کے لحاظ سے طاقتور ہیں لیکن ہمیشہ تبلیغات، تسلیحات اور اطلاعات کے اعتبار سے کمزور رہے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ یاتو ہار کر میدان چھوڑ گئے یا پھر کبھی بھی طاقت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے اور اس کی اصل وجہ وہ سچائی اور خوش فہمی ہے جو کبھی کبھی سادگی کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ حق پسند افراد کو ہر طرف خلوص اور پاکیزگی ہی نظر آتی ہے اس لئے ان کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کافروں کے دلوں میں چھپے ہوئے اندھیرے کس حد تک سیدھے سادے لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہیں۔

حق پرست لوگوں کی نفسیات میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ان کی نظر میں لوگوں کو پوری آزادی ملنی چاہئے اسی لئے انہوں نے کبھی شیطانی تبلیغات کے طریقوں کو جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے علاوہ اس بات کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ ایمانی تبلیغات انسان کو اصلاح کی طرف اور شیطانی تبلیغات بربادی کی طرف لے جاتی ہیں اور یہ واضح ہے کہ تباہی وبربادی تعمیر کی بنسبت زیادہ آسان ہے

کیونکہ تعمیر کے لئے وقت و سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ تخریب بہت جلد اور کم سرمایہ میں عمل میں آجاتی ہے۔

حق پسند لوگ اگر اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرتے ہوئے ظالموں پر غالب آنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے سماج کی تشکیل چاہتے ہیں جو کفر و شرک سے پاک و پاکیزہ ہو اور اس طرح وہ اپنے دشمن کو مایوس کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ:

اولاً: حقائق پر نظر رکھیں اور یہ سمجھیں کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے دو پہلو ہیں، اس کے ایک طرف اندھیرا ہے اور دوسری طرف روشنی اور انسان اس راہ میں تاریکی کی آخری حد تک جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے اندر کمالات کے بلند مراتب پر فائز ہونے کی صلاحیتیں بھی پائی جاتی ہیں فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۔ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا[۱] للذا واقع بین ہونے کی ضرورت ہے تاکہ پچھلی غلطیاں نہ دہرائی جائیں۔

ثانیاً: اس بات کا خیال رہے کہ کبھی کبھی شیطانی تبلیغات کرنے والوں کا مقابلہ لوگوں کے ارادہ کی آزادی کے لئے ہوتا ہے اور یہ سوچ کر کہ ہر انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، لوگوں کو چھوڑ نہیں دینا چاہیے۔ اس لئے انسان کا ضمیر اس بات کا حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی گمراہی میں پڑا ہوا ہے تو اس کی مدد کرنی چاہئے۔

چو می بنی کہ نابینا و چاہ است اگر خاموش بنشینی گناہ است

ترجمہ: جب دیکھو کہ اندھے کے سامنے کنواں ہے تو خاموش بیٹھنا گناہ ہے۔

انسان کی نجات کے لئے تبلیغ اور راہنمائی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے اور مناسب طریقہ کے بغیر تبلیغ فائدہ مند نہیں ہے خاص طور سے اس زمانہ میں جبکہ استعماری اور دین مخالف طاقتیں نئے نئے اور دلکش طریقوں سے بنی نوع انسان کو گمراہ کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تبلیغ بہت ہی حساس اور نازک مرحلہ ہے اس لئے صحیح تبلیغی راہ وروش کے لئے وحی الٰہی سے مدد لینی چاہئے تاکہ ہم غلط راستہ پر نہ پڑ جائیں۔ پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام وحی کے مظہر و ترجمان ہیں للذا آپ حضرات کی سنت و

۱۔ سورہ شمس، آیات ۸۔۷

سیرت کے ذریعہ ہی تبلیغ کے صحیح طریقہ کو معلوم کرنا چاہئے اور بہت ماہرانہ طریقہ سے اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ عالم انسانیت کی سب سے عظیم شخصیت کی زندگی پر نظر ڈالی جائے اور تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کے ذریعہ استعمال کئے گئے طریقوں اور اس کے نتائج کو معلوم کیا جائے لہٰذا اس مقالہ کا طریقہ تحقیق تاریخی تحلیل کا طریقہ ہے یعنی تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔

لغت میں ابلاغ یعنی پہنچانا اور تبلیغ یعنی پہنچ کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں تبلیغ یعنی کسی بات کو دوسروں تک پہنچانا جس میں ہر طرح کے پیغام شامل ہیں اور مبلّغ یعنی تبلیغ کے مخصوص پیغام کو پہنچانے والا۔ مبلّغ کا پیغام اور تعلیمات اس کے مطالب کے اعتبار سے تبلیغ کی کیفیت کو معین کرتا ہے۔

تعلیم و تبلیغ میں فرق ہے۔ اگر تبلیغ کے معنی پیغام حاصل کرنے والے تک پیغام کا پہنچانا ہے تو پھر مبلّغ کو پیغام حاصل کرنے والے سماج تک جانا چاہئے اور اس کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو پیغام کو سماج تک پہنچائے، اس لئے مبلّغ کا کام انبیاء کے کام جیسا ہے جبکہ معلم کی ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس علم حاصل کرنے والے کو چاہئے کہ وہ استاد کے پاس جائے اور اس سے علم حاصل کرے۔ اس کے علاوہ اگرچہ پیغام، پیغام پہنچانے والا اور پیغام کو حاصل کرنے والا یہ تینوں چیزیں تبلیغ اور تعلیم دونوں میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں لیکن تبلیغ میں ایک اور بنیادی عنصر ہے جس کو اجتماعی رجحان کہا جاتا ہے جو تبلیغی کاموں کے ذریعہ پیغام کے عام ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ یہ عنصر تعلیم میں بہت کم پایا جاتا ہے۔[۱]

اسلام میں تبلیغ سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو فطرت انسانی اور احکام و معارف سے روشناس کرایا جائے اور مؤمنین کو جنت اور اللہ تعالی کی نعمتوں کی بشارت دی جائے اور مخالفین کو انذار کیا جائے۔ اسلام تبلیغ کے ذریعہ بشریت کی اس طرح سے تربیت کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے خود کو پہچان سکے اور یہ سمجھ سکے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے اور اس راستہ میں اس کی ذمہ داری کیا ہے۔ مغربی دنیا میں تبلیغ کا مطلب ہوتا ہے کچھ خاص اہداف تک پہنچنے کے لئے افکار عامہ میں مطلوبہ تبدیلیاں کرنا۔ یہ تبدیلیاں کسی بھی طریقے سے رونما ہوں ان سب کو تبلیغ کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے جب کہ اسلام نے روش تبلیغ کے لئے کچھ حدود اور قوانین بنائے ہیں۔

۱۔ زورق، محمد حسن، مبانی تبلیغ، ص ۴۰

بلغ کا مادہ قرآن کریم میں تقریباً ۷۷ جگہوں پر مختلف صیغوں کے ساتھ پہنچانے، ترقی کرنے، پہنچنے، بیان کرنے، اصلاح کرنے، حکم کو نافذ کرنے، حجت بالغہ، حکمت بالغہ، تبلیغ اور پیغام الٰہی اور احکام خدا کو پہنچانے، اختتام و آخر اور موثر و دلنشین گفتگو کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح انذار، تبشیر (اسراء، ۱۰۵)، بلاغ (احزاب، ۳۹)، تخویف (اسراء، ۵۹)، ہدایت وارشاد (جن، ۲)، دعوت (نوح، ۵) اورامر بالمعروف و نہی عن المنکر (توبہ، ۷۱) جیسے الفاظ بھی تبلیغ کے لئے استعمال ہوئے ہیں جن کے ذریعہ تبلیغ کے کسی نہ کسی پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لہٰذا قرآن کریم کی ان آیات سے جو ابلاغ و تبلیغ یا اس سے قریب معنی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تبلیغ وہی احکام و معارف اسلامی کو بیان کرنا ہے تاکہ انسان اپنے ارادہ واختیار کے ذریعہ حق کی راہ کو طے کر سکے۔ یہ وہی ذمہ داریاں ہیں جو سب سے پہلے انبیائے الٰہی پر اور پھر آپ کے جانشینوں پر عائد ہوتی ہیں۔ اسلام میں تبلیغ کی بنیاد اور عناصر تبلیغ دو اہم چیزیں ہیں جن کی طرف ہم یہاں سب سے پہلے اشارہ کر رہے ہیں۔

اسلام میں تبلیغ کی بنیاد:

قرآن کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تبلیغ دو بنیادوں پر استوار ہے:

۱۔ **آزادی کی بنیاد پر تبلیغ**: قرآن کریم کی متعدد آیات میں ارشاد ہوتا ہے "اے پیغمبر آپ لوگوں پر زور زبردستی کرنے کا حق نہیں رکھتے اور آپ کی ذمہ داری صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے اب جو چاہے پیروی کرے اور جو چاہے نہ کرے، ہمارے بہترین بندے وہ ہیں جو باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے اچھی باتوں کا اتباع کرتے ہیں"۔ تدبیر، تعقل، بصیرت وآگاہی اور حق انتخاب، دین مبین اسلام کے امتیازات وخصوصیات میں سے ہے۔

۲۔ **دلیل کے ذریعہ تبلیغ**: اسلام کی دعوت دلیل و برہان، استدلال اور موعظہ کی بنیاد پر ہوتی ہے چنانچہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن گمراہ کرنے والوں کی دعوت، رشوت، قانون کی تبدیلی، حاکموں پر غلبہ، مخالف کی تحقیر، ڈرانا، دھمکانا، تہمت اور طاقت ومار پیٹ، مادی زرق وبرق، لوگوں سے جھوٹے وعدے وغیرہ پر استوار ہے۔[۱]

۱۔ قرائتی، محسن، قرآن و تبلیغ، ص۲۱،۲۰

تبلیغ کے عناصر:

ایک مکمل ارتباطی نظام کو قائم کرنے کے لئے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے جن کو ارتباطی عناصر کہتے ہیں اور تبلیغ بھی چونکہ ایک مکمل ارتباطی نظام ہے لہٰذا اس میں ان چار عناصر کا ہونا ضروری ہے:

الف: پیغام دینے والا

ب: پیغام

ج: پیغام کو حاصل کرنے والا

د: پیغام پہنچانے کا طریقہ

الف: پیغام دینے والا:

نظام تبلیغ میں اس عنصر کا مطلب وہی مبلّغ یعنی تبلیغ کرنے والا ہے جس کے لئے اسلام نے کچھ شرائط و صفات معیّن کئے ہیں اور پیغمبر اسلامؐ میں جو دین اسلام کے پہلے مبلّغ تھے وہ تمام شرائط و صفات بطور احسن و اکمل پائے جاتے تھے جن میں سب چند موارد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے: قلبی ایمان (آل عمران، ۱۰۰)، اچھا اخلاق (احزاب، ۳)، فکری و عقلی اعتبار سے مکمل و احکام الٰہی سے آگاہ (نحل، ۱۱۶)، عالم با عمل (صف، ۳)، خوف خدا (احزاب، ۳۹)، بے نیاز (شعراء، ۱۴۵، ۱۲۷، ۱۰۹، ۱۶۴، ۱۸۰)، صبر و تحمل والے، بردبار، زحمتکش اور مشقت برداشت کرنے والے (سجدہ، ۲۴)، محبت کرنے والے اور معاف کرنے والے (آل عمران، ۱۵۹)، متانت و نرمی والے (طہ، ۴۴)، شرح صدر رکھنے والے (طہ، ۳۵، انشراح، ۱)، تکلف سے پرہیز کرنے والے (ص، ۸۶)، شجاع و بہادر (نہج البلاغہ، ۳، ۲۱۴)، گفتگو میں اخلاق اور خیر خواہی اور بلاغ مبین۔

ب: پیغام:

پیغمبرؐ اسلامؐ کے نظام تبلیغ میں عنصر پیغام قرآن کریم ہے جس نے اپنی حقانیت، وسعت مطالب اور اعجاز کی وجہ سے انسانوں کی پاک فطرت کو ہمیشہ متاثر کیا ہے۔

ج: پیغام حاصل کرنے والے (مخاطب):

پیغام حاصل کرنے والے کا سن و سال اور علمی معیار پیغام کے اثر انداز ہونے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے سب سے پہلے مخاطب زمانہ جاہلیت کے عرب تھے جو کبھی کبھی حق کی دعوت کے مقابلہ

میں پتھر کی طرح سخت ہو جاتے اور زحمتیں کھڑی کر دیتے تھے جن کو رام کرنے کے لئے آپ نے چوتھے عنصر یعنی طریقہ تبلیغ کو بڑے ہی ماہرانہ انداز میں اور وحی کے ذریعہ استعمال کیا اور تب آپ کو کامیابی ملی ۔

د: پیغام پہنچانے کا طریقہ :

تبلیغ میں جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں ،ان کی بہت ساری قسمیں ہیں اور ہم آسانی سے ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے پھر بھی ان کو مندرجہ ذیل کچھ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

ا۔ سیکھنے کے اعتبار سے تبلیغ کے طریقے جو نفی و اثبات ،شرطیہ ،اچانک منصوبہ بندی اور استدلالی طریقوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ پیغام کو پیش کرنے کی کیفیت کے اعتبار سے ابلاغ کا طریقہ جس میں انفرادی واجتماعی طریقوں سے پیغام کو پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ مخاطبین کے ساتھ برتاؤ کے اعتبار سے تبلیغ کے طریقے جس میں بلا واسطہ، دو بدو، تقریر، خطبہ، مذاکرہ اور ملاقات وغیرہ اور بالواسطہ جس میں ہنری طریقے سے جیسے قصہ و کہانی ،خط وکتابت یا ڈرامہ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی تبلیغی ذمہ داریوں میں مذکورہ تمام طریقوں کو بحسن وخوبی استعمال کیا اور اس کے علاوہ دوسرے خاص طریقوں سے بھی استفادہ کیا جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عناصر ہیں جو تبلیغ کے اثر انداز ہونے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جیسے کہ تبلیغ کا وقت ، جگہ اور منصوبہ بندی وغیرہ۔ تبلیغ کے سلسلہ میں جگہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ ایک مناسب مقام پر لوگوں پر دینی احکام و مسائل کی تبلیغ زیادہ اثر انداز ہو سکتی ہے ۔ اسی لئے پیغمبر اسلامؐ خانۂ کعبہ کے قریب لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے یا حجر اسمٰعیل کے قریب بیٹھ جاتے اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت کرتے اور اس طرح تبلیغ کرتے تھے ۔امام حسینؑ کربلا جانے سے پہلے کچھ ماہ مکہ میں رہے تا کہ حجاج آئیں اور آپ خانہ کعبہ کی فضا میں اپنا پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں اور یزیدی حکومت کے حالات سے ان کو آگاہ کریں اور اس طرح تمام حجاج امام علیہ السلام کے پیغام کو اپنے علاقے کے لوگوں تک

پہنچائیں۔امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک شاگرد ابان ابن تغلب سے فرمایا: اجلس فی المسجد و افت للناس[1]۔ ترجمہ: مسجد میں بیٹھو اور لوگوں کے لئے مسائل بیان کرو۔

البتہ اگرچہ ان مقامات پر دینی احکام کی تبلیغ کافی حد تک موثر ہے لیکن صرف انہیں مقامات میں محدود نہیں ہے بلکہ مبلّغ کو چاہئے کہ جو جگہ بھی خدا کے پیغام کو سننے اور سنانے کے لئے مناسب ہو اس سے استفادہ کرے اور خدا کے پیغام کو پہنچائے۔

مبلّغ کی کامیابی میں مناسب وقت کا انتخاب بھی کافی اہم ہے۔قرآن کریم کی آیات اور معصومین علیہم السلام کی سیرت پر اگر غور کیا جائے تو تمام امور خاص طور سے تبلیغی امور میں وقت کی اہمیت کو اچھی طرح سے سمجھا جاسکتا ہے۔

خداوند عالم نے قرآن کریم کو بہترین رات (شب قدر) اور بہترین وقت (ماہ مبارک رمضان) میں نازل کیا۔[2] رسول اکرمؐ کی بعثت کے تین سال بعد آیۂ مبارکہ فَٱصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡمُشۡرِكِينَ[3] نازل ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اعلان دین کے لئے وقت مناسب نہیں تھا۔ جب رسول اکرمؐ کو کفار قریش تبلیغ رسالت سے روکتے تھے تو آپ حرام مہینوں اور حج کے ایام میں تبلیغ کرتے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کی ولایت و رہبری کو بہترین وقت (تمام حاجیوں کی حج سے واپسی) اور بہترین مقام (غدیر خم جہاں سے دنیائے اسلام کے تمام حجاج مختلف شہروں کے لئے روانہ ہوتے تھے) پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔[4]

۱۔ منتہی الآمال، ج ۲، ص ۱۶۶

۲۔ إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ فِي لَيۡلَةِ ٱلۡقَدۡرِ (سورہ قدر، آیت ۱)

۳۔ سورہ حجر، آیت ۹۴

۴۔ ٱلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ وَأَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلۡإِسۡلَٰمَ دِينٗا (سورہ مائدہ، آیت ۳)

جناب ابراہیم نے خدائے وحدہ لاشریک کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے مختلف اوقات سے استفادہ کیا۔[۱] جناب موسیٰ نے اپنے دعوائے نبوت کی حقانیت کو ثابت کرنے اور فرعونیوں کو الٰہی معجزہ دکھانے کے لئے "روز زینت" یعنی قبطیوں کی عید کے دن کو انتخاب کیا۔[۲]

تبلیغ میں منصوبہ بندی بھی ایک اہم عنصر ہے کیونکہ کسی بھی کام میں کامیابی کے لئے صحیح منصوبہ بندی بہت ضروری ہے اور امر تبلیغ بھی جو ایک بامقصد نظام ہے اس عنصر سے مستثنیٰ نہیں ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے مقصد کے حصول کے لئے مادی اور معنوی یعنی انسانی اور غیر انسانی ذرائع کے ساتھ ساتھ مناسب منصوبہ بندی سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے۔

ہماری اگلی بحث سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ پیغمبر اسلامؐ نے کس طرح مناسب منصوبہ بندی کے ذریعہ اور تمام تبلیغی وسائل کے ساتھ ساتھ زمان و مکان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی الٰہی ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دیا اور خاتمیت کا قابل فخر تمغہ بارگاہ خداوندی سے حاصل کیا۔

پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ کے مراحل اور دائرہ کار:

تبلیغ کا دائرہ کار بہت وسیع ہے لیکن قرآن کریم کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ کو پانچ مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تبلیغ کا پہلا مرحلہ خود آنحضرت سے متعلق ہے يَـٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُدَّثِّرُ ۝١ قُمۡ فَأَنذِرۡ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۝٣ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ ۝٤ وَٱلرُّجۡزَ فَٱهۡجُرۡ[۳]۔ دوسرا مرحلہ اپنے خاندان والوں کو ڈرانا ہے يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ قُل لِّأَزۡوَٲجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ[۴]۔ تیسرا مرحلہ رشتہ داروں کو ڈرانا ہے وَأَنذِرۡ عَشِيرَتَكَ ٱلۡأَقۡرَبِينَ[۵] اور چوتھے مرحلہ میں آپ

۱۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ ٱلَّيۡلُ رَءَا كَوۡكَبً۬ا‌ۖ قَالَ هَـٰذَا رَبِّى‌ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ ٱلۡأَفِلِينَ (سورہ انعام، آیت ۷۶)

۲۔ قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ ٱلزِّينَةِ وَأَن يُحۡشَرَ ٱلنَّاسُ ضُحً۬ى (سورہ طہ، آیت ۵۹)

۳۔ سورہ مدثر، آیت ۲-۵

۴۔ سورہ احزاب، آیت ۵۹

۵۔ سورہ شعراء، آیت ۲۱۴

کی تبلیغ کی ذمہ داری اپنے علاقہ والوں سے مربوط ہے وَلِتُنذِرَ أُمَّ ٱلْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا[1] اور آخر میں پانچویں مرحلہ میں دنیاکے تمام لوگ آپ کی تبلیغ سے متعلق ہیں نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ[2]۔

تبلیغ کے ان پانچ مراحل اوران سے متعلق آیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مبلّغ کو چاہئے کہ :

اولاً: وہ اپنے اندر کچھ کمالات پیدا کرے۔ثانیاً: اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کی اصلاح کرےاور ثالثاً: اپنے علاقہ کے تمام لوگوں کو مقدم رکھے جیساکہ آنحضرت نے اس طریقہ سے اپنی تبلیغی ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

تبلیغ کے عملی طریقوں کے پیش نظر جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے تبلیغ کے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا جن کو پیغام پیش کرنے ،افراد کو اپنی طرف مائل کرنے اور تبلیغ کے دائرۂ کار کے اعتبار سے ،انفرادی ،اجتماعی ،علاقائی اور عالمی طریقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔واضح رہے کہ رسول اکرمؐ نے ہر میدان میں ایک خاص طریقہ سے استفادہ کیا ہےالبتہ پیغمبر اسلامؐ کی روش تبلیغ کو اخلاقی اور ہنری ، اصول کی رعایت ، تشویق وتنبیہ اور دور اندیشی جیسے عناصر کے لحاظ سے بھی تقسیم کر سکتے ہیں جس کی وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔اس اہم نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ آنحضرت کی روش تبلیغ ان عام طریقوں تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ نے وحی اور اپنی بے نظیر شخصیت کے سایہ میں دوسرے خاص طریقوں سے بھی استفادہ کیا۔ ہم یہاں پر مذکورہ چار طریقوں کے سلسلہ میں گفتگو کریں گے۔

۱۔ تبلیغ کے انفرادی طریقے:

تبلیغ کو چھوٹے پیمانہ پر شروع کرنا :بڑے بڑے عقلمند اور سماجی رہنماؤں نے اپنے مشن کاآغاز صحیح اور وسیع منصوبہ کے ذریعہ کیا ہے۔ایک ایسا منصوبہ جس کے تمام تر مقدمات اور خصوصیات کو پہلے سے طے کیا جاچکا ہے لیکن وہ کبھی بھی یہ مان کے نہیں چلتے کہ ان کا مقصد ایک ہی جگہ یا یک بیک پورا ہو جائے گا۔ وہ لوگ اپنے کام کو چھوٹے پیمانہ سے شروع کرتے ہیں اور کامیابی ملنے کے ساتھ ساتھ اپنے دائرۂ کار کو وسیع کرتے ہوئے اسے مکمل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

۱۔سورہ انعام،آیت ۹۲

۲ ۔ سورہ مدثر،آیت ۳۶

پیغمبر اسلامؐ نے بھی اسی قاعدہ سے استفادہ کرتے ہوئے پورے تین سال تک بنا کسی عجلت کے ایک چھوٹی سی بستی میں اپنی دعوت کو اس طرح پیش کیا کہ آپ فرداً فرداً لوگوں کے سامنے تبلیغ کرتے تھے جس کو خفیہ تبلیغ کہنا زیادہ بہتر ہے، اسی لئے آپ کی تبلیغ شروع شروع میں بڑی آسانی سے آگے بڑھی اور دوسرے لوگوں نے کسی طرح کی مخالفت یا دشمنی نہیں کی۔ آپ اپنی دعوت کو اس طرح پیش کرنا چاہتے تھے کہ شروع شروع میں آزادی رہے اور عام حالات میں آپ اپنی بنیادوں کو مضبوط کریں اور در اصل اپنی وسیع ذمہ داری کے لئے حالات سازگار کریں۔

تبلیغ میں فرد کی اصلاح : پیغمبر اسلامؐ نے تین سال تک، دعوت عام (جو آپ کی عالمی حکومت کا مقصد تھا) کے بجائے فرد کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ آپ جس کے اندر بھی فکری اعتبار سے لیاقت و صلاحیت دیکھتے اس کے سامنے اپنے دین کو پیش کر دیتے۔ تاریخ نے رسالت کے اس حساس دور میں آپ کی رسالت کو قبول کرنے والوں کے ناموں کو محفوظ رکھا ہے اور یہ حضرات آنحضرت کے پہلے اصحاب میں سے تھے[۱]۔

مشہور قبائل کے سرداروں کو اپنانا: اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کی رائج تہذیب کی بنیاد پر عوام اپنے قبیلے کے سرداروں کی مطیع و فرمانبردار ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی پیغمبر اسلامؐ قبیلہ کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اس سنت سے استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے سرداروں میں سے کسی ایک کو مسلمان کرکے یا سب کو مسلمان کر دیتے یا کم سے کم ان پر غلبہ حاصل کر لیتے تھے۔ آپ نے یہودیوں کے مشہور سردار عبد اللہ بن سلام کو مسلمان کرنے میں اسی طریقہ تبلیغ سے استفادہ کیا ہے۔

جنگجوؤں کو اہمیت دینا: قبیلۂ نصر کا جوان مالک ابن عوف ایک جنگجو اور بہادر انسان تھا اور اسی نے جنگ حنین کی آگ لگائی تھی۔ اس نے طائف میں پناہ لے رکھی تھی اور قبیلہ ثقیف کی مدد کر رہا تھا۔ رسول اکرمؐ نے اس کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اسلام لاتا ہے اور مسلمانوں سے آملتا ہے تو اس کے آدمیوں کو آزاد کر دیا جائے گا اور اسے سو اونٹ بھی دیا جائے گا۔ مالک چونکہ قبیلہ ثقیف کی خراب حالت اور اسلام کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ رہا تھا، فوراً آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ پیغمبرؐ نے بھی اپنا

۱۔ سیرہ ابن ہشام، ج۱، ص ۲۶۲، ۲۴۵

وعدہ پورا کیا اور مالک کو قبیلہ نصر، ثمالہ اور سلمہ کے مسلمانوں کا سردار بنا دیا۔ وہ آپ کے اس لطف و کرم سے بے حد شرمندہ ہوا۔ اس نے آپ کی شان میں کچھ اشعار پڑھے جو اس طرح شروع ہوتے ہیں: میں نے دنیا میں محمد جیسا کسی کو نہیں دیکھا۔[1]

جنگ میں بھی لوگوں کے حقوق کی رعایت: عدالت کا نعرہ لگانے والے کو چاہئے کہ وہ ہر موقع پر افراد کے حقوق کی رعایت کرے اور بنیادی طور پر اسلام کا سب سے اہم مقصد افراد کے حقوق کی رعایت ہے۔جنگ بدر میں قریش کی ایک بڑی تعداد نے مسلمانوں کے خلاف حصہ لیا تھا لیکن نبی رحمت نے تاکیداً حکم دیا کہ دو طرح کے لوگوں کا خون نہ بہایا جائے، ایک وہ لوگ جو مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ نیکی سے پیش آتے تھے اور ان کی حمایت کرتے تھے جیسے ابی البختری جس نے اقتصادی پابندی ختم کرنے میں مسلمانوں کی کافی مدد کی تھی، دوسرے وہ لوگ جو مجبوراً (مسلمانوں سے جنگ کے لئے) مکہ سے باہر آئے تھے اور دل سے پیغمبر اسلامؐ اور اسلام کو چاہتے تھے جیسے بنی ہاشم کے بہت سے افراد مثلاً آنحضرت کے چچا عباس[2]،اس لئے کہ اسلام کی بنیادوں کو حدود الٰہی کی رعایت پر استوار ہونا چاہئے یہاں تک کہ دشمن سے جنگ کے دوران بھی مقصد کو جذبات پر قربان نہیں کرنا چاہئے اور انتقام نہیں لینا چاہئے۔

گناہ پر مُصر جوانوں کو اظہار نظر کی اجازت دینا: ایک ایسا جوان جو مغرور، نافرمان اور کم فہم ہے اور اپنے والدین، استاد اور مذہبی رہنماؤں کی مخالفت اور نافرمانی کے ذریعہ اپنی شخصیت کو عیاں کرنا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں ایک عقلمند مبلّغ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ جوان ایک غیر معمولی کیفیت سے دوچار ہے لہٰذا اس جوان کی شخصیت اور احترام کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہئے۔ اسی لئے جب ایک جوان نے پیغمبر اسلامؐ سے زنا جیسے بُرے عمل کی اجازت مانگی تو اس بے ادبی پر اصحاب کے سخت اعتراض کے باوجود آنحضرت نے بڑی شفقت و نرمی سے اسے بلایا، اپنے پاس بٹھایا اور آہستہ سے اس سے پوچھا کہ تمہیں کیا یہ گوارا ہے کہ لوگ یہی کام تمہارے رشتہ داروں کے ساتھ انجام دیں؟جوان نے عرض کیا میں آپ پر قربان ہو جاؤں، ہرگز نہیں تو آپ نے فرمایا :اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنی ناموس کے

۱۔ سبحانی، جعفر، فروغ ابدیت، ج ۲، ص ۳۶۷

۲۔ ایضاً، ج ۲، ص ۵۰۱

ساتھ اس کام کو کرنے پر خوش نہیں بلکہ ناراض ہوتے ہیں[۱] ۔اس حکیمانہ طریقہ نے جو آپ کے لطف و کرم کا مظہر تھا اس جوان کو منقلب کر دیا اور اس کے بعد سے اس کے نزدیک سب سے بُرا کام زنا تھا۔

مسلمان ہونے والے کافروں کے سرداروں کی تالیف قلب : حصول مقصد کا ایک طریقہ کفار کے سخت دلوں کو جیتنا ہے جسے اسلامی فقہ میں مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے اور قرآن کریم کی صریح نص سے پتہ چلتا ہے کہ اس کام کے لئے زکات کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔[۲] اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے جنگ حنین کے بعد مسلمانوں کے درمیاں مال غنیمت تقسیم کرتے وقت اس کے خمس کو جو آپ کا حق تھا قریش کے ان سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ابو سفیان، معاویہ، حکیم ابن حزام، حارث ابن حارث، حارث ابن ہشام، سہیل ابن عمرو، حویطب ابن عبد العزیٰ اور علا ابن جاریہ جو سب کے سب کفر و شرک کے سردار اور اسلام کے سخت ترین دشمن تھے اور نئے نئے مسلمان ہوئے تھے انہیں سو اونٹ دئے۔ اسی طرح جو لوگ ذرا ان سے کمتر درجہ کے تھے انہیں پچاس اونٹ دئے[۳]۔وہ لوگ آنحضرت کے اس رویہ سے بہت متاثر ہوئے اور اسلام کے گرویدہ ہو گئے۔

انکساری اور حسن اخلاق کا مظاہرہ: کبھی کبھی مبلّغ کو چاہئے کہ وہ اپنی نجی زندگی کو لوگوں کے سامنے اس طرح ظاہر کرے کہ ان پر حقیقت واضح ہو جائے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ مبلّغ جو کہتا ہے اور جن چیزوں کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے اس پر وہ خود بھی دوسروں سے زیادہ عمل کرتا ہے۔اسی طرح اسے چاہئے کہ وہ لوگوں سے تواضع و انکساری سے پیش آئے تاکہ وہ ظالم و جابر بادشاہوں کی طرح دوسروں سے الگ دکھائی نہ دے۔

جب عدی ابن حاتم مدینہ کی مسجد میں پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ اپنی جگہ سے اٹھ گئے، ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے۔آپ کی سادہ زندگی کو دیکھ کر عدی بہت متاثر ہوئے۔آنحضرت نے لیف خرما کی توشک جو آپ کے پاس تھی اس پر عدی کو بٹھایا اور خود چٹائی پر بیٹھے۔ عدی آپ کی انکساری

۱۔ بی آزار شیرازی، عبدالکریم، قرآن و تبلیغ، ص ۵۸-۶۰

۲۔ سورہ توبہ، آیت ۶۰

۳۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۳، ص ۴۹۳

دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے اور آپ کے بہترین اخلاق و صفات اور لوگوں کے بے پناہ عزت و احترام کی وجہ سے سمجھ گئے کہ وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہیں اسی لئے اس کے بعد عدی مجاہد مسلمانوں کی صف میں آگئے۔[۱]

مستعد لوگوں کو اپنا گرویدہ کرنا: مستعد دلوں کو تلاش کرنا چاہئے اس لئے کہ وہ حق کے مقابلہ میں سختی نہیں کرتے اور آسانی سے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ رسول اکرمؐ طائف کے تبلیغی سفر سے واپسی میں جہاں آپ کو بہت تکلیف دی گئی تھی، طائف کے باہر ایک باغ میں پہنچے جو قریش کے مالداروں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ آپ وہاں ایک انگور کے درخت کے سائے میں بیٹھ گئے تاکہ تھوڑا سا آرام اور خدا سے راز و نیاز کر لیں۔ عتبہ و شیبہ اگرچہ آپ کی ناکامی سے بہت خوش تھے لیکن آپ سے رشتہ داری کی وجہ سے اپنے غلام عداس کو حکم دیا کہ آپ کے لئے ایک طبق انگور لے جائے اور فوراً واپس آجائے۔

عداس، آنحضرتؐ کے سامنے انگور رکھ کر جانا چاہتا تھا لیکن آنحضرتؐ نے موقع کو غنیمت سمجھا اور انگور کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ عداس نے آج تک ایسے الفاظ نہیں سنے تھے، اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے آنحضرت سے تھوڑی سی گفتگو کی اور حقائق کو سمجھ لینے کے بعد آپ کے قدموں میں گر گیا، بوسہ لیا اور مسلمان ہو گیا۔[۲]

شوق پیدا کرنا: ایک شخص نے پیغمبر اسلامؐ سے ایک نصیحت آمیز جملہ بیان کرنے کیلئے بہت اصرار کیا تو آنحضرتؐ نے اس سے تین مرتبہ اقرار لیا کہ وہ آپ کی نصیحت پر عمل کرے گا اور جب اس نے اقرار کر لیا تو آپ نے فرمایا: جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو پہلے اس کے نتیجہ کو دیکھو اور غور کرو، اگر دیکھو کہ اس کا انجام و نتیجہ صحیح ہے تو اسے انجام دو اور اگر اس کا انجام گمراہی و تباہی ہو تو اپنا ارادہ بدل دو اور اس کام کو انجام نہ دو۔[۳]

اس طرح پہلے آپ نے اس شخص کے اندر شوق پیدا کیا اور پھر اس کے سامنے اپنی بات کو بیان کیا تاکہ اس کے دل و دماغ میں وہ بات بیٹھ جائے اور واضح ہے کہ اس طرح کی نصیحت کافی عرصہ تک اس کے دل میں رہے گی لیکن اگر کوئی اہم بات بنا کسی قید و شرط کے بیان کر دی جائے تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔

۱۔ فروغ ابدیت، ج ۲، ص ۳۸۲

۲۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۱، ص ۴۱۹، ۴۲۱

۳۔ مطہری، مرتضی، داستان راستان، ج ۲، ص ۲۳۶

قرآن کریم نے بہت سے مواقع پر اس طریقہ سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ سورہ تکویر میں بارہ شرطوں کے بعد جواب شرط کو بیان کیا ہے ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیم و تربیت کے بہترین طریقوں میں سے ایک ہے۔

متکبروں کی تحقیر: مبلّغ کو چاہئے کہ خداوند عالم کی عطا کردہ نعمتوں، خصوصیتوں اور ناقابل انکار حقیقتوں کاانکار کرنے والوں سے ان کااعتراف کرائے اور پھر ان کو ان نعمتوں کو عطا کرنے والے کی اطاعت کی دعوت دے جیسا کہ خداوند عالم اپنے نبیؐ سے اس کا مطالبہ کرتا ہے: (اے میرے نبی) مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ آسمان و زمین سے کون تم کو روزی عطا کرتا ہے؟ اور کون آنکھوں اور کانوں کا مالک و خالق ہے اور کون مردہ کو زندہ سے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور کون دنیا (کے کاموں) کو چلاتا ہے؟ (عنقریب وہ اعتراف کریں گے) اور کہیں گے کہ خدا۔ تو ان سے کہو کہ تقوی کیوں نہیں اختیار کرتے (اور خدا سے کیوں نہیں ڈرتے)؟[1]

اور اگر وہ لوگ ان حقیقتوں کااعتراف نہ کریں اور خدا کے حکم کے سامنے غرور و تکبر کے ساتھ پیش آئیں تو پھر ان کو ذلیل کرنا چاہئے تا کہ انہیں اپنی حیثیت معلوم ہو جائے اور وہ جان لیں کہ وہ خدا کے رسولوں کے مقابلہ میں ٹکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦٓ إِلَى ٱلَّذِينَ عَـٰهَدتُّم مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ۔[2]

أُو۟لَـٰٓئِكَ كَٱلْأَنْعَـٰمِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ[3]

ضمیر کو بیدار کرنا : بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان کی فطرت بغیر کسی تبلیغ و بیان کے احساس کر لیتی ہے لہٰذا مبلّغ کو چاہئے کہ انسان کے اس احساس و فطری یقین سے استفادہ کرے۔قرآن کریم کی بہت سی آیتیں ہمیں اس طریقہ تبلیغ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے بھی اس جوان سے گفتگو کے وقت جو آپ سے زنا کی اجازت مانگ رہا تھا، اس کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اسی طریقہ سے استفادہ کیا۔

۱۔ سورہ یونس، آیت ۳۱

۲۔ سورہ توبہ، آیت ۱

۳۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹

۲۔ تبلیغ کے اجتماعی طریقے:

رشتہ داروں کے درمیان تبلیغ: اگر چہ پیغمبر اسلامؐ کی گفتگو سلیس اور دلنشین تھی یہاں تک کہ قرآن کریم دوسرے کلاموں سے بالاتر اور معجزہ تھا لیکن جس وقت آپ خداوند عالم کی جانب سے دین کی علنی تبلیغ کے لئے مامور ہوئے اس وقت آپ کے پاس کوئی ایسی دفاعی طاقت نہیں تھی جو حساس مواقع پر مخالفوں کے حملوں کے مقابلہ میں سامنے آتی۔ واضح رہے کہ تین سال کی خفیہ تبلیغ میں کچھ لوگ آپ پر ایمان لے آئے (تقریباً چالیس لوگ) لیکن یہ لوگ اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ یہ لوگ خود اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے تو آنحضرتؐ کا دفاع کیا کرتے؟

پیغمبر اسلامؐ نے ایک مرکزی اہمیت حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ عام لوگوں کو دعوت اسلام دینے سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی اور آیہ انذار[۱] کے نازل ہونے کے بعد اس کام کو انجام دیا اور اس طرح آپ نے اس کمی کو پورا کیا اور کسی بھی احتمالی خطرے کے پیش نظر ایک مضبوط بنیاد قائم کر لی۔ اس دعوت کا کمترین فائدہ یہ تھا کہ مخالفین کے حملوں کے مقابلہ میں قومی اور رشتہ داری غیرت وحمیت سے استفادہ کیا گیا اور یہ دعوت ان میں سے اکثر لوگوں میں موثر رہی اور بعض اندرونی اصلاحات بھی اسی سے ہوئیں۔

مسلمانوں کے درمیان بھائی چارگی: قوموں اور قبیلوں کے درمیان اختلاف و افتراق کی ایک وجہ قبیلہ کے لوگوں کے درمیان آپسی اختلافات و نفاق ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے مدینہ آنے کے بعد راہ تبلیغ میں یہ چیز بہت بڑی رکاوٹ تھی اس لئے کہ مہاجرین و انصار مختلف ماحول میں پلے بڑھے تھے اور ان کا رہن سہن ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ ادھر انصار جو قبیلہ اوس و خزرج پر مشتمل تھے، ان میں آپس میں ایک سو بیس سالہ پرانی دشمنی تھی لہٰذا ان حالات و خطرات کے ساتھ دینی و سیاسی زندگی کو آگے بڑھانا ممکن نہیں تھا لیکن آنحضرت نے بڑی عقلمندی سے مسلمانوں کے درمیان برادری اور بھائی چارگی کے منصوبہ کے ذریعہ اس مشکل کو حل کر دیا تاکہ اپنے تبلیغی کاموں میں کامیاب ہو سکیں۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے اصحاب کے درمیان فرمایا: دو دو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ برادر دینی ہو جائیں[۲] اور اس طرح مہاجرین و انصار کے تین سو لوگوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور ان کے درمیان ایک وحدت ایجاد کر دی۔

۱۔ سورہ شعراء، آیت ۲۱۴

۲۔ سیرہ ابن ہشام، ج۲، ص ۵۰۱

مخالفین کی باتوں کو سننا اور ان سے مناظرہ کرنا: تمام انبیائے الٰہی اور رہنماؤں کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ مخالفین سے بحث و مناظرہ اور منطقی گفتگو کرتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ مخالفین کو بھی غور و فکر کا موقع دیتے تھے اور خلوص و محبت کے حالات فراہم کرتے تھے، ان کی باتوں کو بڑے غور سے آخر تک سنتے تھے تاکہ وہ اپنی پوری بات کہہ لیں اور اپنے دل کے اندر کی بات کو بڑے سکون سے بیان کر دیں اور یہ یقین کر لیں کہ اسلام کے مبلّغ نے ان کو پوری آزادی دی ہے اور کسی طرح کی زور زبردستی نہیں ہے۔ یقیناً ایسے لوگ حق کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر ان کے اندر ہٹ دھرمی نہ ہو تو حق بات کی شیرینی کو احساس کرتے ہیں اور ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اس کو قبول نہ کریں۔ بعثت کے ابتدائی سالوں میں آنحضرت کی مشرکین مکہ سے اور ہجرت کے دسویں سال نصارائے نجران سے گفتگو جس میں مباہلہ کی نوبت آگئی تھی آپ کے اس طریقہ تبلیغ کے نمونوں میں سے ہے[۱]۔

مظلوموں کے حقوق کے دفاع کے معاہدوں میں شرکت: جس کے دین کی سب سے اہم خاصیت مظلوموں کا دفاع اور ظالم سے مقابلہ ہو، اس کی زندگی کا ہر عمل بھی ایسا ہی ہونا چاہئے اور پیغمبر اسلامؐ بھی ایسے ہی تھے۔ بعثت سے بیس سال پہلے حلف الفضول کے معاہدہ میں آپ کی شرکت جو مظلوموں کی زندگی کی ضامن تھی، اس طریقہ تبلیغ کا ایک نمونہ تھا۔ آپ نے خود اس معاہدہ کی عظمت کے سلسلہ میں فرمایا:

> "عبد اللہ ابن جدعان کے گھر میں میں نے ایک ایسا معاہدہ دیکھا کہ اگر آج بعثت کے بعد بھی مجھے اس معاہدہ میں بلایا جائے تو میں ضرور جاؤں گا اور اس کو سرخ بالوں والے اونٹوں سے بھی نہیں بدل سکتا۔[۲]"

اہم مواقع سے فائدہ اٹھانا: پیغمبر اسلامؐ کی کوشش یہ تھی کہ کسی بھی مجمع میں اور کسی بھی وقت تبلیغ کر سکیں، چنانچہ حرام مہینوں میں جب جنگ حرام ہوتی تھی اور بت پرستوں کے شر سے آپ محفوظ رہتے تھے تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دین اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ آنحضرت ان دنوں میں مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے تھے، یہاں تک کہ اس کے لئے آپ قبیلوں کے گھروں تک جاتے تھے۔

۱۔ فروغ ابدیت، ج۲، ص۴۳۵۔۴۳۳

۲۔ ایضاً، ج۱، ص۱۸۵۔۱۸۳

خطبہ و تقریر: پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ کا ایک دوسرا طریقہ خطبہ و تقریر ہے۔ آپ کو جب بھی موقع ملتا شعلہ بیان تقریروں کے ذریعہ لوگوں کو وحدانیت اور دشمنوں سے مقابلہ کی دعوت دیتے تھے اور ساتھ ساتھ اپنے اصحاب کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد مسجد الحرام میں آپ کی تقریر انہیں تقریروں میں سے ہے جس میں آپ نے خاندان پر فخر، عرب ہونے کی فضیلت، تمام انسانوں کی برابری، پچھلی سو سالہ جنگوں، پرانی دشمنیوں اور اسلامی بھائی چارگی کی طرف اشارہ کیا اور عربوں کے درمیان رائج موہوم اصول کو غلط بتاتے ہوئے اسلام کے انسانی اصول کی تشریح کی اور تمام لوگوں کو ان اصولوں پر عمل کرنے کی دعوت دی[1]۔

لوگوں کی مدد کرنا: مبلّغ کو چاہئے کہ دوسروں کی طرح وہ خود بھی کام کرے اور اس طرح مدد کے جذبے کو لوگوں میں عام کرے۔ آنحضرت خود کاموں میں حصہ لیتے تھے اور دوسروں کے اندر شوق و ولولہ پیدا کرتے تھے۔ آپ مدینہ میں مسجد کی تعمیر کے دوران سامان وغیرہ اٹھانے میں شریک ہو کر یہ واضح کرتے تھے کہ اسلام کی تقویت کسی خاص مرتبہ تک پہنچنے میں ہی نہیں ہے۔ اصحاب کے ساتھ ایک سفر میں کھانا بنانے کے لئے جنگل سے لکڑی جمع کرنا آنحضرت کے روش تبلیغ کا ایک نمونہ ہے[2]۔

لوگوں سے مشورہ کرنا: خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ اس بات پر مامور ہیں کہ رسالت الٰہی کے بلند مقاصد کے حصول کے لئے اجتماعی اور حکومتی مسائل میں مسلمانوں سے مشورہ کریں اور انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کریں تاکہ وہ اس طرح اپنے پیروکاروں کو سکھائیں اور اپنے چاہنے والوں کے اندر حق طلبی، حق بینی اور جمہوریت کا جذبہ پیدا کریں۔ جنگ بدر کے شروع ہونے سے پہلے دشمن سے مقابلہ کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں اصحاب سے مشورہ کرنا، جنگ احد سے پہلے فوجی کمیٹی تشکیل دینا اور دفاع کے سلسلہ میں دور اندیشوں اور افسروں سے رائے لینا اور جنگ خیبر میں اسلامی فوج کے تعینات کرنے کے سلسلہ میں اسلام کے ماہر بہادر حباب ابن منذر کے مشورہ کو قبول کرنا اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔

۱۔ فروغ ابدیت، ج۲، ص ۳۴۰، ۳۴۳

۲۔ ایضاً، ج۱، ص ۴۳۵

نظم و ضبط کو اہمیت دینا : جنگ بدر میں قریش کے اجتماعی حملہ کے شروع ہونے کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے حکم دیا کہ حملہ نہ کیا جائے اور تیر اندازی کے ذریعہ دشمن کو آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ پھر آپ نیچے تشریف لائے اور اپنی چھڑی کے ذریعہ سپاہیوں کی صفوں کو منظّم کیا۔ اس وقت سواد بن عزیّہ صف سے آگے کھڑا تھا، آنحضرت نے اپنی چھڑی سے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: سپاہیوں کی لائن سے آگے نہ کھڑے ہو[1]۔ پھر آپ اپنے مقام پر واپس چلے گئے اور خداوند عالم سے لشکر اسلام کی کامیابی کی دعا کی اور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے بعد عام حملہ کا حکم دیا۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت فردی و اجتماعی اور حکومتی تمام مقامات پر نظم و ضبط کو بہت اہمیت دیتے تھے چنانچہ مبلّغ کی زندگی میں نظم و ضبط کا ہونا اس کی کامیابی کا راز ہے۔

تبلیغ میں چیلنج کا استعمال : جو شخص مضبوط منطق رکھتا ہے اور حق کا طرفدار ہے وہ دھمکیوں اور افواہوں سے نہیں ڈرتا اور اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ نجران کے عیسائیوں کی نمائندگی میں ایک وفد ہجرت کے دسویں سال مدینہ آیا اور پیغمبر اسلامؐ سے مذاکرہ کیا۔ انہوں نے آنحضرت کی منطق و استدلال کو قبول نہیں کیا اور اس خیال سے کہ رسول اللہؐ ہار مان لیں گے اور انہیں واپس کر دیں گے، ایک وقت معین پر مباہلہ کا مطالبہ کر لیا لیکن آنحضرت نے کمال شجاعت کے ساتھ اس کو قبول کر لیا اور اپنے سب سے قریبی افراد کے ساتھ وقت معینہ پر مباہلہ کے لئے نکل پڑے[2] جس کی وجہ سے مقابلہ میں آئے نصاری پیچھے ہٹ گئے اور آخر کار ایک صلح نامہ طرفین کی جانب سے لکھا گیا جس کی بنیاد پر انہوں نے ہر سال جزیہ کے عنوان سے ایک رقم حکومت اسلامی کو دینا قبول کیا[3]۔

تبلیغ میں نامی گرامی لوگوں سے استفادہ : جب ایک انصاری نے اپنے ایک پڑوسی کی شکایت کی جو اسے ستاتا تھا تو پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ، جناب سلمان، ابوذر اور مقداد جیسی اہم شخصیات کو حکم دیا کہ مسجد میں بلند آواز سے عام اعلان کر دیں کہ جس کے شر سے اس کے پڑوسی امان میں نہیں ہیں وہ ایماندار نہیں ہے" اور یہ اعلان تین مرتبہ تکرار کیا گیا پھر آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھوں سے چاروں طرف اشارہ کرتے

۱۔ سیرہ ابن ہشام، ج۲، ص۶۳۶

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۶۱

۳۔ بحارالانوار، ج۲۱، ص۳۲۸

ہوئے فرمایا: ہر طرف سے چالیس گھر پڑوسی شمار ہوتا ہے۔[1] اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہم تبلیغی مطالب کو اہم اور موثر افراد کے ذریعہ بیان ہونا چاہئے اور دوسرے یہ کہ مسجد جیسے اہم مقام پر عام لوگوں کے لئے بیان ہونا چاہئے اور تیسرے یہ کہ کئی مرتبہ تکرار ہونا چاہئے تاکہ سب لوگ سن اور سمجھ لیں اور کوئی بہانہ نہ رہے۔

منصوبہ بندی: دینی تبلیغ بغیر کسی منصوبہ بندی کے ممکن نہیں ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی تاکید قرآن کریم بھی کرتا ہے[2]، اسی لئے جب مہاجرین کا ایک گروہ حبشہ کی طرف جانے لگا تو جناب جعفر طیار کو رسول اسلامؐ کی جانب سے سردار اور ترجمان کے عنوان سے انتخاب کیا گیا اور ہجرت کے بعد آنحضرت کے چچا عباس مکہ میں رک جاتے ہیں تاکہ آپ کو وہاں کی خبر پہنچاتے رہیں اور علیؑ مکہ میں آپ کی امانتیں ادا کریں اور مصعب کو بھی آپ سے پہلے مدینہ بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہاں ماحول بنا سکیں۔

۳۔ تبلیغ کے عام اور علاقائی طریقے:

عام دعوت: یہ طریقہ قرآن کریم کی آیت فاصدع بما تومر و اعرض عن المشرکین، ترجمہ: اے رسول جس کا آپ کو حکم دیا ہے اس کو ظاہر کر دو اور مشرکین سے رو گردانی کرو[3] کے نازل ہونے کے ساتھ شروع ہوا۔ آپ کی بعثت کے تین سال گزر چکے تھے اور آپ نے خفیہ تبلیغ کے ذریعہ اس کام کے لئے حالات کو سازگار کر لیا تھا، اس کے بعد آپ کو اس طریقہ کار کا حکم دیا گیا یعنی دعوت عام اس وقت فائدہ مند ہے جب اس کے لئے پہلے سے حالات فراہم ہوں ورنہ مبلّغ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

غیر مزاحمتی معاہدہ کرنا: پیغمبر اسلامؐ نے علاقے میں امن و امان قائم رکھنے اور اپنے تبلیغی مقاصد کو حاصل کرنے اور مدینہ کی حدود سے آگے تک اس کو وسعت دینے کے لئے مدینہ میں بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودیوں سے[4] اور بیرون شہر کے مخالف قبیلوں اور گروہوں سے دفاعی اور غیر مزاحمتی

۱۔ اصول کافی، ج ۴، باب حق الجوار

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴

۳۔ سورہ حجر، آیت ۹۴

۴۔ بحار الانوار، ج ۱۹، ص ۱۱۰-۱۱۱

معاہدہ کیا جس کے بہت سے فائدے ہوئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مبلّغ عالمی سطح پر تبلیغ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ اپنے علاقہ کے امن و امان سے پوری طرح مطمئن ہو جائے۔

صلح و سلامتی کے ساتھ دعوت: پیغمبر اسلامؐ کا دین مبین اسلام کی طرف دعوت دینا صلح و سلامتی کی بنیاد پر استوار ہے، اسی لئے آپ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد شہر یثرب کے مختلف قبیلوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور صلح و محبت کا پرچم بلند کیا یہاں تک کہ بنا تفریق مذہب و ملت وہ یہودی ہوں یا مسلمان، مہاجر ہوں یا انصار، یثرب کے تمام لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ کرایا جیسا کہ مذکورہ علاقائی معاہدے صلح و سلامتی کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔ البتہ اگر مخالفین عہد شکنی کرتے اور طاقت کا استعمال کرنے لگتے تو آنحضرتؐ بھی اپنی پوری طاقت سے ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے اس لئے کہ اسلامی تبلیغ کی اصل یہ ہے کہ تبلیغ صلح و سلامتی کے طریقہ پر ہونی چاہئے یہی وجہ ہے کہ اسلام دین رحمت و مغفرت ہے اور اسی لئے آنحضرتؐ اس طریقہ کار کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

علاقہ کے اجتماعات سے استفادہ کرنا: جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ زمان و مکان (وقت و مقام) تبلیغی مطالب کے اثر انداز ہونے میں بہت اہمیت کے حامل ہیں چنانچہ پیغمبر اسلامؐ نے علاقہ میں ہونے والے اجتماعات سے بھی کافی فائدہ اٹھایا۔

حج کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب اعراب حرام مہینوں کے موقع سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف مقامات جیسے عکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز پر اکٹھا ہوتے اور کاروبار میں لگ جاتے تھے۔ شیرین زبان شعرا اور شعلہ بیان مقررین کبھی خانہ کعبہ کے پاس تو کبھی کسی بلند مقام پر لوگوں کو جمع کر لیتے اور بہادری، خود پسندی اور عشق بازی پر مشتمل اشعار اور تقریریں سناتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب یا کسی بلند مقام پر چلے جاتے اور اس مجمع کو مخاطب کرتے اور فرماتے:

> "خدا کی وحدانیت کا اقرار کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ تم ایمان کی طاقت سے دنیا کی حکومت کو حاصل کر سکتے ہو اور تمام لوگوں کو اپنے ماتحت کر سکتے ہو اور آخرت میں مقام حاصل کر سکتے ہو"[۱]۔

۱۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۲، ص ۴۲۲

ان مجمعوں میں تبلیغی دعوت مختلف مقامات تک بھی پہنچتی تھی اور علاقائی اور عام تبلیغ کی راہ میں ایک اور قدم شمار ہوتی تھی۔

ہجرت: تبلیغ کے لئے حالات مناسب نہ ہونے کی صورت میں ایسی جگہ چلے جانا چاہئے جہاں تبلیغ کے لئے جگہ مناسب ہو۔ اسی وجہ سے بعثت کے دسویں سال جب پیغمبر اسلامؐ کے دو بڑے حامی یعنی حضرت ابو طالب اور جناب خدیجہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو مکہ کے اس ماحول میں جہاں ہر طرف نفرتیں تھیں اور آپ کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا، تبلیغ کے تمام راستے بند ہو گئے تھے اسی لئے آپ نے اسلام کا مرکز بنانے کے لئے ایک مناسب مقام کا انتخاب کرنا چاہا۔ آنحضرت پہلے طائف گئے لیکن چونکہ اہل طائف نے آپ کو قبول نہیں کیا اس لئے آپ نے یثرب کے سرداروں سے ملاقات کرکے اس سلسلہ میں ان کو راضی کیا اور آخر کار مکہ کے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور حکومت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔[1]

تبلیغی گروہوں کو مختلف مقامات پر بھیجنا: پیغمبر اسلامؐ فوجی دستوں کے ذریعہ مخالفین کی سازشوں کو ناکام کرنے کے ساتھ ہی تبلیغی گروہوں کو مختلف قبیلوں میں بھیج کر آس پاس کے غیر جانبدار قبیلوں کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرتے تھے۔ منتخب مبلّغین جو قرآن و احادیث کے حافظ ہوتے تھے، اپنی جان پر کھیل کر واضح اور روشن بیان و اسلوب کے ذریعہ اسلامی عقائد کو دور دراز علاقوں کے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ ذات الرجیع کا قصہ اس سلسلہ کا ایک واضح نمونہ ہے جس میں تمام مبلّغین شہید ہو گئے[2]۔ پیغمبر اسلامؐ نے فوجی دستوں اور تبلیغی گروہوں کو بھیج کر نبوت و رسالت کی دو اہم ذمہ داریوں کو پورا کیا۔

مصیبت زدوں کی دلجوئی: تبلیغ کے دوران اگر کسی شخص یا گروہ کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو فوراً ان کی دلجوئی ہونی چاہئے اور ان کے نقصانات کی بھرپائی کی جانی چاہئے ورنہ لوگ اسلام اور مسلمانوں سے بدظن ہو جائیں گے اور ان کے خلاف غلط پروپیگنڈوں کے اسباب فراہم ہو جائیں۔

قبیلہ جذیمہ ابن عامر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے خالد ابن ولید کو بھیجا گیا، پیغمبر اسلامؐ کی تاکید کے باوجود زمانہ جاہلیت کی دشمنی کی وجہ سے جنگ و قتل و خون کی نوبت آگئی۔ خالد کی اس غلط حرکت کی

۱۔ ایضاً، ج، ص ۴۱۹، ۴۲۱

۲۔ فروغ ابدیت، ج ۲، ص ۸۲

وجہ سے رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو فوراً وہاں بھیجا تا کہ ان کے نقصانات کی بھرپائی کریں اور مقتولین کا خونبہا ادا کریں[۱]۔ اس لئے کہ اس جرم کی وجہ سے دوسرے قبیلوں پر غلط اثر پڑتا اور وہ اسلام سے بدظن ہو جاتے۔

تبلیغ میں لچک کا ہونا: تبلیغ میں لچک دار رویہ کی بنیاد پر کبھی کبھی پیغمبر اسلامؐ مشرکین کی بعض ایسی شرطوں کو قبول کر لیتے تھے جو اسلامی اصولوں کے خلاف نہیں ہوتی تھیں تا کہ وہ مسلمان ہو جائیں یا اسلام کی طرف مائل ہو جائیں اور نفسیاتی طور پر یہ طریقہ کافی حد تک موثر ہوتا تھا۔ مثلا قبیلہ ثقیف کے نمائندوں نے درخواست کی کہ خود ان کے ہاتھوں سے بتوں کو توڑنے کو نہ کہا جائے، آنحضرت نے یہ بات مان لی، اس لئے کہ اصل مقصد باطل معبودوں کو ختم کرنا تھا اور یہ کام چاہے ان کے ہاتھوں انجام پائے یا کسی اور کے[۲]۔

اسی طرح صلح حدیبیہ میں بعض صحابہ کے اعتراض کے باوجود مشرکین مکہ کے شرائط کو قبول کر لینا بھی، اسی اصل کی رعایت کے لئے تھا۔ اس بنیاد پر مبلّغین کو چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو اور اسلام کے لئے نقصان دہ نہ ہو وہاں تک وہ اپنی طرف سے نرمی اور لچک کا رویہ رکھیں تا کہ مقابل کے دل کو جیتا جا سکے۔

۴۔ عالمی تبلیغ کے طریقے:

دنیا کی بڑی طاقتوں کو دعوت دینا: جس مبلّغ کی تبلیغ عالمی ہو وہ دنیا کی بڑی طاقتوں سے غافل نہیں رہ سکتا بلکہ اس کو چاہئے کہ بہادری اور مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے مذہب کو ان کے سامنے پیش کرے، چاہے اس سلسلہ میں بہت سے خطروں کا بھی سامنا کرنا پڑے اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے اس زمانہ کے بڑے بڑے حکمرانوں کو جیسے خسرو پرویز، روم کے حاکم ہرقل نیز دوسرے ممالک جیسے مصر اور حبشہ وغیرہ کے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور ان کو رسمی طور پر دین اسلام کی دعوت دی۔ ان خطوط کی عبارتیں تاریخ کی اہم کتابوں جیسے سیرہ ابن ہشام، تاریخ مسعودی اور تاریخ طبری وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ ان خطوط میں آنحضرتؐ نے ادب و احترام کے ساتھ ساتھ ایسی سختی بھی برتی جس میں تشویق و تہدید بھی تھی۔ اس

۱۔ رسولی محلاتی، عبدالکریم، ج ۳، ص ۵۷۰؛ سیرہ ابن ہشام، ج ۴، ص ۷۰، ۷۲

۲۔ فروغ ابدیت، ج ۲، ص ۴۱۴، ۴۱۶

طرح آپ نے نمونہ کے طور پر ایک خاص طریقہ تبلیغ کو پیش کیا جس کی تاسی کرتے ہوئے دور حاضر میں امام خمینیؒ نے مشرقی دنیا کی بڑی طاقت کے سربراہ گورباچوف کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔

کامیابی کے لئے الٰہی وعدوں کی خوشخبری: پیغمبر اسلامؐ کی عام دعوت کا آغاز اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ سے ہوا کہ آپ کا دین پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ قرآن کریم کا آپ کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کی خوشخبری دینا فَٱصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡمُشۡرِكِينَ. إِنَّا كَفَيۡنَٰكَ ٱلۡمُسۡتَهۡزِءِينَ[۱] یا کفرو شرک پانی کے جھاگ کی مانند ہے جو نابود ہو جائے گا اور مذہب اسلام اس پانی کی طرح ہے جو زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے[۲] اور سب سے اہم روم کے حاکم پر فتح کی پیشین گوئی جس کی طرف اس سورہ کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، آنحضرت کا اس طریقہ تبلیغ سے استفادہ کرنے کی خبر دیتا ہے۔

بین الاقوامی ہجرت: پیغمبر اسلامؐ اپنے توحیدی دین کو پوری دنیا میں پھیلانا چاہتے تھے لہٰذا آپ نے دو مرحلوں میں تراسی (۸۳) افراد پر مشتمل ایک گروہ کو حبشہ کی جانب روانہ کیا۔ اگرچہ بعض تاریخی کتابوں میں اس ہجرت کی وجہ مسلمانوں کو مشرکین کے شر سے نجات دینا لکھا ہے لیکن اس واقعہ کے دوسرے پہلو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چونکہ مذہب توحید کا مقصد دنیا کے تمام لوگوں کو اس دین کی دعوت دینا تھا اس لئے رسول اکرمؐ نے پہلے اپنے اصحاب کو حبشہ بھیجا تا کہ ایک تو مشرکین کے شر سے انہیں نجات ملے اور دوسرے اسلام کی آواز کو اس علاقہ میں پہنچایا جاسکے اور اس طرح مذہب اسلام کو پوری دنیا میں پھیلانے کی طرف ایک قدم بڑھایا جاسکے۔ ایسا لگتا ہے کہ دوسرا مقصد آنحضرت کے لئے زیادہ قابل توجہ تھا اس لئے کہ جناب جعفر طیار جیسے مبلّغ کو اس گروہ کے ساتھ بھیجنا اور ہجرت کے ساتویں سال تک ان کا وہاں رہنا، دوسرے مقصد کی اہمیت کو

۱۔ سورہ حجر، سورہ ۹۴، ۹۵

۲۔ أَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ أَوۡدِيَةُۢ بِقَدَرِهَا فَٱحۡتَمَلَ ٱلسَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًاۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيۡهِ فِي ٱلنَّارِ ٱبۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ أَوۡ مَتَٰعٖ زَبَدٞ مِّثۡلُهُۥۚ كَذَٰلِكَ يَضۡرِبُ ٱللَّهُ ٱلۡحَقَّ وَٱلۡبَٰطِلَۚ فَأَمَّا ٱلزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ كَذَٰلِكَ يَضۡرِبُ ٱللَّهُ ٱلۡأَمۡثَالَ (سورہ رعد، آیت ۱۷)

واضح کرتا ہے اگرچہ دونوں مقصد حضور کے لئے اہم تھے۔آج کے زمانہ میں افریقہ میں خاص طور پر سوڈان میں (سابقہ حبشہ) مسلمانوں کی کثیر تعداد اس مہاجر گروہ کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔

عصری تعلیم کے حصول کا حکم: پیغمبر اسلامؐ نے اسلامی حکومت کی تشکیل کی ابتدا ہی سے مسلمانوں کو عصری تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا تاکہ ایک طرف تو وہ پوری آگاہی کے ساتھ اسلام کو قبول کریں اور اپنے ایمان پر باقی رہیں اور دوسری طرف چونکہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے اور تمام لوگوں کو اس سے مطلع ہونا چاہئے لہٰذا دوسری اقوام و مذاہب کے لوگوں سے رابطہ کرنا بھی ضروری ہے، جس کے لئے ان کی زبان ،عقائد اور افکار کا جاننا بہت اہم ہے جو عصری علوم کو حاصل کرکے ہی ممکن ہے لہٰذا پیغمبر اسلامؐ کا مسلمانوں کو علم حاصل کرنے کی تاکید کرنا یا دوسری اقوام و مذاہب کے عقائد و افکار سے آگاہی کا حکم دینا مذہب توحید کو بین الاقوامی کرنے کے لئے ایک قسم کی تبلیغ کا طریقہ ہو سکتا ہے اسی لئے آپ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو عصری تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیتے تھے بلکہ آپ کی کوشش یہ تھی کہ مسلمان دوسرے اقوام و مذاہب کے عقائد و افکار سے بھی آگاہ ہوں تاکہ آسانی سے ان سے روابط پیدا کر سکیں اور دین اسلام کو پوری دنیا تک پہنچا سکیں۔اسی سلسلہ میں ہجرت کے چوتھے سال آپ نے زیاد ابن ثابت کو حکم دیا کہ وہ یہودیوں سے سریانی زبان سیکھیں[۱]۔

تبلیغ کی رکاوٹوں کو دور کرنا: صرف دین کی تبلیغ ہی کافی نہیں ہے بلکہ راستہ سے رکاوٹوں کو بھی دور کرنا چاہئے اس لئے کہ کسی بھی مذہب کا پیغام چاہے جتنا دلنشین ہو اور دلوں کو منقلب کرنے والا ہو لیکن اگر رکاوٹیں موجود ہوں تو کامیابی ممکن نہیں ہے اس لئے مبلّغ کی ذمہ داری ہے کہ راہ کو ہموار کرے اور رکاوٹوں کو ختم کرے تاکہ صاف پانی حقیقت کے پیاسوں تک پہنچ سکے۔

پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ کا طریقہ حتی کہ جنگ کے دوران بھی یہ واضح کرتا ہے کہ آپ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ دشمن کے پروپیگنڈہ کو ناکام کردیں تاکہ ان کا اتحاد ٹوٹ جائے اور وہ پراگندہ ہو جائیں اس لئے کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر تبلیغ اسلام کی راہ سے رکاوٹوں کو ہٹا دیا جائے تو اسلام کی طاقتور منطق آزاد فضا میں اپنا کام کر دکھائے گی۔

۱۔ فروغ ابدیت، ج ۲، ص ۱۰۷

اس کے علاوہ جس مبلّغ کا مقصد عالمی سطح کا ہو اور وہ اپنے مذہب کو دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہو، وہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ اپنی آواز کو پوری دنیا کے کانوں تک پہنچا سکے اور رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے یہ کام ممکن نہیں ہے اسی لئے آنحضرتؐ کی کوشش یہ تھی کہ آپ قومی،علاقہ کی اور دنیا کی تمام رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹا دیں۔

مدینہ اور جزیرۃ العرب کے علاقوں میں آپ نے مشرکین اور دشمنوں سے جو جنگیں لڑیں وہ علاقائی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے تھیں اور وہ جنگیں جو دور دراز علاقوں جیسے تبوک وغیرہ میں لڑی گئیں اصل میں وہ دعوت اسلام کی راہ میں آنے والی باہری اور بین الاقوامی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے تھیں اسی طرح سے آنحضرتؐ کی اندرونی اور علاقائی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوششوں کو بیرونی رکاوٹوں کو دور کرنے اور اسلام کی عالمی تبلیغ کا مقدمہ شمار کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ جب تک اسلامی قیادت اپنے علاقہ میں امن واطمینان پیدا نہ کر سکے اور رکاوٹوں کو دور نہ کر سکے اس وقت تک وہ اپنے مذہب کو بیرونی علاقوں میں یا پوری دنیا میں کس طرح پیش کر سکتا ہے۔

دھمکیوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہنا: دھمکیوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہنا بھی تبلیغ کا ایک طریقہ ہے اس لئے کہ اگر مبلّغ کسی بھی دھمکی یا دباؤ میں آکر میدان چھوڑ دے تو کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اوائل رسالت میں قریش کے دباؤ کے مقابلہ میں پیغمبر اسلامؐ کا سختی سے ڈٹے رہنا اور اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے حملوں اور جنگوں میں ثابت قدم رہنا اور کسی بھی بڑی طاقت جیسے روم و ایران کی دھمکیوں سے آپ کا خوفزدہ نہ ہونا اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اس دور کی بڑی طاقت روم کی دھمکیوں کا جنگ تبوک اور موتہ میں سامنا کیا۔ دشمن سے مقابلہ اور ثابت قدمی اور اپنے دعوے پر ڈٹے رہنا بھی اسلام کے عالمی ہونے کے سلسلہ میں ایک طریقہ تبلیغ تھا۔

طاقت کا استعمال: جب حق کا پیغام پہنچا دیا گیا تو اب سماج کی اصلاح کے لئے ضدی اور خودخواہ افراد کے خلاف آخری حربہ یعنی طاقت کا استعمال ناگزیر ہے۔ بعثت کے بیس سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد اور ہجرت کے نویں سال کے اواخر میں سورہ توبہ کی کچھ آیتوں کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اسلامؐ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ حج کے موسم میں عوام پر حجت تمام کریں اس لئے کہ اسلام کی قوی منطق تقریباً سب تک بالخصوص

عربستان کے تمام مشرکوں تک پہنچ چکی تھی اور اگر اس کے باوجود کچھ لوگ شرک و بت پرستی پر اڑے ہوئے تھے تو وہ ضد اور تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اس اعتبار سے اب وہ وقت آگیا تھا کہ آنحضرتؐ سماج کی اصلاح کے لئے آخری حربہ یعنی طاقت کا استعمال کریں اور بت پرستی کی تمام نشانیوں کو مٹادیں اور ان کو حقوق الٰہی اور انسانیت پر ایک قسم کی زیادتی تصور کریں لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو طاقت کے استعمال کا حکم اس وقت ہوا جب تبلیغ کے تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے تھے اور تبلیغ کے سلسلہ میں یہ طریقہ آخری حربہ کے عنوان سے استعمال کیا گیا۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں خود ساختہ طاقتوں کی پائداری کی تین وجوہات رہی ہیں۔ تبلیغات، تسلیحات (اسلحہ کا استعمال) اور اطلاعات جن میں تبلیغ ان سب پر مقدم ہے اس لئے کہ بنا ارادہ کے اسلحہ اور بغیر فکر و نظر کے اطلاعات اور یہ دونوں تبلیغات کے بنا کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔

اہل حق کی خوش فہمی، سچائی اور سادگی نیز ان کا یہ ماننا کہ لوگوں پر غلبہ کی ضرورت نہیں ہے اس بات سے مانع ہے کہ وہ شیطانی تبلیغات کے حربوں اور طریقوں سے آگاہ ہو سکیں۔ ایمانی تبلیغ انسان سازی اور شیطانی تبلیغ انسانیت کی بربادی کے لئے ہوتی ہے اور تخریب تعمیر سے زیادہ آسان ہے۔ انسان کی اصلاح کے لئے تبلیغ بہت ضروری ہے اور تبلیغ بغیر مناسب طریقہ کے ممکن نہیں ہے۔ تبلیغ کے صحیح طریقے کے حصول کے لئے اور تبلیغ کی ظرافت و حساسیت کے پیش نظر اسے عنصر وحی سے منسلک ہونا چاہئے اور پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام وحی کے مظہر اور ترجمان ہیں لہٰذا آپ حضرات کی سیرت و سنت سے استفادہ کرتے ہوئے تبلیغ کے صحیح طریقے کو معلوم کرنا چاہئے اور ایمانی طاقت کے ساتھ اس کو جامہ عمل پہنانا چاہئے۔

ابلاغ و تبلیغ لغت میں پہنچانے کے معنی میں ہے اور اصطلاح میں تبلیغ یعنی کچھ باتوں کو دوسروں تک پہنچانا جو کسی پیغام پر مشتمل ہو اور مبلّغ پیغام پہنچانے والا ہے۔ قرآن کریم میں استعمال ہوئے تبلیغ کے مختلف صیغوں جیسے ابلاغ و تبلیغ وغیرہ اور ان سے ملتے جلتے مفاہیم سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ تبلیغ احکام و معارف الٰہی کے پہنچانے کا نام ہے جس میں بشارت یعنی خوشخبری اور ہدایت کا پہلو مضمر ہے تاکہ انسان اپنے ارادہ و اختیار کے ذریعہ حق کے راستہ کو طے کر سکے اور یہ ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ اور ان کے جانشینوں کے سپرد کی گئی ہے جس کی دو اہم بنیادیں ہیں ایک آزادی اور دوسرے دلیل و برہان۔

کسی بھی مکمل ارتباطی نظام کے وجود کے لئے جس میں تبلیغ بھی شامل ہے، چار چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ پیغام دینے والا، پیغام، پیغام کو حاصل کرنے والا اور پیغام پہنچانے کا طریقہ جس کو عناصر ارتباطی کہتے ہیں۔اسلام نے پیغام پہنچانے والے (مبلّغ) کے لئے کچھ شرائط و صفات بیان کئے ہیں اور پیغمبر اسلامؐ میں جو دین اسلام کے پہلے مبلّغ تھے وہ تمام شرائط و صفات بطور احسن و اکمل پائے جاتے تھے۔قرآن کریم اپنی حقانیت و اعلیٰ مطالب کے پیش نظر اسلامی تبلیغ کے نظام میں پیغام کا عنصر شمار ہوتا ہے۔ اس نظام میں پیغام حاصل کرنے والے عرب کے جاہل افراد تھے جو حق کی دعوت کے مقابلہ میں سخت پتھر کی طرح ڈٹے تھے اور بڑی جنگیں اور رکاوٹیں کھڑی کیں جن کو اپنا تابع بنانا آنحضرتؐ کے لئے سب سے سخت مرحلہ تھا۔

پیغام کو پیش کرنے کی کیفیت اور مخاطبین کے ساتھ سلوک کی بنیاد پر پیغام پہنچانے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے ان سب طریقوں سے مناسب استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تبلیغی ذمہ داریوں میں قرآنی تعلیمات سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے عناصر جیسے زمان و مکان اور منصوبہ بندی بھی تبلیغ پر اثرانداز ہوتی ہیں اور آنحضرتؐ نے اس سے مکمل استفادہ کرتے ہوئے اپنی الٰہی ذمہ داری کی انجام دہی میں خاتمیت کا تمغۂ افتخار بارگاہ خداوندی سے حاصل فرمایا۔

نبی اکرمؐ کی زندگی، رفتار و گفتار اور کردار پر غور کرنے سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ آپ ابلاغ رسالت کے سلسلہ میں مختلف تبلیغی طریقوں سے استفادہ کیا جن کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے پیغام کو پیش کرنا، افراد اور گروہوں کو اپنی طرف مائل کرنا، انفرادی تبلیغ میں علاقائی اور عالمی سطح پر اپنی رسالت کو وسعت دینا وغیرہ۔

انفرادی تبلیغ میں آپ نے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا جیسے تبلیغ کا ایک چھوٹے سے کام سے شروع کرنا، تبلیغ میں فرد کی اصلاح، مشہور قبائل کے سرداروں کو اپنانا، جنگجوؤں کو اہمیت دینا، جنگ میں بھی لوگوں کے حقوق کی رعایت، گناہ پر مصر جوانوں کو اظہار نظر کی جرات دینا، مسلمان ہونے والے کافروں کے سرداروں کی تالیف قلب، انکساری اور اخلاق کا اظہار، آمادہ دلوں کو اپنا گرویدہ کرنا، شوق و انتظار پیدا کرنا، متکبروں کی تذلیل و تحقیر اور ضمیر کو بیدار کرنا۔

اسی طرح گروہی یا اجتماعی تبلیغ میں بھی آپ نے بہت سے طریقوں سے استفادہ کیا جیسے رشتہ داروں کے درمیان تبلیغ کرنا، مسلمانوں کے درمیان بھائی چارگی، مخالفین کی باتوں کو سننا اور مناظرہ کرنا، مظلوموں

کے حقوق کے دفاع کے معاہدہ میں شرکت، غیر معمولی مواقع سے فائدہ اٹھانا، خطبہ و تقریر، لوگوں کی مدد کرنا، لوگوں سے مشورہ کرنا، نظم و ضبط کو اہمیت دینا، تبلیغ میں چیلنج کا استعمال، تبلیغ میں اہم لوگوں سے استفادہ کرنا اور منصوبہ بندی کے ذریعہ تبلیغ کرنا۔

علاقائی اور عام تبلیغ میں بھی آپ نے بہت سے طریقوں سے استفادہ کیا جیسے عام دعوت، غیر مزاحمتی معاہدے، صلح و سلامتی کے ساتھ اسلام کی دعوت، علاقہ کے اجتماعات سے استفادہ کرنا، علاقائی ہجرت، تبلیغی گروہوں کو مختلف مقامات پر بھیجنا، مصیبت زدوں کی دلجوئی اور تبلیغ میں لچک کا ہونا۔

آپ کی عالمی تبلیغ میں جو طریقے استعمال کئے گئے وہ ہیں: دنیا کی بڑی طاقتوں کو دعوت دینا، کامیابی کی الٰہی وعدوں کی خوشخبری، بین الاقوامی ہجرت، عصری تعلیم کے حصول کا حکم، تبلیغ کی رکاوٹوں کو دور کرنا، دھمکیوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہنا اور طاقت کا استعمال۔ دوسرے اعتبارات سے بھی پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغ کے طریقے تجزیہ و تحلیل کے محتاج ہیں جن کے لئے ایک علیحدہ مقالہ درکار ہے جیسے اخلاقی طریقے، ہنری، تشویق وتنبیہ، امن پسندی، دور اندیشی وغیرہ۔

منابع ومآخذ:

- قرآن کریم
- نہج البلاغہ
- بی آزار شیرازی، سید ہاشم، زندگانی حضرت محمد خاتم النبیینؐ، ج ۳
- بی آزار شیرازی، سید ہاشم، تاریخ انبیا، علمیہ اسلامیہ
- زورق، محمد حسن، مبانی تبلیغ، سروش، تہران، ۱۳۶۸
- سبحانی، جعفر، فروغ ابدیت، ج ا و ۲، نشر دانش اسلامی، قم، ۱۳۷۰
- قرائتی، محسن، قرآن و تبلیغ، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۷۲
- قمی، حاج شیخ عباس، منتہی الامال، ج ۲، ہجرت، قم، ۱۳۷۴
- کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ترجمہ حاج سید جواد مصطفوی، ج ۴
- ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، معروف بہ سیرہ ابن ہشام، ج ا و ۲ و ۳ و ۴، بیروت، ۱۹۸۵ م
- مطہری، مرتضی، داستان راستان، ج ا و ۲، صدرا، قم، ۱۳۷۲

پیغمبر عظیم الشان کی انتظامی خصوصیات

مؤلف: ڈاکٹر جعفر تابان
مترجم : مولانا جعفر زیدی

مسلمان محققین کی اکثریت جس چیز کو اسلامی حکومت کا بنیادی رکن اوراس کا معاون و مددگار جانتی ہے وہ مشاورت وہمفکری ہے۔ قرآن کریم نے چند جگہوں پر اس اہم موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی اہمیت یاد دلائی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس اصل سے بخوبی استفادہ کیا اور آنحضرت کی انتظامی سیرت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مشاورت اور مشورہ کرنے کی ثقافت، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام مراحل میں اہم مقام رکھتی ہے۔ مسلمان مفکرین نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے، قرآن اور روایات نبوی سے الہام لیکر وسیع تحقیقات انجام دی ہیں۔

امام خمینیؒ فیصلہ کرنے کے مختلف مواقع پر اور حکومتی امور کی انجام دہی کے موقع پر عوامی رائے کو معیار قرار دیتے ہیں، اسی بنیاد پر جمہوری اسلامیہ ایران کے آئین میں مختلف فیصلوں میں عوام کی موجودگی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای نے بھی مختلف مواقع پر اس نظام کے عوامی ہونے اور مختلف حکومتی فیصلوں میں عوامی مشارکت پر تاکید کی ہے۔ اہل سنت کی عظیم شخصیت، سید قطب مشورت کو تیسرا اصل اور زندگی کے اصول میں سے ایک اہم اصل جانتے ہیں اور محمد رشید رضا، صاحب تفسیر المنار مشورت کو حکومت کا اہم ترین قاعدہ مانتے ہیں۔ در اصل اسلام کے سیاسی فلسفے میں مشورت اور ہم فکری کا اہم مقام ہے۔

قرآن کریم کی آیات اور اسی طرح روایات معصومینؑ میں خصوصا سیرت نبی مکرمؐ میں غور وفکر کرنے سے انسان اس نکتہ کو جان جاتا ہے کہ مشورت انفرادی اور اجتماعی فیصلوں میں ایک اہم اسلامی اصول ہے۔

آج کل عوامی حکومت اور مشورت کے اصل کو، وہ بھی ناقص طور پر جانا جا چکا ہے اور عوامی اور بین الاقوامی اداروں میں اس اصل کے مطابق فیصلوں پر تاکید کی جاتی ہے جس سے اس عمل کی اہمیت اجاگر

ہوتی ہے۔ اس کے باوجود، قرآن کریم کی اس موضوع پر نگاہ اور نبی کریمؐ کا اس پر اہتمام اس اصل کی گہرائی اور اہمیت کو اور اجاگر کرتا ہے۔ اس مقالہ میں اس موضوع کو اور اس کی اہمیت کو، آیات و روایات کے منظر میں اور سنت نبویؐ کی تاکید کے ساتھ، بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ کوشش رہے گی کہ وحی و سیرت نبویؐ کے پاک دھارے سے چند عملی نکتوں کا جائزہ لیا جائے۔

شورا یا مشاورتی کاونسل: معنا و مفہوم

شورا لغت میں فراہمی، پیشکش یا ایک پوشیدہ نفیس اور اچھی چیز کو ظاہر کرنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ معنی اس وجہ سے ہے کہ مشورت کرنے میں جو کچھ مشورت کرنے والے کے لئے چھپا ہوا ہے، مشورہ دینے والے کے ذریعہ آشکار ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ شورا کو شار العسل یعنی چھتے سے شہد باہر نکالنے کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ یہ معنا مشورہ کے عمل میں دقت نظری اور تحمل کو پہنچاتا ہے، کیوں کہ چھتے میں سے شہد کو آرام سے باہر نکالا جاتا ہے (معجم اللغۃ)۔ اس کے علاوہ مشورت کی وجہ سے کام زیادہ آرام و سکون اور صبر و تحمل کے ساتھ انجام پاتا ہے (مصباح المنیر، مادہ شور)۔ اسی بنا پر، شورا کے مفہوم میں، وضاحت، شرح اور اس جیسے مفاہیم کا لحاظ کیا گیا ہے (صحاح اللغۃ)۔ کیوں کہ یہ لغت وسیع پہلوؤں پر نظر رکھتی ہے اسی وجہ سے مختلف جگہوں پر استعمال ہوتی ہے، اور انفرادی اور اجتماعی کاموں کے سانچوں میں نمایاں ہوئی ہے، اور اسے مختلف اصطلاحی اور لغوی معنا دئے گئے ہیں، جیسے سلامتی کاؤنسل، مجلس شورائے اسلامی، ثقافتی انقلاب کی کاؤنسل، شورائے نگہبان، شورائے تامین شہر اور گاؤں کی شورا وغیرہ۔

انسان کی فکری اور روحانی کمزوریاں اور ہم فکری کی اہمیت

تمام مخلوقات عالم کے درمیان انسانوں میں کچھ خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ انسان کی خلقت عقل اور محبت، عشق اور تفکر، معرفت اور توجہ کا مجموعہ ہے اور یہ سب پہلو اپنی جگہ پر انسان کے کمال میں اہم درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن کی نظر میں انسان ایک دو جہتی موجود ہے، اس کا مادی پہلو خاک سے پیدا ہوا ہے، اور دوسرا اس کا معنوی پہلو ہے جس کو قرآن میں روح الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس بنا پر علم اور تفکر انسان

کی دو اہم خصوصیات ہیں: يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ[۱]۔خدا صاحبانِ ایمان اور جن کو علم دیا گیا ہے ان کے درجات کو بلند کرنا چاہتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہے: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ[۲]، کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ہیں؟

انسان کا یہ مقام، اس بات کا باعث بنتا ہے کہ اس کے رشد اور کمال میں برتری کے ساتھ اس کے غلط رویے اور غلط راستے پر جانے کی صورت میں اس کا نقصان اور خسارہ بھی بہت زیادہ ویران کر دینے والا ہو۔ خدا نے انسان کو مختار خلق کیا ہے تاکہ اپنی مرضی و آگہی اور اختیار سے زندگی بسر کرے لیکن اس کی معلومات وآگہی کا دائرہ بہت محدود ہے اور بہت سے مواقع پر جو کچھ وہ انجام دیتا ہے اس کے نتائج سے واقف نہیں ہوتا۔ قرآن نے انسان کی اس محدودیت کو نہایت اچھے انداز میں بیان کیا ہے: وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ اسی بناپر دوسروں کی طرف جانا اور ان سے گفتگو کرنا ایک ضرورت کی بناپر، انسان کی آگہی کے دائرے کو بڑھا دیتا ہے، اور ایک بہتر فیصلے کے امکانات کو زیادہ کر دیتا ہے۔ ایک انسان جتنا بھی متفکر، عاقل اور دانشمند ہو، بالاخر ایک فرد ہے۔ جب دوسروں کے ساتھ مشورہ کرتا ہے تو اس کی عقل اور سوچ کو دوسروں کے ذریعہ مزید طاقت ملتی ہے، اور طبیعتاً اس کی غلطی کرنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

انسانی معاشرے کی ترقی اور کمال، اور انسان کا فطری طور پر ترقی کا خواہاں ہونا اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے پھیلاؤ اور پیچیدگیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے، ایسا لگتا ہے کہ خود پسندی اور دوسروں کی تجربیات سے فائدہ نہ لینا، ترقی نہ کرنے کے برابر ہے اور انسان کی فطری خواہش سے تضاد رکھتا ہے۔ اسی بناپر دوسروں سے رابطہ کرنا اور ان کے افکار اور آراء سے استفادہ کرنا، فیصلے کرنے کی صلاحیتوں کو بڑھا دیتا ہے اور نقصان کی آفتوں سے بچاتا ہے۔

۱۔ سورہ مجادلہ، آیت ۱۱

۲۔ سورہ زمر، آیت ۹

ایک اور اہم مسئلہ انسانوں کے حقوق پر توجہ دینا ہے، خاص کر ایسے مقامات پر جہاں فیصلے ان کے مستقبل پر اثرانداز ہوتے ہیں اور انسانوں کی اجتماعی زندگی میں، جس کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لوگوں کی خواہشیں بہت سی جگہوں پر ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہیں، ایسے حالات میں، انسانوں کے حقوق کا حصول صرف مختلف لوگوں کی آراء سے استفادہ کرنے سے منسلک ہوتا ہے اور اسکے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، اور آج کل انسانی معاشرے کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ حد تک اس بات پر توجہ دیں۔

جو کچھ بیان ہوا اس بنا پر، مشورہ کرنا زندگی کی اہم ضروریات میں سے ایک ہے اور اس سے لاپروائی یا اسے چھوڑ دینا، نا قابل تلافی نقصانات کو جنم دیتا ہے۔اسی بنا پر اور قرآنی تاکید کی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ باوجودیکہ علم الہٰی کے لازوال ذخیرے سے جڑے ہونے کی وجہ سے کسی کے مشورہ کے محتاج نہیں تھے لیکن آپؐ نے اس اہم مسئلہ پر خاص توجہ دی اور اپنی سیرت میں اس پر پابندی کی۔

اسی طرح علمائے دین بھی مشاورت اور مشورہ کے مسئلے پر اور ماہرین سے رجوع کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ یہ حضرات رسالہ عملیہ (توضیح المسائل) اور فقہی مباحث میں جب تقلید کے موضوع پر پہنچتے ہیں، تو اس موضوع پر توجہ دلاتے ہیں، اور خاص کر اس کی دلیل کو عرف عقلا جانتے ہیں (کفایہ الاصول، ۲، مبحث تقلید) اسی بناپر، فیصلہ کرنے اور کاموں کو انجام دینے کے لئے، ماہرین سے مشورت کرنی چاہئے۔

مشورت کی اہمیت کی وجہ سے اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ امام خمینیؒ اسلامی جمہوریہ کے ابتدائی دنوں سے ہی، نوع حکومت کے انتخاب کے لئے عوامی رائے کے پابند رہے اور عوام سے اس بات کی درخواست کی وہ استصواب عامہ میں شامل ہو کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اسلامی جمہوریہ نظام میں مشاورتی ادارے، چاہے وہ اعلیٰ سطحی ادارہ ہوں یا شہر اور گاؤں کے مشاورتی ادارے، قرآن، روش اور سیرت رسول اکرمؐ سے متاثر ہو کر تشکیل پائے ہیں۔ رہبر معظم کی امور کو بہتر طور پر انجام دینے کے لئے ہم اندیشی اور مشاورت پر تاکید، اسی سوچ سے اخذ کی گئی ہے۔

قرآن میں مشورت

قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات موجود ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مشورہ کرنے کے عمل کو اسلامی حکومت کی ایک روش بتاتی ہیں اور قرآن کریم کی تین آیتوں میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے، :

پہلی آیت:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّـهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّـهِ ۚ إِنَّ اللَّـهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۔[۱]

ترجمہ: پیغمبر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے لہٰذا اب انہیں معاف کردو۔ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیہ کریمہ میں پروردگار کھلے الفاظ میں پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ مومنین اور مسلمانوں سے مختلف امور میں مشورہ کریں۔اس آیت کے بارے میں مختلف باتیں بیان کی جاتی ہیں:

۱۔کہا جاتا ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہے۔اس وقت جب پیغمبر اکرمؐ اصحاب سے مشورہ کرنے کے بعد احد کی پہاڑیوں پر مشرکین سے مقابلے کرنے گئے[۲]۔جنگ کا نتیجہ بظاہر مسلمانوں کی شکست تھا لیکن اس جنگ کی وجہ سے مسلمانوں نے بہت قیمتی تجربے حاصل کئے۔ گرچہ پیغمبرؐ اور بعض دیگر اصحاب کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں ہی رکیں اور شہر کے اندر سے دفاع کریں، لیکن اپنی زندگی کے اختتام تک، رسول اکرمؐ نے ان دلیر اور شجاع جوانوں کو جنہوں نے احد کی طرف جانے کا مشورہ دیا تھا، مورد الزام نہیں ٹھرایا۔

۲۔اس آیت شریفہ میں، امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ. علمائے علم اصول کہتے ہیں صیغہ امر واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے[۳]۔اسی بنا پر مشورت کرنا حتی رسول اکرمؐ کے لئے بھی واجب ہو جاتا ہے۔اس جگہ پر یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ مقام عصمت اور علم لدنی کے مالک ہیں، کس طرح ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عوام سے مشورہ کریں؟ جواب میں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ مؤمنین پر واجب ہوتا ہے وہ پیغمبرؐ پر بھی واجب ہوا۔ پیغمبرؐ پر یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ دوسرے لوگ اور اہتمام کے ساتھ، مشورت کے امر پر عمل کریں، اور مشورت اور دوسروں کی فکر اور ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ لینے کا

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹

۲۔ تفسیر قمی، ص ۱۰۱؛ تاریخ یعقوبی، ج۱، ۴۰۶

۳۔اصول فقہ مظفر، ص ۵۹؛ کفایۃ الاصول، ج۱، ص ۸۳

کلچر اسلامی معاشرے میں رائج ہوسکے۔ البتہ جب پیغمبرؐ مشورہ لیتے تھے، تو اصحاب و انصار روحی اور شخصیتی لحاظ سے طاقتور بنائے جاتے تھے، اور وہ فردی اور اجتماعی امور میں احساس ذمہ داری کرتے تھے۔

۳۔ امر کا لفظ اس آیہ شریفہ میں، مطلق ہے اور کسی خاص چیز پر اشارہ نہیں کرتا، اسی وجہ سے لازم ہے کہ اجتماعی اور ذاتی اور اجرائی تمام امور میں مشورہ لیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ظاہری شکست، جیسے جنگ احد میں ملی، اس بات کا باعث بنے کہ مشورت جیسے اہم امر اور عوام کا انتظامی معاملات میں شامل ہونا روک دیا جائے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ احکام شریعت اور ان کی پیروی کرنا اس حکم میں شامل نہیں ہوتا، اور سب کو ان کی پیروی کرنی ہوگی، بلکہ جو بھی مشورہ کیا جائے وہ اس چوکھٹے کے اندر کیا جائے۔

۴۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس آیہ مبارکہ میں رسول اعظمؐ کو حکم دیتا ہے کہ: "اگر کوئی فیصلے کرو تو اللہ پر توکل کرو" یعنی فیصلہ کرنے کے بعد، کسی قسم کے مشورہ کی جگہ نہیں بچتی اور اس فیصلہ کو بنا کسی تردید کے عملی جامہ پہنا دینا چاہئے، لیکن یہ بات کہ کیا پیغمبرؐ کے تمام فیصلے مشورہ کے پابند ہونے چاہئے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ طبیعی طور پر جب پیغمبرؐ، کسی سے مشورہ کرتے تھے تو اس مشورہ کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ اور عمل کرتے تھے اور اگر کبھی مشورہ کا مطلوب نتیجہ نہ نکلتا تو، مشورہ کے اصل کو مورد الزام نہ ٹھرایا جاتا، بلکہ طرفین مشورہ، یہ کوشش کرتے کہ مزید درستگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ، ہمفکری اور دینی رائے کا اظہار کریں اور دقیق مشورہ کو چنیں۔ پیغمبر اکرمؐ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ عوام کی تربیت اور ہدایت کا کوئی موقع ضائع نہ ہو۔ لیکن مجموعی طور پر بعض جگہوں پر جو کچھ رسول اکرمؐ فرماتے تھے، سب شوق اور رغبت کے ساتھ اس پر عمل کرتے تھے کیوں کہ وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ پیغمبرؐ کبھی اپنی بات کو عوام پر تھوپنے کے حق میں نہیں تھے، اور انکی صلاح اور سعادت کے سوا کسی دوسری چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔

دوسری آیت

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ [1] اور آپس کے معاملات میں مشورہ کرتے ہیں۔ یہ آیہ شریفہ مومنین کی ایک خصوصیت بیان کرتی ہے کہ ان لوگوں کے کام اور فیصلے مشورہ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک معنی میں وہ مومنین ہیں جو کوئی بھی کام کرنے سے پہلے مشورہ کرتے

۱۔ سورہ شورا، آیت ۳۸

ہیں۔ دوسرے معنی میں شوریٰ کا لفظ مصدر بیان کیا گیا ہے، اسی بناپر آیت کا معنی و مفہوم کچھ اس طرح ہے: مؤمنین کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے، اگر معنیٰ کا لحاظ کیا جائے تو اس جملے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مؤمنین اہل رشد ہیں اور صحیح اور دقیق رائے حاصل کرنے میں ظرافت سے کام لیتے ہیں، اور اسی لئے صاحبان عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں[۱]۔

دوسرا نکتہ یہ کہ یہ آیہ مبارکہ، جملہ خبریہ کے طور پر بیان ہوئی ہے اور علم اصول میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جملہ خبریہ، انشائیہ اور امر پر زیادہ دلالت کرتا ہے[۲]۔ یہ آیت مشورہ کی اہمیت اور ضرورت کی تصدیق کرتی ہے اور امر مطلق طور پر بیان ہوا ہے۔ اسی بناپر، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام فردی، اجتماعی، سیاسی اور اجرائی امور، مشورے کے ساتھ انجام پائیں، لیکن احکام شریعت اللہ کی جانب سے اعلان ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان میں مشورہ لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تیسری آیت

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ... فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا[۳]۔ ترجمہ: اور مائیں اپنی اولاد کو دو برس کامل دودھ پلائیں گی ...پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔۔

یہ آیہ مبارکہ اولاد کو ماں کا دودھ چھڑانے کے بارے میں ہے۔ قرآن نے یہاں پر بھی مشورہ کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور یہ جملہ حرف فاء کی وجہ سے اس کے حصے کرتا ہے، اور اس حق کی تشریح کرتا ہے جو پہلے بیان ہوا، اور جو نقصان اور حرج ہے اس کو درمیان سے ہٹا دیتا ہے، پس عورت پر حضانت اور دودھ پلانا واجب اور تبدیل ناپذیر نہیں، بلکہ ایسا حق ہے جس کو استعمال یا ترک کر سکتی ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کرنا زوجین کے درمیان مشورت پر موخر ہے۔

۱۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۹۳، ص ۱۸

۲۔ مظفر، ج ۱، ص ۶۴؛ کفایۃ الاصول، ج ۱، ۹۲

۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۳۳

سیرہ پیغمبر اکرمؐ اور احادیث میں مشورت کا مقام

رسول اکرمؐ کی زندگی میں ملتا ہے کہ آپؐ مختلف امور میں اپنے اصحاب و انصار کے ساتھ مشورہ کرتے تھے؛ یہاں پر کچھ مثالوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

۱۔جنگ احد سے پہلے جب قریش اپنی فوج کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی جانب جاتے ہیں تاکہ جنگ بدر کی شکست کا بدلہ لے سکیں، بعض شجاع مسلمان جوانوں کا یہ سوچنا تھا کہ مشرکین سے جنگ کے لئے مدینہ سے باہر جانا چاہئے اور شہر کے باہر ان سے مقابلہ کرکے ان کو شکست دی جائے۔

دوسرے گروہ کا یہ خیال تھا کہ شہر میں ہی رک کر ان کو شکست دیں۔ بالاخر مشورت کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر سے باہر جایا جائے اور احد کی پہاڑیوں پر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ مسلمان ابتدا میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن جیسے ہی بعض محافظ جو پہاڑ کے کٹاو کی حفاظت پر مامور تھے، جنگی غنیمت جمع کرنے کے لئے اپنی جگہ سے ہٹتے ہیں، دشمن اسی جگہ سے ان لوگوں پر دوبارہ حملہ کردیتا ہے، اور مسلمان مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حضرت حمزہؓ شہید اور رسول اکرمؐ زخمی ہو جاتے ہیں؛ لیکن اس جنگ کی وجہ سے بھی مسلمانوں کو بہت سے برکتیں اور عبرتیں ملتی ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ خود مدینہ میں رکنے کے خواہاں تھے، لیکن کبھی بھی ان لوگوں کی جو مدینہ سے باہر جانا چاہتے تھے، جنگ کے نتیجے کی وجہ سے سرزنش نہیں کی۔ یہ مسئلہ بخوبی ثابت کردیتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی سیرت میں مشورہ کس قدر اہمیت کا حامل ہے[1]۔

۲۔ پانچ ہجری میں کفار اور مشرکین ایک بار پھر اپنے اور اپنے ہم پیمان قبائل کے تمام تر امکانات کے ساتھ، مدینہ میں مسلمانوں کی جانب جاتے ہیں جو جنگ احزاب یا خندق کا باعث بنے، اس جنگ میں مختلف مراحل میں اہم مشورے کئے گئے:

یہ سلمان فارسی، رسولؐ کے ایرانی صحابی تھے جو ایرانیوں کی جنگوں کا تجربہ رکھتے تھے اور شہر کے دفاع کے لئے انہوں نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں نے ان کے اس مشورے کو پسند کیا[2]۔

۱۔ تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۴؛ تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۸۹

۲۔ تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۹؛ تاریخ طبری، ج ۳، ص ۲۳۳؛ ابن معاد، ج ۲، ص ۱۷۸؛ ابن کثیر، الکامل فی التاریخ، ص ۱۷۸

جنگ کے دوران بعض عرب قبائل کی رسول اکرمؐ کے ساتھ اس بات پر مفاہمت ہونے والی تھی کہ وہ مشرکین کی مدد نہ کریں اور مسلمانوں کا ساتھ دیں، اس کے بدلے میں، ہر سال مدینہ کی ۱/۳ کھجور کی فصل ان کو دی جائے۔ سعد بن عباد اور سعد بن معاذ نے جو پیغمبرؐ کے ساتھیوں میں سے تھے اور اوس و خزرج کے قبائل کے سردار تھے، عرض کیا کہ ہم شرک اور کفر کے وقت بھی ایسا کام نہیں کرتے تھے۔ اب جب اسلام اور ایمان کی وجہ سے ہمیں عزت ملی ہے تو ایسا کرنا صحیح نہیں۔ پیغمبرؐ نے بھی ان کی اس رائے کا احترام کیا اور یہ معاہدہ انجام نہیں دیا گیا اور مسلمان جنگ خندق (احزاب) میں قابل توجہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں بھی جنگ احد کی مانند اس بارے میں کہ شہر میں رہ کر دفاع کیا جائے یا شہر سے باہر جائیں، مشورہ کیا گیا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہر میں رک کر شہر، مسلمانوں اور در حقیقت تمام اسلام کا دفاع کیا جائے، اور رب العزت نے مدد کی اور مسلمانوں کو ایک اہم کامیابی، خاص کر حضرت علیؑ کے ہاتھوں عمر بن عبدود کی ہلاکت کے بعد، حاصل ہوئی۔ یہ بھی ایک اہم اور موثر مشورہ تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی قسمت پر اثر انداز ہوا۔

پیغمبرؐ سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ حزم کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: صاحبان عقل کے ساتھ مشورہ کرنا اور ان کی پیروی کرنا حزم ہے۔ اس حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے، رسول اکرمؐ کے نزدیک مشورہ کرنے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت علیؑ بھی جو رسول اکرمؐ کے جانشین ہیں، فرماتے ہیں:

من استبد برایه هلك و من شاور الرجال شارکهم فی عقولهم، جو صرف اپنے فیصلے پر عمل کریگا، ہلاک ہو جائے گا، اور جو دوسروں کے ساتھ مشورہ کرے گا، وہ ان کی عقل میں حصہ لیگا[۱]۔ لغت کی کتابوں میں بھی مشورہ کو استبداد کا ضد بتایا گیا ہے۔ ایک شخص کی سوچ ایک خاص حد تک حقائق تک پہنچ سکتی ہے، جب دوسروں کے افکار بھی اس کے ساتھ رکھے جاتے ہیں، تو اس کی عقل مزید مکمل ہو جاتی ہے اور بہتر نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۵۲

تمام اجتماعی، سیاسی، اور حتی کہ فوجی امور میں رسول اکرمؐ جب صلاح جانتے تھے تو اصحاب کے ساتھ مشورہ کرتے تھے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ اسلام کے احکام پر مشورہ نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ تو شارع مقدس کے ذریعہ تمام مسلمانوں حتیٰ رسول اکرمؐ پر تفویض ہوتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اور اصحاب پر مشورت کے آثار

۱۔ اصحاب و انصار کو اہمیت دینا: پیغمبر اکرمؐ مشورت کے ذریعہ اپنے پیروکاروں کو اہمیت دیتے تھے اور ان لوگوں پر جو دوسری حکومتوں میں ٹھکرا دئے گئے تھے، توجہ دیتے تھے۔

۲۔ایک مشورے کے عمل میں رسول اللہؐ کے اصحاب، فکری بلوغ اور عقلی کمال تک پہنچتے تھے، کیوں کہ مناظرہ اور علمی بحث انسان کے فکری بلوغ میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

۳۔ایک معاشرے کو چلانے کے لئے، لائق اور باصلاحیت لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مشورہ کے دوران افراد کی صلاحیت نظر آتی ہے ۔

۴۔ پیغمبر اکرمؐ گرچہ خود معصوم تھے لیکن انہوں نے اپنے اصحاب کو یہ سکھایا کہ مشورے کے ذریعہ اپنے فیصلے میں غلطیوں کو کم کریں۔ طبیعی طور پر ایک انسان جتنا بھی فکری لحاظ سے طاقتور ہو، پھر بھی غلطی کر سکتا ہے، لیکن جتنا بھی ایک انسان دوسروں خاص کر اہل فن کے ساتھ مشورہ کرتا ہے، غلطی کرنے کا احتمال کم سے کم ہو جاتا ہے۔

۵۔ کسی بھی نظام کے ذمہ دار افراد پر نظارت کرنے کے لئے کچھ افراد کی ضرورت ہے تاکہ وہ ذمہ دار افراد عدالت کی حدود سے باہر نہ نکلیں اور اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کریں۔ بہترین نظارت عوام کے ذریعے ہو سکتی ہے جو کہ مشاورتی کونسل کے ذریعے بالواسطہ یا بلاواسطہ نظارت کر سکتے ہیں۔

مشاورتی کونسل کے ضوابط اور معیار:

مشاورتی کونسل کے اپنے مخصوص ضوابط اور قوانین ہوتے ہیں، جو مختلف مراحل میں کام آتے ہیں۔ مرحوم نائینی صرف قانون ساز اسمبلی کی بحث میں، شورا کو بیان کرتے ہیں لیکن کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے تمام اجتماعی اور فردی مراحل میں، سوائے احکام شریعت کے جملہ امور میں مشورہ کرنا چاہئے۔ مشاورتی کونسل کا طریقہ کار، عرفی اور عقلانی بحث ہے، جس کی تفصیلات شرع مقدس میں بیان نہیں ہوئی ہیں، اور عرف اور قانون اس کو بیان کرتے ہیں۔

اسی بنا پر مشورہ لینے کا طریقہ کبھی پارلیمنٹ، مصلحت نظام کی مشاورتی کاؤنسل، شہر اور گاؤں کی مشاورتی کاؤنسل وغیرہ کے ذریعے انجام پاتا ہے اور مشاورتی کونسل کے لئے کسی خاص نمونہ عمل کا معین کرنا ممکن نہیں اور ضروری بھی نہیں، وقت اور مکان کے حساب سے یہ مختلف اشکال میں ڈھل سکتا ہے۔

سید قطب کہتے ہیں: جس طرح مسلمانوں کے لئے نماز کو ترک کرنا جائز نہیں بالکل اسی طرح مشورت کو ترک کرنا بھی جائز نہیں، خاص کر ان کاموں میں جو معاشرے کی عمومی مصلحتوں سے مربوط ہوں[1]۔ سید محمد باقر الصدر بھی اس بات سے متفق ہیں[2]۔

ان سب کے باوجود بعض علمائے اسلام مشورت کو واجب نہیں جانتے اور اس کے نتائج پر عمل کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے، شاید اس کی دلیل یہ ہو کہ قرآن میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ امت سے مشورہ کریں۔ ہم اگر مشاورتی کاؤنسل کے نتائج پر عمل کرنا ضروری سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ جو معصوم ہیں اور علم لدنی رکھتے ہیں ان کو بھی ان نتائج پر عمل کرنا پڑے گا۔ اس مسئلہ کا جواب دینے کے لئے مختلف راستوں پر غور کیا جاسکتا ہے:

۱۔حکومتی سربراہ کیلئے مشاورتی کاؤنسل کے نتائج اور فیصلوں کی پیروی کرنے کی فوقیت اور مستحب ہونا۔

۲۔دوسروں پر واجب ہے کہ مشاورتی کاؤنسل کے نتائج پر عمل کریں، لیکن رسولؐ پر واجب نہیں ہے۔

۳۔کیوں کہ رسولؐ وحی الٰہی کے مبلغ ہیں لہٰذا غلطی نہیں کرسکتے، اور تبلیغ دین اور احکام الٰہی کو بیان کرنے میں، جو کچھ آپؐ سے مربوط ہے اور جانتے ہیں، اس میں مشورت نہیں ہے۔

پیغمبرؐ حکومت اسلامی کے سربراہ بھی ہیں، اور اس منظر سے ایک حاکم اسلامی (جو کہ تاریخ میں بہترین اور پاکترین حکومت کے طور پر ابھری) بھی تھے، اپنے اصحاب کے ساتھ مشورت کو اہمیت دیتے تھے، اور ان کی آراء کو حکومتی فیصلوں میں شامل کرتے، اور اس طرح، حکومتی امور آسان ہوجاتے اور ساتھ ہی اصحاب یہ احساس کرتے کہ ان کو اہمیت دی جارہی ہے، اور وہ حکومتی امور میں شامل ہوئے ہیں۔

۱۔ سید قطب، فی ظلال القرآن، ج ۵، ص ۲۲۹

۲۔ سید محمد باقر الصدر، الاسلام یقود الحیاۃ، ص ۱۵۲

نتیجہ

اسلام اور پیغمبر اکرمؐ مشورت کو بہت اہمیت دیتے تھے اور یہ ان کے حکومتی اہم اصولوں میں سے ایک بنیادی اصل تھا۔ عظیم انبیائے الٰہی، انسانی عقل اور سوچ کی بلوغ اور کمال کے لئے بہت اہتمام کرتے تھے۔ ان کی رہنمائیوں اور عملی اقدامات میں سے ایک اہم رکن، مشورت اور مناظرہ کے کلچر کی ترویج ہے۔ انسان کو ہمیشہ خطا اور غلطی کا سامنا رہتا ہے، اور حکمت یہ مانتی بھی ہے کہ اس کے نقصانات کم ہونے چاہئے تاکہ اس کی زندگی سعادت اور توفیق کے راستے پر گامزن رہے۔

دینی متون اور معصومینؑ کی روایات میں، ہم فکری اور مشورہ کے کلی اصول اور راستے بیان کئے گئے ہیں، لیکن اس کی تفصیلات اور کام کرنے کے طریقے مختلف مواقع پر الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں، اس اہم اصل پر پابند رہنے کی وجہ سے بہت سی کامیابیاں اور کمالات حاصل ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں اہم ترین مثال نظام مقدس جمہوری اسلامی ایران کی تشکیل کو مانا جاسکتا ہے۔ حکومتی امور، نظام کی تشکیل کے وقت امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی کی مشاورتی کاؤنسل کے زیر نظر انجام پائے اور ان کی عمر مبارک کے دوران حکومتی آئین میں جو انتظامات کئے گئے، مشاورتی کاؤنسل (شورا) نے فیصلہ کرنے کی ہر سطح پر، انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔

منابع وماخذ:

- ابن فارس، معجم اللغۃ، مصر، ۱۳۹۰
- فیومی، احمد بن محمد، المصباح المنیر، طبع مصر، ۱۳۱۳
- جوہری، صحاح اللغۃ، طبع ایران، ۱۳۷۹
- خراسانی، محمد کاظم، کفایۃ الاصول، مؤسسہ نشر اسلامی حوزہ علمیہ قم، ۱۳۶۹
- قمی، علی بن ابراہیم، تفسیر قمی، دار الکتاب، قم، ۱۴۰۴ق
- ابن یعقوب، محمد، تاریخ یعقوبی، نشر دانش اسلامی، تہران، ۱۴۰۵
- مظفر، محمد رضا، اصول فقہ، جہان پبلیشرز، تہران
- طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، ج ۳، مؤسسہ الاعلمی، بیروت، ۱۴۰۳-۱۹۸۳
- ابن العما (شہاب الدین ابی الفلاح) شذرات الذہب، دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۰۳- ۱۹۸۶
- ابن کثیر، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، وزارت ارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۶۵

مرسلِ اعظمؐ کی حکومتی روش میں پیغمبرانہ اقدار کی تجلی

مؤلف: محمد علی برزگر

مترجم: مولانا نثار احمد زین پوری

زیر نظر مقالہ کا موضوع و مدعا، رسولؐ کی حکومتی روش میں اقدار کی حاکمیت کے وجود کو ثابت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف عناوین اور موضوعات پر بحث کی گئی ہے مثلاً عدالت، جہاد، ظلم ستیزی، قومی عصبیت کی نفی، باہمی عشق و محبت، اقتدار کی بلندی پر ہوتے ہوئے عفو و بخشش، عقل و خرد کو مد نظر رکھنا، وعدہ کا وفا کرنا، تعلیم و تربیت کو اہمیت دینا، حکومت کو امانت سمجھنا، دشمنوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا وغیرہ۔ یہ تمام خصائل پیغمبر اسلامؐ کی حکومتی روش میں آپؐ کی زمام داری کے عہد میں نمایاں ہوئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اسلامؐ کا سیاسی نظام، انسانی و الٰہی اقدار کی بنیاد پر استوار تھا اور سیاست کے اصول و ضوابط کو ان اقدار کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے رسولؐ کے نظامِ حکومت میں انسانی اقدار کے خلاف موضوعات جیسے دوہرے معیار و دوروئی، جھوٹ، حیلہ گری، نیرنگی و خود نمائی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ یہ الٰہی اہداف و تعلیمات اور انسانی اقدار کے منافی ہیں۔ آنحضرتؐ صوبہ داروں، حکام اور کارندوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان چیزوں پر عمل کریں اور اگر وہ ان اصولوں کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے تو آپؐ ان کی سرزنش کرتے تھے یا انھیں معزول کر دیتے تھے۔

رسولؐ کی بعثت انسانی و بشری معاشرہ کے اخلاق کی تکمیل کے لئے تھی اور اسی وجہ سے رسولؐ کے ذریعہ پیش کیا گیا سیاسی نظام، اقدار اور معیاروں پر استوار تھا اور اس کے ساتھ ہی مختلف سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل بھی اسی معیار پر استوار ہوئے ہیں۔

درحقیقت رسول خداؐ کو اسلامی نظام کے نمونہ کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ وہ ایک سچے

سیاستداں اور خوش اخلاق و نیک کردار انسان تھے اور سیاسی امور میں ہر قسم کے مکر و فریب کے خلاف تھے۔ آپؐ کی معاشرتی سیرت، حُسنِ خلق، نصیحت و خیر خواہی اور انسانی عظمت و کرامت پر استوار تھی۔ انھیں چیزوں کو عملی جامہ پہنا کر آپؐ نے اخلاق و اقدار کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا ہے۔ آپؐ کی سیاسی سیرت بھی، مساوات، برابری، طبقاتی نظام اور نژادپرستی سے جنگ، بڑا بننے کی نفی، ظلم ستیزی اور عہد و پیمان کی پابندی پر استوار تھی۔ آپؐ کے اسی کردار پر تمدّنِ اسلام کی بنیاد پڑی اور اطراف و اکناف میں اس کی نشر و اشاعت ہوئی جس کے نتیجہ میں اس عہد کے بڑے تمدنوں کے لئے مشکلیں کھڑی ہو گئیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون سے اعلیٰ معیار و انسانی اقدار ہیں جن کے ذریعہ پیغمبر عظیم الشان نے عالمی انسانی نظام پر حکومت کی اور کائنات کو اپنی سیرت کا گرویدہ بنالیا۔

لغت میں سیرت کے معنی ہیں: روش، طریقہ، مذہب، خلق و عادت۔ سیر کا معنی ہے چلنا اور سیرت جو فعلۃ کے وزن پر ہے، اس کا مفہوم ہے چلنے کا انداز[۱]۔

لغت میں حکومت کے معنی، فرمانروائی اور حکمرانی کے ہیں، اس طرح فرمان دینے والے اور فرمانبردار کے درمیان ایک مضبوط رابطہ کا وجود ضروری ہے اور سیاست میں حکومت کے معنی، ملک میں فرمانروا کے ہیں۔

رسولؐ کی حکومتی روش میں نمایاں اقدار

عدل گستری

خداوند عالم کے صفات میں سے ایک عدل ہے۔ پیغمبران الٰہی عدل کے حقیقی منادی و علمبردار ہیں جو لوگوں کو عدل کی دعوت دینے کے لئے مبعوث ہوئے تھے تاکہ عدل کی بنیاد پر معاشرہ استوار ہو۔

عدل کی بنیاد پر استوار معاشرہ، اقدار کا حامل ہوتا ہے اور اس لحاظ سے عدل ایسی بنیادی قدر و ارزش ہے جس کے وجود سے دوسرے اقدار کی تجدید ہوتی ہے اور عدل سے بے توجہی اقدار کی ضدوں کے وجود میں آنے کا سبب ہوتی ہے۔

قیام عدل رسول اسلامؐ کی سنت و سیرت ہے۔ آپؐ اسی لئے مبعوث ہوئے تھے تاکہ ظلم و ستم کو

۱۔ مطہری، مرتضیٰ، سیرۂ نبوی، ص ۴۷

مٹا کر اس کی جگہ عدل وانصاف قائم کر سکیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔[۱]

رسول خداؐ کے نقطۂ نظر سے جس معاشرہ میں عدل قائم کرنے کی کوشش نہیں ہوتی ہے، یا جس معاشرہ میں عدل قائم کرنے والوں کو خوف زدہ کیا جاتا ہے، وہ معاشرہ متزلزل رہتا ہے اور اس کی شکست و ریخت میں دیر نہیں لگتی ہے اور جو لوگ عدل پرور افراد کو ستاتے ہیں یا انھیں عدل پروری کے جرم میں کچل دیتے ہیں وہ کافروں کے حکم میں ہیں اور سنّت الٰہیہ کے مطابق نابود ہو جاتے ہیں[۲]۔

عدل گستری کے مختلف پہلو ہیں جن کے متوازن اور ہمہ جہت نفاذ کی صورت میں معاشرہ کی ہر فرد عدل سے مستفید ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف عدالت کی جگہ طبقاتی نظام آجائے گا اور معاشرہ میں ظلم و ستم کا بول بالا ہوگا۔ یہ صورت حال ظالموں اور فرومایہ لوگوں کے لئے خوش آیند اور عدل و فضائل کے طرف داروں کے لئے سخت ناگوار ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ معاشرہ کو نیست و نابود کردے گی۔ ان پہلوؤں میں سے عدالتِ اقتصادی، عدالتِ سیاسی اجتماعی، عدالت طبقاتی، عدالت جغرافیائی، لوگوں کے حقوق میں عدالت، بیت المال کی تقسیم میں عدالت، فیصلوں میں عدالت اور شائستہ انتخاب میں عدالت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم ان میں سے بعض پہلوؤں کی سیرت رسولؐ کی روشنی میں وضاحت کرتے ہیں۔

اقتصادی عدالت

عدل قائم کرنے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ پیداوار کے منابع، عمومی فلاح و بہبود اور اقتصادی ذخیروں کی تقسیم میں عدل سے کام لیا جائے۔ نیز اقتصاد میں اپنا مخصوص حق سمجھنے

۱۔ سورہ حدید، آیت ۲۵

۲۔ مجلسی، بحارالانوار، ص ۱۹۸

والوں، قومی سرمایہ کو لوٹنے والوں اور اقتصادی مفاسد سے مقابلہ اور اقتصاد کے لئے تحفظ فراہم کرنے کو معاشرہ میں عدل قائم کرنے کے اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔

عدل پرور تحریک سے اہل شہر خوش ہوتے ہیں اور عام لوگ حکومت کے مخلص اور زمام داروں کے دوست بن جاتے ہیں۔ رسولؐ نے فقر و فاقہ و تنگدستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے اقتصادی ناانصافی اور بے عدالتی کا نتیجہ قرار دیا ہے:

اِنَّ اللهَ جَعَلَ اَرْزَاقَ الْفُقَرَاء فِي اموالِ الْاَغْنِيَاء فان جاعو و عروا فبذنب الاغنياء وحق على الله ان يكّبهم في نار جهنم[1]-

ترجمہ: بیشک خدا نے تنگدست لوگوں کا رزق غنی لوگوں کے اموال میں قرار دیا ہے پس اگر وہ بھوکے اور برہنہ ہیں تو وہ ان مالداروں کی وجہ سے ننگے بھوکے ہیں۔ (اس صورت میں) خدا کو حق ہے کہ ان اغنیاء کو منھ کے بل جہنم میں گرادے۔

بنابریں ضرورت مندوں کی ناداری و تنگدستی مالداروں کی حرام خوری کی وجہ سے ہے۔ حکومت اور لوگوں کو چاہئے کہ ان سے جنگ کریں تاکہ ضرورت مندوں کا حق انہیں واپس مل جائے۔ اقتصاد کے بارے میں رسول خداؐ کی سیرت کا دوسرا نمونہ، آپؐ کے توسط سے بیت المال کی عادلانہ تقسیم ہے۔ اس سلسلہ میں روایت ہے:

رسول خدا لوگوں کے درمیان بیت المال تقسیم کررہے تھے، ذوالخُوَیصر نامی ایک شخص جو بعد میں خوارج کا رہبر بنا، رسولؐ کے سامنے کھڑا ہوا اور کہنے لگا: انصاف سے کام لیجئے، رسولؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر! تو یہ کہہ رہا ہے، اگر میں عدل نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا؟ اگر میں انصاف سے کام نہیں لوں گا تو تجھ جیسے نقصان اٹھائیں گے[2]۔

سیاسی واجتماعی عدالت

اہل وطن کو رائے دہی کا حق دینا، مختلف قبیلوں اور غیر متحارب اقلیتوں اور مختلف رسم و رواج

۱۔ مستدرک الوسائل، ج ۷، ص ۲۴

۲۔ جعفریان، رسول، سیرہ رسول خدا، ص ۶۰۶

کو قانونی شکل دینا، سیاست سے غلط فائدہ اٹھانے والوں سے جنگ کرنا، اہم ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے شائستہ افراد کا انتخاب وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے معاشرہ میں عدل قائم ہوتا ہے، عدل کے فروغ سے لوگ حقیقی سیاسی نظام کی پشت پناہی کرتے ہیں اور اس طرح حکومت میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور وہ شکست و ریخت سے محفوظ رہتی ہے۔

رسول اکرم کے نقطۂ نظر سے عدل، اچھا ہے اور خیر ہے لیکن معاشرہ کے زمام داروں اور حکام کے لئے زیادہ اچھا ہے۔ " اَلْعَدْلُ حَسَنٌ ولکن فِی الْاُمَرَاءِ احسنُ[۱]۔ " اس سے تین چیزیں ثابت ہوتی ہیں: حکام کسی بھی صورت میں لوگوں پر ظلم نہ کریں، لوگوں سے حق کے علاوہ کوئی بات نہ کہیں اور لوگوں سے کئے ہوئے وعدوں پر عمل کریں۔ رسول خداؐ اپنے صوبہ دار معاذ بن جبل سے فرماتے ہیں:

"اپنے کارندوں کے چال چلن اور کردار کے بارے میں ہوشیار رہو اور انہیں تاکید کرو کہ لوگوں کے حقوق کے سلسلہ میں کسی قسم کی زیادتی و ناانصافی نہ کریں اور اگر بھول چوک سے ایسا ہو جائے تو ان سے معذرت کریں اور ان سے اصرار کریں کہ ان کا عذر قبول کریں اور ظالموں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں"۔

مدینہ میں مہاجرین و انصار اور یہود کے درمیان جو صلح کا پیمان نامہ لکھا گیا اور جسے حکومت کا آئین سمجھا گیا ہے، وہ تمام بنیادی اصول و قوانین میں سب سے زیادہ اچھا اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں صحیح طریقہ سے شہریوں کے حقوق کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس معاہدہ کی دوسری دفعہ میں لکھا ہے:

"مدینہ کے وہ تمام لوگ جنہوں نے صلح نامہ پر دستخط کئے ہیں، ان کے عقائد سے قطع نظر، وہ سب ایک امت ہیں وہ اپنے آداب و رسوم کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔"

اس کی سولہویں دفعہ میں تاکید کی گئی ہے کہ شہر کے تمام غیر مسلمانوں کو اس وقت تک امن و امان اور دیگر حقوق مساوی طور پر ملتے رہیں گے جب تک وہ اس معاہدہ کے پابند رہیں گے اور دشمنوں کا

۱۔ نہج الفصاحہ، حدیث ۲۰۰۶

ساتھ نہیں دیں گے اور ظلم و ستم نہیں کریں گے۔[۱]

طبقاتی عدالت

اسلامی نقطۂ نظر سے عرب کو عجم پر، گورے کو کالے پر، مالدار کو نادار پر اور مالک کو مزدور پر کوئی فوقیت و برتری نہیں ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ جنگ بدر کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے طریقۂ کار کے بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ رسول خداؐ نے حکم دیا کہ سارا مال غنیمت، بیت المال میں جمع کیا جائے۔ مرد میدان یہ سمجھ رہے تھے کہ رسولؐ سارا مال غنیمت انھیں کو دیں گے، کسی ناتواں کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ رسولؐ نے حکم دیا کہ مال کو سب کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے۔ سعد بن ابی وقاص نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ بہادروں کو جو قوم کے نگہبان ہیں، ناتواں لوگوں کے برابر حصہ دیں گے؟ رسولؐ نے فرمایا: کیا تم تن تنہا دشمنوں پر فتحیاب ہو سکتے تھے؟ اور کیا دوسرے لوگوں کا اس فتح میں کوئی کردار نہیں ہے[۲]۔

بہر حال مختلف سماجی طبقات کے درمیان امتیاز کرنے سے لوگوں میں مایوسی اور احساس کمتری پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں لوگ، حکومت اور سیاسی نظام سے منحرف ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت میں حکومت کی عوامی پشت پناہی میں فرق آجاتا ہے اور اس کے سیاسی پائے متزلزل ہو جاتے ہیں۔

فیصلوں میں عدالت

تمام اہل وطن کو مساوی حقوق حاصل ہیں اور عدالت میں کسی کو کسی پر یہاں تک کہ رسولؐ کو بھی برتری وفضیلت حاصل نہیں ہے۔ لوگوں کے عدالتی اور قانونی امور کے فیصلہ کا معیار اسلامی قوانین ہیں اور قاضی کا فریضہ ہے کہ وہ دینی معیار و موازین کے مطابق فیصلہ کرے۔

یہ بھی رسولؐ کی عملی سیرت سے متعلق ہے کہ ایک روز اسامہ بن زید ایک مجرم کی حدّ شرعی (سزا) معاف کرنے کے لئے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسولؐ نے فرمایا: کیا تم خدا کی حدوں میں سے ایک حد کے جاری نہ ہونے کے لئے سفارش کر رہے ہو؟ خدا کی قسم اگر ایسا کام میری بیٹی بھی انجام دیتی

۱۔ حمید اللہ، محمد، نامہ ہا و پیمان ہای سیاسی حضرت محمد واسناد صدر اسلام، ص ۱۰۷ - ۱۰۸

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۳۷۹

(جو کہ ناممکن ہے) تو بھی میں معاف نہ کرتا اور وہی سزا دیتا جو اس مجرم کو دینا چاہتا ہوں۔ آپؐ اپنے اہل بیتؑ کو جنگوں میں سب سے آگے رکھتے تھے[1]۔

جغرافیائی عدالت

ایک سرزمین پر بسنے والے لوگ ایک جغرافیائی امتیاز کے مالک ہوتے ہیں۔ کوئی بھی علاقہ اپنی قوم، مناسب آب و ہوا اور قدرتی ذخیروں سے مالامال کانوں (معادن) یا فوجی اہمیت کے حامل مقام پر آباد ہونے کی وجہ سے دوسرے علاقوں پر برتری نہیں رکھتا ہے۔ جغرافیائی عدل پر مبنی فیصلہ یہ ہے کہ لوگ ان خداداد نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ رسولؐ کی سیرت بھی یہی تھی کہ آپؐ اسلامی حکومت کے تمام علاقوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔

عدل کے بارے میں اسلام کے عظیم الشان رسولؐ کے بلند نقطۂ نظر کے پیش نظر، عدل رسالت الٰہی کی بنیاد ہے، اس کے بغیر نبوت بھی ابتر اور بے ثمر ہے۔ خدا نے انبیاء کو اس لئے مبعوث کیا تاکہ معاشرہ میں عدل قائم ہو۔ رسول خداؐ کی سیرت میں ایسے بہت سے مواقع نظر آتے ہیں، جو ابتداء میں بیان ہوچکے ہیں۔ اس بناپر عدل پر مبنی نظریہ، سیاسی، اجتماعی و سماجی، اقتصادی و ثقافتی میدانوں میں معاشرہ کو امن وامان کی طرف لے جاتا ہے اور ہدایت کو وسعت دیتا ہے اور عدل کی فضا میں لوگ ملک کے ذمہ داروں پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی لوگوں کی حمایت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح ملک اور سیاسی نظام ہر قسم کے اندرونی و بیرونی خطروں سے محفوظ رہتا ہے اور اپنی عمرانی اور ارتقائی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

جہاد اور ظلم ستیزی

ظالم اور ستم پیشہ لوگ عام انسانوں کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کو عام طور پر حق طلبی، انسانی اقدار و فضائل کی ہمہ گیری اور عوام و معاشرہ کی بھلائی واچھائی کی راہ میں مانع سمجھا جاتا ہے۔ یہ

۱۔ طباطبائی، محمد حسین، سنن النبی، ص ۸۶

اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی بھی ظلم سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ مکاری و خیانت کاری سے کام لیتے ہیں، بے دریغ لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور لوگوں کا مال لوٹ لیتے ہیں۔۔۔ معاشرہ میں موجود ساری بدبختی و نادانی اور مشکلات و مسائل انہیں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔

انبیاء اسی لئے مبعوث ہوئے ہیں تاکہ انسانی معاشرہ کو اس ظالم گروہ کی نجاست سے پاک کریں اور مظلوموں کو ستمگاروں کے چنگل سے نجات دلائیں۔ چنانچہ وہ اس کام کی انجام دہی کے لئے مظلوموں کے ساتھ رہے تاکہ شہ زوروں اور ظالموں کا خاتمہ کرسکیں اور معاشرہ کی اصلاح کا طریقہ ایجاد کریں اور عدل گستری و دادگری کے لئے زمین ہموار کرکے انسانی عظمت و حیثیت کے تحفظ کو یقینی بنائیں۔

رسولؐ نے ظالموں اور ستمگروں سے جنگ و جہاد کو اپنی الٰہی رسالت کا جز قرار دیا اور پورے اعتماد و سنجیدگی کے ساتھ ان سے مقابلہ کے لئے اٹھے تاکہ معاشرہ میں موجود اس طبقہ بندی کو ختم کریں جو عام طور پر زرپرستوں اور ظالموں کے سبب وجود میں آتی ہے اور کمزوروں پر جبراً لاد دی جاتی ہے۔

رسولؐ مقبول کی سیرت کا ہی عطیہ ہے کہ اسلام ظلم ستیز ہے، اسلام ظلم مخالف ہے اور وہ اپنے کارندوں کو اسی بات کی تاکید کرتا ہے۔ جب رسولؐ نے عمرو بن حزام کو اپنے کارگزار و سفیر کی حیثیت سے یمن روانہ کیا تو اس وقت انھیں کچھ بنیادی اصول تعلیم کئے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

"حق پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کا ساتھ دو اور ظالموں کے ظلم کی بنا پر
ان پر سختی کرو کیونکہ خدا ظلم کو پسند نہیں کرتا ہے اور اس سے منع کرتا ہے۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"ظالموں پر خدا کی لعنت، دیکھو! لوگوں کو تم جنت اور جنت کی طرف لے
جانے والے اعمال کی طرف راغب کرنا اور جہنم اور ایسے اعمال سے ڈرانا جو جہنم لے
جانے کا سبب ہوتے ہیں۔"[۱]

رسول اکرمؐ کی دوسری اہم سیرت ظلم و شرک اور کفر و نفاق سے جنگ ہے۔ جو لوگ اپنے فائدے کے لئے کسی بھی ظلم سے دریغ نہیں کرتے ہیں، جب ان لوگوں پر رسولؐ کے ارشادات اور نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو جنگ کی آیتیں نازل ہوئیں اور رسولؐ نے اس حیات بخش امر کے لئے اقدام کیا۔ اس

۱۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۲۸

طرح دنیا کے مسلمانوں کے پیشوا نے اپنی حیات شریف کے دوران اکثر ظالموں اور ستمگروں سے جنگ و جدال کیا اور اس سلسلہ میں ہر گز کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کبھی ظلم سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ آپؐ کے جانشینوں نے بھی اس سیرت پر عمل کیا ہے۔ ان حضرات کی شہادت اس کا واضح ثبوت ہے۔

ثروت مندوں اور فریب کاروں سے رسولؐ کے جہاد کے بارے میں امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

”رسولؐ کی تحریک کے آغاز ہی سے آپؐ کے ساتھ نادار اور مستضعف لوگوں نے قیام کیا، انہوں نے ہی شہ زوروں، فریب کاروں، زمین داروں، تمکنت والوں اور پارٹی رکھنے والوں کا مقابلہ کیا۔ اس زمانہ میں یہی چیزیں طاغوت کا مظہر تھیں۔۔۔ رسولؐ کی سیرت یہ تھی کہ آپؐ ابتداء ہی سے ان لوگوں سے جنگ کر رہے تھے جو دوسروں کی محنت و کمائی کو ہڑپنا چاہتے تھے۔ جو لوگوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ آپؐ نے ایسے ہی امور کے لئے قیام کیا۔[۱]

ظالموں اور ستمگروں سے جنگ کرنا رسولؐ کی سرشت میں شامل تھا۔ آپؐ کا یہ طریقہ کار آپ کی حکومت کی حدود میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ اس کی سرحدوں سے باہر بھی آپ اسی اصول پر کاربند تھے۔ آپؐ کی تقریروں اور خطبوں میں ظالموں اور ستمگروں سے جنگ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ آپؐ نے دیگر ممالک کے سربراہوں کو خط لکھے تاکہ وہ عدل وانصاف سے کام لیں۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ظلم ستیز رسول اسلامؐ اپنی تمام زحمتوں اور سعی پیہم کے نتیجہ میں اپنے مقاصد کو حاصل کرلیں گے اور نسل انسانی کو انمول ہدیہ عطا کریں گے۔ اس قیمتی نظریہ کی روشنی میں آزاد و سرفراز اشخاص ظالموں سے جنگ کے لئے اٹھے ہیں اور ان پر عرصۂ حیات کو تنگ کیا ہے تاکہ وہ عزت و بزرگی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

تعصب اور نسل پرستی سے جنگ

بڑا بن بیٹھنے کی علامتوں میں سے ایک تفوق و برتری طلبی، نژادپرستی، دوسروں کو خاطر میں نہ لانا اور ان کو حقیر و ناچیز سمجھنا ہے۔ انسانوں اور قبیلوں کا یہ گروہ عام طور پر خود کو برتر و مستحق تر تصور کرتا

۱۔ صحیفہ نور، ج ۵، ص ۵۷

ہے اور یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ان کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہیں اور ان کا احترام کریں۔ خدا نے اپنے پیغمبروں کو اس لئے بھیجا کہ ان کی راہنمائی کریں اور ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں، اگر وہ اصلاح قبول نہیں کرتے ہیں تو اخلاقی برائیوں میں ملوث اور انسانی اقدار کے خلاف لوگوں سے جنگ کریں۔ رسولؐ نے بھی اپنی رسالت کے زمانہ میں ایسے مغرور و متکبر قبیلوں اور انسانوں سے مقابلہ کیا ہے اور انھیں معاشرہ اور لوگوں کے درمیان سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ رسولؐ کی سیرت میں برتری طلبی اور نژاد پرستی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

آپ حجۃالوداع کے موقع پر فرماتے ہیں:

اَیُّھا النَّاسُ! اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ واحد کُلُّکُمْ لِاٰدَم وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ، لَا فَضْلَ لعربی علیٰ عجمی اِلَّا بالتَّقوىٰ۔

اے لوگو! تم سب کا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی اپنی نسل پر، اپنی قوم پر یا ایسی ہی کسی دوسری چیز پر فخر کرے۔ ہم سب خاک سے پیدا ہوئے ہیں اور خاک کوئی فخر نہیں ہے۔ ہم کو معنوی و روحانی فضائل اور تقویٰ پر فخر کرنا چاہئے۔ فضیلتوں کا معیار تقویٰ ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔[۱]

رسول اکرمؐ جن کو خدا نے جملہ انسانوں اور تمام عالمین کے لئے باعث افتخار قرار دیا ہے، اس طرح فرماتے ہیں:

”میں روز قیامت اولادِ آدم کا سردار ہوں لیکن یہ کوئی فخر نہیں ہے، لوائے حمد (پرچم ستائش) میرے ہاتھ میں ہے لیکن کوئی فخر نہیں ہے اور آدم سے لے کر دوسرے انبیاء تک سب میرے پرچم کے نیچے ہوں گے اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی، لیکن کوئی فخر نہیں ہے۔“[۲]

رسول اسلامؐ سپہ سالاروں اور فوجیوں کے درمیان مال غنیمت تقسیم کرنے میں مساوات کو ملحوظ

۱۔ سیرۂ نبوی، ص ۲۷۹

۲۔ الہندی، کنزالعمال، ج ۱۱، ص ۴۳۴

رکھتے تھے۔ جنگ بدر میں فوج اسلام کو بہت زیادہ مال غنیمت ملا تھا۔ رسولؐ نے حکم دیا کہ غنیمت کو ان کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے۔ بعض سپہ سالاروں جیسے سعد بن ابی وقاص نے اس طریقہ تقسیم پر اعتراض کیااور کہا: یَا رسولَ الله تعطی فَارِسَ الْقَومِ الّذی حمیهم مِثْلَ مَا تعطی الضعیف۔ اے اللہ کے رسولؐ! کیا دلیر و بہادر اور کمزور و ناتواں آپؐ کے نزدیک برابر ہیں، آپؐ سب کو برابر حصہ دے رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے سعد کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: ثَکِلَتكَ اُمُّكَ وَهَل تَنصُرون الا بِضُعَفائِكم؟ تمہاری ماں تمہارے غم میں بیٹھے کیا تم ان کمزوروں کی مدد کے بغیر کامیاب ہوئے ہو؟[1]

ان کا خیال تھا کہ رسولؐ سپہ سالاروں اور قوم کے بزرگوں کو زیادہ دیں گے۔ لیکن آپؐ نے حکم دیا کہ ان کے درمیان مساوی طور پر مال غنیمت تقسیم کیا جائے۔ سعد اور ان کے ہم خیال لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ لشکر اسلام کو ان کے سبب کامیابی ملی ہے، خدا کی عنایات کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں تھی، فضیلت پسندی و برتری کا جذبہ تھا اسی لئے رسولؐ نے سخت لہجہ اختیار کیا۔ پس رسول خداؐ کی نظر میں حاکم و محکوم، سوار و پیادہ اور قوی و کمزور ، یہاں تک کہ مال غنیمت کی تقسیم میں بھی،برابر ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آپؐ نے یمن میں اپنے حکومتی کارندے کو ایک حکم کے ذیل میں لکھا:

> ”لوگوں میں گھل مل جاؤ تاکہ انہیں دینی تعلیم دے سکو اور اگر ان کے درمیان خاندان و قبیلہ پرستی اور عصبیت پائی جاتی ہے تو انھیں اس حرکت سے منع کرو، ان کا رجحان و میلان اور دعوت و پیغام اس خدا کی طرف ہونا چاہئے جس کا کوئی شریک نہیں ہے“۔[2]

پس رسول اکرمؐ ہر قسم کی فضیلت طلبی اور نسل پرستی سے بیزار تھے اور آپؐ کا کردار مسلمانوں کے لئے بہترین درس تھا کہ کیسے زندگی گزاریں اور اپنے امور کو کیسے منظم کریں۔ انس بن مالک کہتے ہیں:

۱۔ حکیمی، محمد رضا، محمود، علی، الحیاۃ،ج۶، ص ۳۳۰

۲۔ طبری

مسلمانوں کی نظر میں کوئی بھی رسولؐ سے زیادہ محبوب نہیں تھا لیکن آپؐ کو دیکھ کر کوئی بھی کھڑا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مسلمان جانتے تھے کہ آپؐ اس عمل کو پسند نہیں کرتے ہیں۔[۱]

عام لوگوں سے مہر و محبت

اسلام کے جلد پھیلنے کے اسباب و عوامل میں سے ایک آپؐ کا خلق و خو اور قیادت و نظم و نسق کا طریقہ بھی تھا۔ آپؐ کی رحلت کے بعد بھی، آپؐ کی سیرت جو بعد میں تاریخ میں نقل ہوئی ہے، اسلام کی ترقی کا بڑا سبب تھی[۲]۔ اس چیز کی طرف درج ذیل آیت اشارہ کر رہی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُم وَلَو كُنْتُ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانفَضّوا مِن حَولِكَ۔[۳]

آپؐ رسالت کے بلند و بالا منصب پر فائز تھے اور لوگوں کے سردار و سربراہ تھے لیکن سماج میں آپ کی بود و باش ایسی بے داغ اور سادہ تھی کہ اگر آپ لوگوں کے درمیان یا کسی محفل میں تشریف لے جاتے تھے تو ہر شخص آپؐ کو عقیدت بھری نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آپؐ لوگوں کے ساتھ سختی اور بد خلقی سے پیش نہیں آتے تھے۔ خصوصاً حکومت کے عہدہ داروں اور حکام کا جو عام لوگوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا تھا اس کے بارے میں آپؐ بہت حساس تھے۔ عوام کے حقوق کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہ چیز آپؐ کے فرامین میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یمن میں اپنے نمائندہ کو ایک فرمان میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

> "تمہیں میری نصیحت ہے کہ نرم لہجہ میں گفتگو کرنا، سلام کرنے میں سبقت کرنا، ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھنا، یتیم پر مہربانی کرنا، غصہ برداشت کرنا، لوگوں کے ساتھ خاکساری سے پیش آنا۔ دیکھو! کسی مسلمان کو غلط و نازیبا بات نہ کہنا، کسی خطاکار کی پیروی مت کرنا۔ اے معاذ! اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں روز قیامت تم سے ملاقات نہیں کروں گا۔ میں اپنی نصیحتوں کا سلسلہ ختم کرتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ اس کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہوگی۔ اے معاذ! جان لو کہ تم میں سے وہ شخص مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے جو مجھ سے اسی حال میں ملاقات کرے

۱۔ بحار الانوار، ج۷۵، ص۲۳۹

۲۔ سیرۂ نبوی، ص۲۳۵

۳۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹

جس میں اس وقت جدا ہو رہا ہے۔" [۱]

اسی خط میں جس کو طبری نے نقل کیا ہے، لکھا ہے:

"تمہارے لئے ضروری ہے کہ عفو و در گزر سے کام لو لیکن کوئی حق ضائع نہ کرنا کہ کوئی نادان کہے کہ تم نے خدا کا حق پامال کر دیا۔ اپنے نمائندوں کے کردار اور ان کے چال چلن پر نظر رکھنا، اگر ان کی طرف سے کسی موقعہ پر تمہاری تنقید ہو تو لوگوں سے معذرت کر لینا تاکہ وہ تمہاری معذرت قبول کر لیں۔" [۲]

غیر مسلمانوں پر بھی آپؐ کی عنایتیں تھیں۔ آپ اپنے نمائندوں، صوبہ داروں اور حکومت کے ذمہ داروں کو انسانی ہمدردی سے متعلق فرماتے ہیں:

"جو یہودی یا نصرانی اپنی خوشی و خلوص سے اسلام قبول کرتا ہے اسے مومن سمجھا جائے اور جو فائدے مسلمانوں کے لئے ہیں وہی اس کے لئے بھی ہیں اور جو یہودی یا نصرانی اپنے دین پر باقی رہنا چاہتا ہے اس کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔ لیکن ہر غیر مسلم بالغ پر خواہ وہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام ایک دینار یا اس کے بجائے لباس یا کوئی دوسرا کپڑا دینا ضروری ہے جو یہ مبلغ دے گا وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی پناہ میں ہے اور جو یہ مبلغ ادا نہیں کرے گا وہ خدا، اس کے رسولؐ اور تمام مسلمانوں کا دشمن ہے۔" [۳]

اس زمانہ میں اقوام و قبائل اپنی قومی و نسلی برتری کے بارے میں سوچ رہے تھے اور سماجی جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے لیکن آپؐ کی کوششوں سے مسالمت آمیز اور صلح پسند زندگی گزارنے لگے۔ آپؐ کی ایسی پر ثمر کوششوں میں سے ایک، عقد مواخات بھی ہے جس میں آپؐ نے مسلمانوں کو ایک

۱۔ کنزالعمال، ج ۱۱، ص ۴۳۴

۲۔ ایضاً

۳۔ تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۲۹

دوسرے کا بھائی بنادیا تھابلکہ غیر مسلموں کے درمیان بھی رشتہ برادری استوار کردیا تھا۔ قرآن مجید نے بھی اس کی تاکید کی ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فاصلِحُوا بَیْنَ اَخویکُم۔[۱]

رسولؐ نے مہاجرین وانصار کے درمیان دو بار معاہدہ اخوت اور رشتۂ برادری قائم کیا۔ ایک بار ہجرت سے قبل مہاجرین کے درمیان جب کہ ان کے درمیان عداوت تھی اور دوبارہ مدینہ پہنچنے کے بعد ایک مہاجر اور ایک انصار کو بھائی بھائی بنایا۔ اس طرح آپؐ باہمی زندگی بسر کرنے کے اصول بنانے والے اور اجتماعی وسماجی روابط کو منظّم کرنے والے سمجھے جاتے ہیں۔

رحمت وبخشش

محبت ومہربانی اور بخشش وکرم بھی رسولؐ کی سیرت تھی۔ آپؐ اپنے بلند اخلاق سے لوگوں کے ساتھ نہایت ہی خاکساری سے پیش آتے تھے۔ دوسروں کی خطا اور ان کے غلط رویہ سے چشم پوشی کرتے تھے۔ اپنے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے مگر یہ کہ خدا کی حدوں میں سے کوئی حد جاری کرنا مقصود ہوتا۔ فتح مکہ کے روز آپؐ کی پیروی کرنے والوں میں سے سعد بن عبادہ نے یہ رجز پڑھا: الیوم یوم الملحمه الیوم تستحل الحرمة،آج انتقام کا دن ہے، آج حرمتوں کی پامالی کا دن ہے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ آپؑ یہ اعلان کریں: الیوم یوم المرحمة، آج رحم ومہربانی کا دن ہے، انتقام کا نہیں۔ حالانکہ آپؐ مکہ میں سب کو قتل کرسکتے تھے۔

جس وقت اسلام کے دس ہزار کے لشکر نے مکہ فتح کیا، اس وقت رسول اسلامی حکومت اور اقتدار کی مسند پر فائز تھے۔ آپؐ فرشتہ صفت اور نورانی چہرہ کے ساتھ کعبہ کے پاس کھڑے ہوئے اور جذبہ انتقام کی آگ میں جلنے والوں، ابوسفیان، عکرمہ بن ابوجہل اور باطل کے لشکر کو مخاطب کرکے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ آج میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انہوں نے کہا: ہمیں آپؐ سے نیکی ہی کی توقع ہے۔ آپؐ ہمارے کرم فرما بھائی اور نیک وشریف بھتیجے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ[۲]، جاؤ، تم آزاد ہو۔ اس طرح آپؐ نے ان کی خطاؤں کو معاف کردیا اور انہیں آزادی کا مژدہ سنادیا حالانکہ یہ

۱۔ سورہ حجرات، آیت ۱۰

۲۔ بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۳۱۵

وہی لوگ تھے جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے اصحاب کو اذیت دی تھی، وہی لوگ آج آپؐ کی محبت و بخشش سے مالامال تھے۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسولؐ نے یہ طے کیا کہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ حج و طواف کے لئے مکہ جائیں گے۔ صلح پسند رسول اسلامؐ نے مکہ والوں کو یہ باور کرانے کے لئے کہ ہمارا یہ سفر صلح و سلامتی کے ساتھ ہے، ستر اونٹوں کے گلے میں قربانی کی نشانی ڈال کر قافلہ کے آگے قرار دیا۔

اہل مکہ کو رسولؐ کے قافلہ کی روانگی کی خبر ہو گئی۔ وہ آپؐ کا راستہ روکنے اور آپؐ سے جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ آپ مدینہ واپس چلے جائیں۔ رسولؐ نے ان سے صلح کی اور ان کی پیشکش کو اس شرط پر قبول کرلیا کہ آپؐ آئندہ سال مکہ آئیں گے۔ پھر رسولؐ نے حکم دیا کہ ان اونٹوں کو اسی جگہ قربان کردو اور واپس چلو۔ حالانکہ آپؐ طاقت کے بل پر مکہ میں داخل ہو سکتے تھے لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔[1]

جنگ احد میں آپ کے معاون و مددگار حضرت حمزہ کو مشرکین نے قتل کردیا اور انہیں مثلہ کردیا۔ ہند (ابوسفیان کی بیوی) نے بغض و عداوت کی بنا پر ان کا سینہ چاک کرکے کلیجہ نکالا اور اسے چبایا۔ آپؐ جناب حمزہ کے بدن کے اس دلخراش منظر اور مشرکین کی اس درندگی پر سخت برہم تھے اور ان سے سخت انتقام لینا چاہتے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی: وإِنْ عَاقَبْتمْ فعاقِبوا بِمِثلِ مَا عوقِبتمْ به[2]۔ ترجمہ: جس قدر آپ پر ظلم ہوا ہے، اسی تناسب سے انتقام لیجئے۔ اس وحی کے بعد رسولؐ نے قریش کو معاف کردیا اور کسی کو مثلہ نہیں کیا۔

صلح حدیبیہ کے موقعہ پر قبیلۂ خزاعہ نے رسولؐ سے معاہدہ کیا اور قبیلہ بنوبکر نے قریش سے معاہدہ کیا۔ بنوبکر اور قریش نے قبیلہ خزاعہ پر بزدلانہ حملہ کیا۔ سنہ ۸ ہجری میں رسولؐ اس ظلم کی سزا دینے اور دفاع کے لئے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریش اور اس کے حلیف اس واقعہ کی

۱۔ رضوانی، علی اصغر، صلح طلبی، ص ۳۶

۲۔ سورہ نحل، آیت ۱۲۶

خبر سن کر دہل گئے اور آنحضرتؐ کے مقابلہ میں خود کو کمزور محسوس کیا۔انہوں نے جنگ کا ارادہ ترک کرکے پسپائی اختیار کر لی لیکن رسولؐ نے ان کی بد عملی کے باوجود ان سے انتقام نہیں لیا بلکہ مکہ میں داخل ہونے کے بعد ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کیا۔[1]

جنگ خیبر میں رسولؐ کا سخت ترین دشمن قبیلۂ بنی نضیر تھا جو آپؐ کو نقصان پہنچانا اور قتل کرنا چاہتا تھا اور جنگ خندق میں انہوں نے کافروں اور مشرکوں کی مدد کی تھی۔ اسلام کے خلاف آگ بھڑکانے میں کبھی خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ رسولؐ نے ان سے جنگ کرنے کا قصد کیا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں آپؐ نے بہت سے قلعے فتح کئے۔ دو قلعے اس لئے فتح نہیں ہوئے تھے کہ ان کے باشندوں نے رسولؐ سے یہ کہہ کر کہ ہم عنقریب قلعہ چھوڑ کر چلے جائیں گے، پناہ حاصل کر لی تھی۔[2]

مشاورت

مختلف مسائل میں دوسروں سے مشورہ اور رائے طلبی، ، منصوبہ سازوں کی اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے لہٰذا ماہرین سے مشورہ اور رائے طلب کرنا منصوبہ سازی کو آسان اور منصوبہ سازوں کی صحیح و منطقی منصوبہ سازی میں مدد دیتا ہے۔آیۂ وَامرُهُم شُورىٰ بَينَهُم ،اسی موضوع کی طرف اشارہ ہے۔ رسولؐ بھی اس آیت اور دوسری آیات کے پیش نظر، سماجی و اجتماعی امور میں قوم کے بزرگوں سے مشورہ کرتے تھے۔ اس سے آپ کا مقصد دوسروں کو اہمیت دینا اور ذمہ داروں اور عہدہ داروں کو عملی تعلیم دینا تھا تاکہ جس کام کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں وہ خود رائی سے کام نہ لیں اور دوسروں کے نظریات سے بھی استفادہ کریں تاکہ امور کو حل کرنے میں ان کی صحیح راہنمائی ہو سکے اور ان کاموں کو انجام دیا جا سکے جن میں لوگوں کی بھلائی اور فائدہ ہو۔

اس حقیقت کے باوجود کہ رسولؐ معصوم تھے اور آپؐ کو مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہ اپنے اصحاب و انصار سے مشورہ کرتے تھے۔ جنگ خندق میں کافر فوجیں اسلام کو نابود اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے متحد ہو گئی تھیں۔ ان سے مقابلہ کے سلسلہ میں رسولؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا چنانچہ اس سلسلہ

۱۔ بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۱۰۴

۲۔ ایضاً، ص ۳

میں بہت سے نظریات سامنے آئے۔ دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے جناب سلمان فارسی نے بھی خندق کھودنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورہ کو سب نے قبول کیا۔ رسولؐ نے بھی اس تجویز کو قبول کیا اور اس کے مطابق عمل کیا گیا۔[۱]

رسولؐ اکرم نے دیگر مواقع پر بھی مشورہ قبول کیا ہے۔ جنگ احد کے موقعہ پر مکہ سے قریش کا ایک ہزار کا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ رسولؐ نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور اس سلسلہ میں مشورہ کیا کہ دشمن سے مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے یا شہر کے باہر نکل کر اس سے جنگ کی جائے۔ مشورہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ شہر کے باہر دشمن سے جنگ کی جائے۔[۲]

جنگ بدر کے موقعہ پر بھی آپؐ نے اپنے قریبی اور صاحبان نظر سے مشورہ کیا۔ دو ہجری میں رسولؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک قافلہ تجارت کے اموال کے ساتھ شام کی طرف جارہا ہے۔ لشکر اسلام نے کارواں کا تعاقب کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا، قافلہ شام پہنچ گیا۔ ماہ رمضان میں رسولؐ مکہ میں مسلمانوں کے غصب کئے گئے اموال کے عوض قریش کے اموال کو ضبط کرنے کے لئے تین سو تیرہ مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ قریش کا قافلہ نہایت ہی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ انھیں معلوم ہوا کہ مدینہ کی فوج ان کی گھات میں ہے لہٰذا انہوں نے کسی کو مکہ بھیج کر مدد مانگی اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے قافلہ نے اپنا راستہ بھی بدل دیا اور دریائے سرخ کے کنارے سے مکہ کی طرف چلا۔ مکہ سے امدادی ساز و سامان کے ساتھ ایک فوج قافلہ کی مدد کے لئے روانہ ہوئی۔ مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تجارتی قافلہ کا تعاقب کریں یا قریش کی فوج سے مقابلہ کریں یا مدینہ واپس لوٹ جائیں۔ رسولؐ نے صورت حال اصحاب کے سامنے پیش کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ آپؐ نے اصحاب کی رائے معلوم کرنے کے بعد ضروری حکم صادر فرمایا۔ نتیجہ میں مسلمان کامیاب ہوئے۔ رسولؐ نے پھر دشمن کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا۔[۳]

۱۔ ابن شہر آشوب، ج ۲، ص ۱۸۱
۲۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ص ۱۵۰
۳۔ ایضاً، ص ۱۲۰

رسولؐ کی سیرت میں مشورہ کا موضوع فوجی یا سماجی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ آپؐ نے مختلف موقعوں پر اصحاب سے مشورہ کیا ہے، کسی ایک علاقہ یا متعدد علاقوں کی صوبہ داری کے لئے نمائندوں کے انتخاب کے لئے اپنے قریبی افراد اور صاحبان نظر سے رائے طلب کی اور پھر مد نظر علاقہ میں ان کا تقرر کیا۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ رسول اسلامؐ عقلِ کُلُ تھے اور وحی کے ذریعہ خدا کے لایزال علم و قدرت سے آپؐ کا رابطہ رہا کرتا تھا۔ اس بنا پر آپؐ علم و عقل کے اعتبار سے جزوی امور میں دوسروں کے مشورہ کے محتاج نہیں تھے بلکہ آپؐ عام لوگوں کی تعلیم کے لئے ایسا کرتے تھے۔ آپؐ کی اس سیرت میں اسلامی معاشرہ کے ذمہ داروں کے لئے بڑا درس ہے۔ آپؐ اپنے اس عمل سے ان کی راہنمائی کرتے تھے اور تمام ذمہ داروں کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ دوسروں کو اہمیت دی جائے، ان کی شخصیت کو ابھارا جائے اور ان کی ترقی کے لئے زمین ہموار کی جائے تاکہ شائستہ اور باصلاحیت اشخاص کے لئے کام کے مواقع فراہم ہو سکیں۔

وفاءِ عہد و پیمان

اپنے عہد و پیمان پر قائم رہنے سے لوگ حکومت کے نمائندوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ بے شک اس اعتماد سے حکومت کی بنیاد مستحکم و مضبوط ہوتی ہے اور حکومت کرنے میں حاکم و زمام دار کو مدد ملتی ہے۔ اس موضوع پر بہت سی آیتوں میں تاکید ہوئی ہے۔ رسول اسلامؐ نے بھی الٰہی احکام و تعلیمات اور دستورات کی روشنی میں، امانتداری اور عہد کی پابندی پر خاص توجہ فرمائی ہے۔ اس لحاظ سے آپؐ اپنے عہد کے سب سے بڑے امین تھے اسی وجہ سے آپؐ کو امین کا لقب دیا گیا تھا۔ آپ خود بھی فرماتے تھے: جان لو خدا کی قسم، میں زمین وآسمان میں امین ہوں۔

سیرت رسولؐ میں عہد و پیمان کی پابندی کے بارے میں قاضی عیاض نے ابوالحسماء سے اس طرح نقل کیا ہے:

> "بعثت سے پہلے، میں نے رسولؐ سے لین دین کیا، اس معاملہ کا کچھ پیسہ میری طرف باقی رہ گیا تھا۔ میں نے آنحضرتؐ سے ایک جگہ ملنے کا وعدہ کیا، لیکن میں بھول گیا۔ تین روز بعد مجھے یاد آیا کہ مجھے فلاں جگہ جانا تھا، میں فوراً وہاں گیا تو دیکھا کہ آنحضرتؐ میرے منتظر ہیں۔ مجھے دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: اے جوان! تم نے مجھے

مشقت میں ڈال دیا، میں تین روز سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اسی طرح امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ نے ایک شخص سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے واپس آنے تک فلاں پتھر کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ وہاں آفتاب کی حرارت سے آپ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اصحاب نے عرض کی اگر آپؐ سایہ میں چلے جائیں تو کیا حرج ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وعدہ گاہ یہی ہے، میں یہیں رہوں گا اگر وہ نہیں آئے گا تو وعدہ خلافی اس کی طرف سے ہوگی، میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔[1]

اس سلسلہ میں عمار یاسر سے اس طرح منقول ہے:

"رسولؐ مبعوث بہ رسالت ہونے سے پہلے اہل مکہ کی بھیڑیں چرانے کے لئے انھیں پہاڑ کے دامن میں لے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں، میں بھی جوان تھا، میں نے آنحضرتؐ سے وعدہ کیا کہ کل ہم ایک ساتھ بھیڑوں کو ان دو پہاڑوں کے درمیان لے جائیں گے وہاں اچھی گھاس ہے۔ اس روز مجھے دیر ہو گئی میں نے دیکھا کہ رسولؐ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان اپنے گلہ کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن بھیڑوں کو چرانے سے روکے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا: بھیڑوں کو چرانے سے کیوں روکے ہوئے ہیں؟ فرمایا: میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ایک ساتھ بھیڑوں کو چرانے کے لئے چراگاہ لے جائیں گے۔ لہٰذا مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ میں اپنی بھیڑوں کو تم سے پہلے چراگاہ لے جاؤں۔"[2]

رسولؐ صرف اپنے اصحاب اور دوستوں کے عہد ہی کو پورا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی ایسے ہی کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے مطابق مسلمان صلح نامہ لکھے جانے کے ایک سال بعد مکہ جا سکتے تھے اور وہاں تین روز تک عمرہ کے اعمال انجام دے سکتے تھے اور اس کے بعد مکہ چھوڑ سکتے تھے۔ رسولؐ

۱۔ طباطبائی، محمد حسین، سنن النبی، ص ۱۶۵

۲۔ بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۹۶

۶ ہجری کے عمرہ کی قضا کرنے کے لئے صلح حدیبیہ میں موجود اصحاب کے ساتھ ۷ ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اہل مکہ نے مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر مکہ خالی کر دیا۔ رسولؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے اور تین روز تک مکہ میں قیام پذیر رہے۔ چوتھا دن آیا تو قریش کے نمائندے آئے اور کہنے لگے طرفین کے درمیان تین روز مقرر ہوئے تھے۔ تین روز بعد ان کی سرزمین کو خالی کر دینا چاہئے۔ بعض صحابہ قریش کے نمائندوں کی یہ بات سن کر غضبناک ہوئے لیکن رسولؐ عہد کے پابند تھے، ان کی باتوں سے قطعاً رنجیدہ نہیں ہوئے اور فرمایا: رات تک کسی بھی مسلمان کو مکہ میں نہیں رہنا چاہئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان کوچ کا اعلان ہوا اور سب نے بلا فاصلہ حرم الٰہی کو چھوڑ دیا۔[1]

مختصر یہ کہ رسولؐ نے اپنی حیات شریف میں لوگوں سے جو وعدے کئے تھے اور کچھ وجوہات کی بنا پر انھیں پورا نہیں کر سکے تھے، ان کی انجام دہی کے لئے اپنی رحلت کے وقت حضرت علیؑ کو بلایا اور اس طرح وصیت فرمائی: 'برادرم میری یہ وصیتیں قبول کرو! میرے وعدوں کو پورا کرنا اور میرا قرض ادا کر دینا۔ حضرت علیؑ نے عرض کی: ان وصیتوں کو میں صحیح طور پر انجام دوں گا۔[2]

جس معاشرہ میں لوگ اپنے عہد و پیان کو پورا کرتے ہیں اور حکومتی نمائندے اور عہدہ دار اپنے وعدوں پر بروقت عمل کرتے ہیں یقیناً ایسا معاشرہ آسیب و گزند سے محفوظ رہتا ہے، وہاں کے حکام اور عوام بھی امن وامان کی زندگی سے مالامال رہتے ہیں۔ وہ کسی تشویش واندیشہ میں مبتلا نہیں ہوتے ہیں۔

حکومت کو امانت سمجھنا

حکومت و اقتدار ایک امانت ہے جسے عوام نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں۔ نمائندوں کا فریضہ ہے کہ وہ اس امانت کی اچھی طرح حفاظت کریں اور جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اسے صحیح طریقہ سے انجام دیں ورنہ وہ لوگوں پر حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ بیشتر سیاسی نظاموں کے حکام اپنے ذاتی مفاد اور اپنے اقرباء کے فائدے کے لئے حکومت کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ انبیائے الٰہی جب بھی مبعوث ہوئے انہوں نے اس غیر خدائی اور غیر انسانی طریقہ کی مقتضائے وقت کے مطابق مخالفت کی اور اس کے خلاف جہاد کیا، اکثر اس سلسلہ میں قید

۱۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۳۵۱

۲۔ قمی، عباس، منتہی الاعمال، ص ۱۷۶

کی صعوبتیں اور شکنجوں کی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں اور کبھی اپنی جان سے گزرنا پڑا۔ رسول اسلامؐ نے بھی دستورات الٰہی سے الہام لیتے ہوئے اپنے زمانہ کے فرعون کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور نتیجہ میں اسلامی حکومت بنائی اور سیاسی قوت و اقتدار کو اسلام کے مقدس مقاصد اور معاشرہ کے لوگوں کے فائدے کے لئے استعمال کیا۔ اسی حکومت کے اتباع میں حضرت علیؑ کی کوتاہ مدت حکومت بھی سرگرم عمل تھی۔ انھیں الٰہی حکومتوں سے درس لیتے ہوئے اور انہیں اپنا نمونہ قرار دیتے ہوئے، اسلامی جمہوریہ ایران کا نظام بھی ان کے اصولوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے، انشاء اللہ کامیاب ہوجائے گا۔

سیرت نبوی میں معاشرہ کے حکام وزمام دار لوگوں کے امانتدار اور ان کے خادم ہیں۔ سَیِّدُ القَومِ خَادِمُهُم۔ خود رسول خداؐ کا یہی شیوہ تھا۔ آپؐ نے یمن میں اپنے کارندہ کو ایک حکومتی فرمان میں تاکید کی ہے کہ حکومت کو اپنے ناجائز مقاصد کے لئے استعمال نہ کرنا بلکہ اسے ایسی امانت سمجھنا کہ جس کی اچھی طرح حفاظت کی جاتی ہے:

> ”اے معاذ! انھیں کتابِ خدا کی تعلیم دینا اور پسندیدہ اخلاق کی بنیاد پر ان کی تربیت کرنا۔ ہر نیک و بد کو اس کے شایان شان جگہ دینا، ان کے درمیان خدا کا حکم جاری کرنا اور کسی کو لوگوں کے اموال میں دخل اندازی کی اجازت مت دینا، کیونکہ یہ حکومت اور اموال تمہاری ملکیت نہیں ہے اور ان کی امانت کو ادا کردینا“۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: رسول خداؐ امانت کی سختی سے پابندی کرتے تھے یہاں تک کہ اگر آپؐ کے پاس سوئی دھاگا بھی امانت کے طور پر رکھا جاتا تھا تو اسے بھی اس کے مالک کو وقت مقررہ پر واپس کردیتے تھے۔[۱] ایسے افراد کو ذمہ داری سپرد کرنا چاہئے جن کے اندر امانت داری کی خصلت ہو، کیونکہ اگر امانت داری کا جوہر نہیں ہوگا تو وہ معاشرہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گا۔

۱۔ سنن النبی، ص۶۵

جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، رسولؐ کے سیاسی نظام میں، صاحبان حکومت و اقتدار لوگوں کی خدمت کرتے تھے اور کوئی شخص بھی کسی بھی عنوان سے حکومت سے غلط فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا اور آپؐ ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کو معاف نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی سرزنش کرتے تھے۔ اس طرح اسلام کے سیاسی نظام میں ذمہ داریوں کو خدائی امانت سمجھا جاتا ہے۔ ان امانتوں میں خیانت ہر گز قابل معافی اور لائق در گزر نہیں ہے لہٰذا سماجی و اجتماعی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی کرنا اور لوگوں کے حقوق کا احترام نہ کرنا اور انھیں ان کے حقوق نہ دلانا، امت کے حقوق کا ضیاع اور اس امانت میں خیانت ہے جو عوام نے ان کے سپرد کی ہے۔ اس امانت کو واپس کرنے کی اہمیت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ رسولؐ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی زیادہ نمازوں، کثیر حج اور ان کے راتوں کو گڑگڑانے کو نہ دیکھو بلکہ ان کی امانت داری اور صداقت کو دیکھو۔ اس بنا پر حکومت و اقتدار کو امانت سمجھنا اور اس کو صحیح طریقہ سے ادا کرنا عوام و معاشرہ کی خدمت ہے، اس سے خدا بھی راضی ہوتا ہے اور حکومت سے غلط فائدہ اٹھانا اور اس کے امور میں خیانت کرنا، عوام و معاشرہ سے خیانت کرنے کے مترادف ہے اور عوام و معاشرہ سے خیانت کرنا، آیہٴ یا ایُّھَا الَّذِینَ امنوا لا تخونوا اللّٰہ والرسول وتخونوا اَماناتکم وانتم تعلمون [۱] کے مطابق خدا اور رسولؐ اور انسانوں سے خیانت ہے۔

تعلیم وتربیت کا اہتمام

تعلیم کے معنی سکھانا ہے اور اس کا مطلب ہے انسان کی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کی ترقی اور نکھار کے لئے، اسباب و وسائل فراہم کرنا یا انسان کی فکری صلاحیت میں خلاقیت وابتکار ایجاد کرنا۔ تربیت کے معنی بھی رشد وارتقاء کے ہیں لیکن اس کے اصطلاحی معنی ہیں: استعدادوں، صلاحیتوں کو ترقی دینا یا ان کی ترقی و نکھار کے لئے زمین ہموار کرنا یا ایک موجود کی مخفی صلاحیتوں کو منصۂ شہود میں لانا اور یہ بات ہر اس موجود پر صادق آتی ہے جس میں رشد وارتقاء کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ انسان ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ [۲]

تعلیم و تربیت یعنی انسان سازی، انہیں انسان بنانے اور عبادت کرنے کے لئے تعلیم و آگہی دینا کہ یہی خلقت انسانی کی غرض ہے۔ آیۃ وَمَا خَلَقْتُ الجن والانس اِلاَّ لِیعبدون اسی موضوع کی طرف

۱۔ سورہ انفال، آیت ۲۷

۲۔ رہبر، محمد تقی رحیمان، محمد حسن، اخلاق وتربیت اسلامی، ص ٦

اشارہ ہے اور انبیاء کی بعثت بھی اسی لئے ہوئی ہے تاکہ وہ انسان کو آگاہ کریں اور اپنے زیر سایہ ان کی تعلیم و تربیت کریں تاکہ وہ حکم خدا پر عمل کریں۔

آیہ هُوَالَّذی بَعثَ فی الاُمِّیّین رسولا منهم یتلوا عَلیهم آیاته ویُزکیهم ویُعَلِمُهم الکتٰبَ وَالحکمَة[۱] سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۹ و ۱۵۱ بھی اسی موضوع پر تاکید کرتی ہیں اور لفظ یعلمهم الکتٰبَ وَالحکمَة تعلیم کی طرف اور یزکیهم تربیت وپرورش کی طرف اشارہ ہے اور یہ دونوں انسان کی صلاحیت کو نکھارنے میں ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں۔

اسی بناپر رسول اسلامؐ نے انسانی اقدار کی بنیاد سمجھے جانے والے موضوع، تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی ہے اوراس کی ترویج وتحکیم کے لئے بڑااہتمام کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے انسانی تعلیم وتربیت اور ارشاد وہدایت کو اپنی بعثت ورسالت کا مقصد قرار دیا ہے ۔آپ فرماتے ہیں: بالتعلیم ارسلت۔[۲]

اس میں شک نہیں ہے کہ اسلامی تعلیم وتربیت کا نقطۂ آغاز بعثت رسولؐ، یا آپؐ پر فرشتۂ وحی کا نزول ہے۔ اور وہ آیۂ علق کا نزول ہے۔ یہ آیت رسولؐ پر نازل ہوئی اور آپؐ معلم بن گئے اور اسلامی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کرلی۔ چنانچہ آپؐ خود فرماتے ہیں: ”اِنّما بُعِثت معلّماً“ میں تعلیم وتربیت کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔[۳]

شروع میں رسولؐ نے خفیہ طور پر خاص افراد مثلاً حضرت خدیجہؑ اور حضرت امام علیؑ کی تربیت کی اور یہی سابق الاسلام ہیں۔ پھر آپؐ نے اجتماعی طور پر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اس جماعت میں آپؐ کے انصار واصحاب شامل تھے اور جب آیۂ وَاَنذِر عَشِیرَتَكَ الاَقرَبین نازل ہوئی تو آپؐ نے علی الاعلان اسلامی تربیت کا آغاز کیا یہاں تک کہ بادشاہوں، مذہبی رہبروں اور اقوام وقبائل کے سرداروں کو خط ارسال کئے۔

۱۔ سورہ جمعہ، آیت ۲

۲۔ مطہری، مرتضی، تعلیم وتربیت اسلامی، ص ۱۰

۳۔ حسینی، سید علی اکبر، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامی، ص ۲۷

علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں نقل کیا ہے کان رسولُ اللّٰہِ اذا حدّثَ الحدیثَ او یسئل عن الامر، کرّرہ ثلاثاً لیفھمَ و یفُھمَ جب آپؐ لوگوں کے سامنے کوئی حدیث بیان کرتے تھے یا آپؐ سے کوئی سوال دریافت کیا جاتا تھا تو آپؐ اسے تین بار بیان کرتے تھے تاکہ مدمقابل اسے اچھی طرح سمجھ لے۔

رسول اسلامؐ کے نقطۂ نظر سے تعلیم و تربیت کو دوسرے اخلاقی اقدار پر برتری حاصل ہے۔ آنحضرتؐ نے اس موضوع پر خاص توجہ دی ہے اور انھیں مختلف محافل و مجالس میں اور دیگر مواقع پر مکرر بیان کیا ہے۔ منقول ہے کہ ایک روز رسولؐ مسجد میں داخل ہوئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وہاں لوگوں کے دو دستے الگ الگ جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ دینی بصیرت اور علم حاصل کرنے میں مشغول ہے۔ دوسرا گروہ خدا سے دعا اور حاجت طلبی میں مصروف ہے۔ آپؐ نے ان دونوں کو آفرین کہا، شاباشی دی اور فرمایا: یہ دونوں گروہ خیر و سعادت کے کام میں مشغول ہیں چونکہ ایک گروہ خدا سے دعا کر رہا ہے اور اسے پکار رہا ہے اور دوسرا علم و دانش حاصل کر رہا ہے اور اپنی دینی معلومات کو تعلیم کے ذریعے دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے، اگرچہ دونوں گروہ کامیابی وفضیلت کے راستہ پر گامزن ہیں لیکن پہلا گروہ دوسرے گروہ پر برتری رکھتا ہے، میں تمہارا رسولؐ ہوں، حقائق کی تعلیم اور آگہی و معلومات کو عام کرنے کی ذمہ داری اپنے دوش پر لیے ہوئے ہوں اور میری بعثت کا مقصد بصیرت ایجاد کرنا اور تعلیم دینا ہے۔ پھر آپؐ اس گروہ کے پاس بیٹھ گئے جو علم اندوزی اور دینی تعلیم و تربیت میں مشغول تھا۔ رسولؐ نے اپنے اس نمونہ کردار سے دونوں گروہوں کی قدر و قیمت متعین فرمادی اور عملی طور پر اعلان کر دیا کہ تعلیم و تربیت عبادت پر فوقیت رکھتی ہے۔[1]

تعلیم و تربیت کی دیگر فضائل پر برتری کو بہت سی معتبر کتابوں میں نبی اکرمؐ کی زبان سے نقل کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ تعلیم و تربیت کرنے والوں کو فرشتوں کا ہمنشین قرار دیتے ہیں ۔ صفوان بن عسّان سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں آنحضرتؐ کی خدمت میں شرف یاب ہوا، آپؐ سرخ رنگ مسند پر ٹیک لگائے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے علم حاصل کرنے کے لئے مسجد کا رخ کیا ہے۔ رسولؐ نے فرمایا:

۱۔ شہید ثانی، منیۃ المرید، آداب تعلیم و تعلم، ص ۵۵

"شاباش! تم ہی طالب علم ہو! طالب علم کے لئے فرشتے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور زمین سے آسمان تک وہ اس کے گرد جمع رہتے ہیں اور اس کی محبت و مودت میں سرشار رہتے ہیں۔"

رسولؐ کے تربیتی مکتب و مرکز میں حضرت علیؑ جیسی شخصیت پرورش پاتی ہے جو اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں:

"رسولؐ پر کوئی آیت نازل نہیں ہوتی تھی مگر یہ کہ اسے آپؐ مجھے سناتے تھے اور املا کراتے تھے تاکہ میں اسے اپنے قلم سے لکھوں، اسی طرح مجھے قرآن کی تاویل و تفسیر اور اس کے ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ اور اس کے خاص و عام سے آگاہ کیا اور خدا سے دعا کی کہ میرے حافظہ و فہم میں اضافہ فرمائے۔"[۱]

حضرت علیؑ رسولؐ کے ساتھ اپنی رفاقت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں رسولؐ کے ساتھ ہمیشہ اس طرح رہتا تھا جس طرح بچہ ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ آپؐ ہر روز میرے لئے علم کا نیا گوشہ آشکار کرتے تھے اور مجھ سے فرماتے تھے کہ میں آپؐ کی پیروی کروں۔"[۲]

اس طرح آپؐ رسول اعظمؐ کے مکتب کے تربیت یافتہ ہیں۔ حضرت علیؑ نے رسولؐ کے دامن میں اس طرح پرورش پائی، پھر آپؐ نے اپنی دختر نیک اختر جناب فاطمہ زہراؑ کو حضرت علیؑ کی زوجیت میں دے دیا۔ ایسی بے نظیر خاتون جس کا ہمسر خدا اور رسولؐ کو زمین وآسمان میں نہیں ملا، ان دونوں عظیم شخصیتوں کی پاک و پاکیزہ اولاد نے رسول خداؐ کی اسلامی تعلیم وتربیت کی مہم کو دائمی بنایا۔

اب ہم رسول اکرمؐ کے زمانہ کی تعلیم وتربیت کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آپؐ کی سیرت کا جز تھے اور اس الٰہی وانسانی اہم امر کے بعد والے مراحل کے لئے زمین ہموار کرنے کا سبب بنے۔

۱۔ صدوق، الخصال، ص ۱۹۲

۲۔ خطبہ ۱۹۲

پہلی اور اہم ترین خصوصیت کو رسولؐ کی شخصیت میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ رسولؐ ایسی خاص روش اور طریقہ سے استفادہ کرتے تھے جو موقعہ محل کے مطابق ہوتی تھی۔آپؐ سادگی کی رعایت کرتے تھے اور آپؐ کے قول و عمل میں ہم آہنگی ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے رسولؐ معلم و مربی اور قرآن کی لفظوں میں اسوۂ حسنہ تھے لہٰذا ان کی تاسی و پیروی ہونی چاہئے اور ان کی تربیتی ہدایتوں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

عہد رسولؐ کی تعلیم و تربیت کی دوسری خصوصیت عمومی تعلیم تھی۔ اس بنا پر تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے علم حاصل کریں۔

عصر رسولؐ کی تیسری خصوصیت تعلیم کا موضوع و محتویٰ ہے جو اعتقادی اصولوں، مواعظ، اخلاق اور فقہ و تاریخ پر مشتمل ہے۔ در حقیقت یہ ایسے موضوعات تھے جن کی بنا پر بعد والے زمانہ میں بہت سے علمی اسلامی ادارے وجود میں آئے۔

چوتھی خصوصیت، اصول اور منصوبہ بندی میں تنوع ہے جس میں وسیع تر خیالات شامل ہوتے تھے۔ ایک طرف تو بے علم لوگوں کو علم حاصل کرنے کا شوق دلایا جاتا تھا اور دوسری طرف زمام داروں اور سربراہوں سے خط وکتابت ہوتی اور مسلمانوں کو غیروں کی زبان سیکھنے کی رغبت دلائی جاتی تھی۔

عصر رسولؐ میں تعلیم و تربیت کی پانچویں خصوصیت علم و ثقافت کی وسعت تھی۔ ابتداء میں یہ کام حرمین شریفین سے شروع ہوا اور اطراف و جوانب میں معلموں کو بھیج کر بتدریج اس میں ترقی ہوئی۔ کبھی کبھار رسولؐ بھی ان علمی کلاسوں میں تشریف لاتے اور طالب علموں اور اسلامی تربیت حاصل کرنے والوں کو نصیحت کرتے تھے۔[۱]

یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے کہ تعلیم و تربیت پر رسولؐ کی خاص توجہ تھی اور درج ذیل جملہ اس بات کو ثابت کرتا ہے: اطلبوا العلم ولو بالصین، رسول اسلامؐ نے اس موضوع کو اتنی اہمیت اس لئے دی ہے تاکہ دینی و انسانی تہذیب و ثقافت ترقی پاسکے، اسلامی آداب کا رواج ہو، تحصیل علم کی طرف رغبت ہو اور عہد جاہلیت کے عربوں کو انسانی و الٰہی اخلاق و اقدار سکھائے جائیں۔ یقیناً رسولؐ نے اس سلسلہ میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح لوگوں کی تربیت کی کہ وہ لوگ جو اخلاق و اقدار کے نام سے بھی

۱۔ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامی، ص ۴۳

واقف نہیں تھے وہ اس پر قربان ہونے کے لئے تیار ہوگئے اور آپؐ کی تعلیم و تربیت نے درندہ صفت اور وحشی انسانوں کو بافہم، مہذب، صاحبِ علم اور حقیقت پسند بنا دیا۔

دشمن کے ساتھ انسانی برتاؤ

اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر مذہب و مسلک کے لئے ضروری ہے کہ انسانوں اور معاشرہ و سماج کے معاملات میں انسانی اخلاق و اقدار کو ملحوظ رکھے اور مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی اس دستور کے مطابق عمل کرے۔ یہ انسانی اور الٰہی دستور جو رسولؐ کی دینی تعلیمات میں سے ایک ہے، آپؐ کے افکار و خیالات اور آپؐ کے سیاسی و حکومتی کردار میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جب رسولؐ جنگ کے لئے لشکر بھیجنا چاہتے تھے تو فوج کے سپہ سالار خصوصاً اور عموماً پورے لشکر کو خوفِ خدا اور تقویٰ کی تلقین کرتے تھے اور پھر فرماتے تھے:

> ''خدا کے نام سے اور اس کے لئے کافروں سے جنگ کرنا، مکر نہ کرنا، خیانت نہ کرنا، قتل ہو جانے والوں کے کان، ناک نہ کاٹنا، بچوں کو اور پہاڑوں پر عبادت کرنے والوں کو قتل نہ کرنا، خرما کے درختوں کو آگ نہ لگانا اور پانی میں غرق نہ کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، کھیتیوں میں آگ نہ لگانا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ کل تم اس کے محتاج ہو جاؤ گے، حلال مویشیوں کو کھانے کے علاوہ ذبح نہ کرنا۔ دشمن سے مقابلہ کے وقت اسے تین باتوں، مسلمان ہونے، جزیہ دینے یا جنگ نہ کرنے، کی دعوت دینا اگر وہ ان تینوں میں سے کسی بات کو قبول کرلے تو ان کی بات کو تسلیم کرلینا اور ان سے جنگ نہ کرنا۔''[1]

رسولؐ کی دینی تعلیمات کے مطابق کفار و منافقین سے جنگ کرنا جائز ہے لیکن انھیں شکنجہ

۱۔ سنن النبی، ص ۸۵ و ۸۶

دینااور جسمانی و روحانی اور نفسیاتی اذیت وآزار پہچانا منع ہے۔اسی مہربان اور بخشنے والے خدا نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین کالقب دیا ہے۔آنحضرتؐ نے درج ذیل چیزوں سے منع کیا ہے:

روحی و نفسیاتی برتاؤ: جنگ خیبر مسلمانوں اور یہود کے درمیان ہونے والی بڑی جنگوں میں سے ایک ہے جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔کچھ یہودیوں کو مسلمانوں نے اسیر کیا،انھیں میں سے صفیہ بنت یحیٰی ابن اخطب بھی تھی۔ (یحیٰی یہودیوں کابڑاعالم تھا) رسولؐ کے قریبی صحابی بلال حبشی نے ایک عورت کے ساتھ صفیہ کواسیر کیااور انھیں یہودیوں کی لاشوں کے قریب سے گزارااور رسولؐ کے پاس لائے۔صفیہ نے جب راستہ میں یہودیوں کی زخمی لاشوں کو دیکھا توانہیں بہت صدمہ ہوا۔انہوں نے منھ پر طمانچے مارے اور سر پر خاک ڈالی۔رسولؐ نے معلوم کیاکہ تم نے چہرہ پر طمانچے کیوں مارے اور یہ سرپر خاک کیوں ڈالی ہے؟ صفیہ نے ماجرا بیان کیا۔رسولؐ بلال کے اس غیر اسلامی رویّہ کو سن کر وہ بھی ایک عورت کے بارے میں، رنجیدہ ہوئے اور بلال سے فرمایا: ائے بلال! کیا تمہارے اندر مہر و محبت اور رحم دلی کاجذبہ بالکل نہیں رہا کہ تم نے انھیں ان کے مقتولوں کے پاس سے گزارا ہے؟ یہ بے رحمی کیوں کی ہے؟ بلال حبشی کارسولؐ کی نظر میں بڑامرتبہ تھااس کے باوجود رسولؐ نے انھیں اس طرح سرزنش کی۔[۱]

رسولؐ فوج کے سپہ سالاروں کو اسیروں سے برتاؤکے خاص احکام دیتے تھے اور ان کے ساتھ انسانی سلوک روا رکھنے اور اسلامی محبت و مہربانی کے ساتھ پیش آنے کی تاکید فرماتے تھے اور اسیروں کو روحی، جسمی اور نفسیاتی اذیت وآزار پہنچانے سے منع کرتے تھے۔جنگ بدر سے واپسی کے وقت رسولؐ کے چچا جناب حمزہ اسیروں کو رسولؐ کی خدمت میں لائے تاکہ ان کا فیصلہ ہو جائے ان کی تعداد ستر تھی۔رسولؐ نے جناب حمزہ سے فرمایا:

> ''ان لوگوں کو اصحاب کے درمیان خیموں میں رکھو اور یاد رکھو!, ہمیشہ اسیروں کا احترام کرنا اور ان کے ساتھ انسانی سلوک روا رکھنا اور اسیروں کی تقسیم میں (یہ حکم دیتے تھے کہ) بچوں کو ماؤں سے جدا نہ کیا جائے، اور راحت وآرام میں انھیں اپنے اوپر ترجیح دی جائے اوران کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے۔''

غزوۂ ذات الرقاع (۴ ہجری) میں لشکر اسلام کی فتح یابی کے بعد رسولؐ نے اپنے سپاہیوں کو

۱۔ محمدی اشتہاردی، محمد، سیرت چہارہ معصوم، ص ۸۹

نصیحت کی کہ جنگ کے بعد اسیروں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا، انھیں تازیانے نہ مارنا، ان کے ہاتھ نہ باندھنا صرف ان کے اسلحے ان سے لے لینا۔

جسمی اذیت وآزار: رسولؐ کے نقطۂ نظر سے وہ عام لوگ جو فوج اسلام کے خلاف میدان میں نہیں تھے انھیں اذیت وآزار نہیں دینی چاہئے اور نہ انھیں قتل کرنا چاہئے۔ غزوۂ حنین سے واپسی پر جب رسولؐ نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو فرمایا؛: اس عورت کو کس نے قتل کیا ہے؟ اصحاب نے بتایا: خالد بن ولید نے۔ فرمایا: خالد سے کہہ دو کہ رسولؐ تمہیں بچہ، عورت اور کافر مزدور کے قتل سے منع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپؐ نے فوج اسلام کو کافروں کی سرزمین پر زہر ڈالنے سے بھی منع کیا ہے۔[۱]

ایک غزوہ کے بعد رسولؐ کو یہ بتایا گیا کہ ایک لڑکی کو بھی قتل کیا گیا ہے۔ یہ سن کر رسولؐ بہت غضبناک ہوئے۔ اصحاب نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ناراض کیوں ہیں؟ وہ لڑکی کافر ومشرک تھی۔ یہ سن کر رسولؐ کے غیظ میں اور شدت آگئی، فرمایا: کیا مطلب؟! یہ ابھی تم سے بہتر ہیں کیونکہ یہ ابھی اپنی پاک فطرت پر ہیں۔ کیا تم مشرکوں کی اولاد نہ تھے؟ خبردار بچوں کو قتل نہ کرنا، ہرگزایسانہ کرنا، ہرگز۔[۲]

رسولؐ نے جن باتوں سے فوج اسلام کے سپہ سالاروں کو منع کیا ہے ان میں دشمن کی لاش کو مثلہ اور پارہ پارہ کرنا بھی شامل ہے۔ مثلاً جب جناب حمزہ (رسولؐ کے چچا) کی لاش کو مشرکوں نے مثلہ کردیا تو آنحضرتؐ کو بہت غصہ آیا اور فرمایا: اگر ہم ان (قریش) پر فتحیاب ہوں گے تو ان کے تیس لوگوں کو مثلہ کریں گے، لیکن آیت نازل ہوئی: اے رسولؐ! اگر کسی نے آپؐ پر ظلم کیا ہے تو تم بھی اس پر ایسی ہی ضرب لگا سکتے ہو اور عدل کے مطابق انتقام لے سکتے ہو اور اگر صبر سے کام لو تو صابروں کے لئے یقینا (انتقام سے) بہتر اجر ہے[۳]۔ رسولؐ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اس مصیبت پر صبر کیا اور حکم دیا کہ

۱۔ کافی، ص ۲۸۵

۲۔ ضیایی، بیگدلی، محمد رضا، اسلام و حقوق بین الملل، ص ۲۵۲

۳۔ سورہ نحل، آیت ۱۲۶

دشمنوں کا مثلہ نہ کریں۔[۱]

ایک اور بات جس کی رسولؐ نے نصیحت اور سخت تاکید کی ہے وہ یہ ہے کہ دشمن کا محاصرہ نہ کیا جائے اور اس پر اقتصادی پابندی نہ لگائی جائے۔ آنحضرتؐ کے نقطۂ نظر سے ان لوگوں کی بھی اقتصادی محاصرہ وناکہ بندی نہیں کرنی چاہئے جو فوج اسلام سے جنگ کر رہے ہیں۔ اس کا عملی نمونہ ثمانہ بن اثال حنفی کی حرکت پر آپؐ کا شدید اعتراض ہے۔ فتح مکہ سے پہلے ثمانہ قبیلہ یمامہ کا رئیس و سردار تھا، تازہ مسلمان ہوا تھا۔ اس نے قریش کا اقتصادی محاصرہ کر لیا اور ان تک آذوقہ اور کھانے پینے کا سامان لے جانے والے قافلوں پر پابندی لگا دی اور یمامہ ہی کے راستہ سے وہاں قافلے پہنچ سکتے تھے، دوسری جگہ سے نہیں۔ مکہ والے تنگ آگئے انہوں نے رسولؐ کی خدمت میں خط روانہ کیا اور مکہ سے اقتصادی پابندی اٹھانے کی درخواست کی۔ آپؐ نے فوراً ثمانہ کے پاس پیغام بھیجا کہ کھانے پینے کا سامان مکہ جانے دو۔[۲]

مجموعی طور پر اسلام میں خصوصاً رسولؐ اور ائمہ اطہار کے مکتب فکر میں جنگی اسیروں کے ساتھ روا رکھا جانے والا برتاؤ معین ہے اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے۔ جو اسیر مسلمان ہو جاتے ہیں ان پر خاص توجہ دینی چاہئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ملت اسلامیہ کا جز شمار ہوتے ہیں اور خدا کے قوانین ان پر بھی نافذ ہوتے ہیں۔ بنابرایں کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ وہ انھیں کوئی تکلیف دے یا ان کا مذاق اڑائے اور اگر جنگی اسیر پناہ چاہتے ہیں تو انہیں قید و اسیری سے رہا کیا جانا چاہئے اور عورتوں، بچوں اور ناتواں لوگوں کو قتل نہیں کرنا چاہئے اور ان کے شوہر و بچوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرنا چاہئے، جو زخمی چلنے پھرنے سے عاجز ہوں ان کے ساتھ جنگی اسیروں جیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس طرح رسولؐ محبت و رحمت نے فوجیوں کو یہ عظیم سبق دیا ہے خصوصاً سپہ سالاروں اور کمانڈروں کو یہ تعلیم دی ہے کہ جنگی اسیروں کے ساتھ اسلامی مہر و محبت کے مطابق برتاؤ کریں۔

رسولؐ کی حکومتی روش اور اجتماعی سیرت کی روشنی میں معاشرہ میں اقدار کو قائم کرنا

قرآن مجید رسولؐ کو اسوۂ حسنہ قرار دیتا ہے للذا معاشرہ میں اقدار کے فروغ کے لئے رسولؐ کا نمونہ ہونا بہترین ذریعہ ہے، ایسے اقدار جن پر عمل کر کے معاشرہ ہمہ جہت رشد و ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے

۱۔ الکامل فی التاریخ، ص ۲۵۲

۲۔ ابن اسحاق، عبدالملک، سیرت رسول اللہ، ج ۱۰، ص ۹۲

اور انسان اپنا حقیقی وقار حاصل کرسکتا ہے۔اس وقت معاشرہ میں اعلیٰ اقدار وآراستہ انسان نمایاں طور پر نظر آئیں گے، ان میں سے بعض کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

رسولؐ خُلقِ عظیم کے درجہ پر فائز تھے، "وَاِنَّکَ لَعلیٰ خُلُقٍ عظیمٍ"[۱] انھیں بلند اخلاق کے ذریعہ ذریعہ آپؐ کے بہت سے طرفدار ہوگئے تھے[۲]۔ یہ چیز اسلام کے نشر و نفاذ اور راہ تبلیغ میں آپؐ کی کامیابی کا سبب ہوئی۔آپؐ کی امت بھی آپؐ کی پیروی و تاسی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار اور دشمن کے لئے سخت و فولاد بن سکتی ہے۔ اسلامی جمہوریہ نظام بھی رسولؐ کے اس قرآنی پیغام کو نمونہ سمجھتے ہوئے آپس میں ایک دوسرے کے لئے مہربان و ہمدرد اور داخلی و خارجی دشمن کے لئے سخت و سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکتا ہے۔

رسولؐ امانت دار اور صحیح العمل تھے اسی لئے لوگ آپؐ کو محمد امین کہتے تھے۔آپؐ بیت المال کی حفاظت و نگہبانی میں بہت حساس اور نہایت سنجیدہ تھے اور اس سلسلہ میں خود اقدام کرتے تھے۔ کسی جنگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہوگیا، لوگوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ اس کے جنازے کی نماز پڑھا دیجئے۔رسولؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے پہلوتہی کی۔لوگوں نے وجہ معلوم کی۔آپؐ نے فرمایا: اس نے اجازت کے بغیر بیت المال سے ایک ردا اٹھالی تھی۔اس طرح اس نے بیت المال سے غلط فائدہ اٹھایا لہٰذا میں اس کے جنازہ پر نماز نہیں پڑھوں گا۔ یہ بہت بڑا سبق ہے۔

رسول اعظمؐ بڑا بننے، خاندان پرستی اور قومی عصبیت کے مخالف تھے اور اس کے خلاف جنگ کرتے تھے۔آپ فرماتے ہیں: میں روزِ قیامت اولادِ آدم کا سردار وآقا ہوں لیکن مجھ سے نزدیک اور قریب ہونے کی وجہ سے کوئی بھی فائدہ نہیں اٹھا پائے گا اور اس کو میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی مگر یہ کہ وہ متقی اور پرہیزگار ہو۔اسی طرح آپؐ نے یمن کے صوبہ دار عمرو بن حزام کو خاندان پرستی اور عصبیت سے منع کیا تھا۔ جنگ بدر میں بعض سپہ سالار اور قریبی افراد کو یہ توقع تھی کہ مال غنیمت میں سے انھیں زیادہ ملے گا،

۱۔ سورہ قلم، آیت ۴

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹

لیکن رسولؐ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ کو غیظ آیا اور ان سے مقابلہ کیا۔ اس پیغام سے اہل حکومت اپنے منصب و عہدہ سے غلط فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور اس منصب پر فائز ہونے کی بنا پر انھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے قریبی اور احباب کو بیت المال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیکھیں اور چپ رہیں۔

دینی معاملات اور اصولوں میں آپؐ ہرگز چشم پوشی نہیں کرتے تھے لیکن عام حالات میں مسلمانوں بلکہ بت پرستوں پر بھی مہربان تھے، لطف و محبت آپؐ کا واضح کردار تھا۔ نادانوں اور دشمنوں کی اذیت و آزار پر آپؐ صبر و تحمل سے کام لیتے تھے[1]۔ مسلمانوں اور اسلامی نظام کے بارے میں آپؐ بہت حساس و سنجیدہ تھے۔ پس بہتر یہی ہے کہ مسلمان اسلام کے اصولوں پر عمل کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور مستکبروں اور مخالفوں کی شیطنت پر، مقدسات کی اہانت اور دین کے اصول و ضروریات کے مذاق پر خاموش نہ بیٹھیں اور اقتضائے حال کے مطابق ان کا جواب دیا جائے۔

آنحضرتؐ کے سیاسی نظام میں، حکومت و اقتدار، دین کے مفاد، لوگوں کے نفع اور معاشرہ کی بھلائی کے لئے تھا اور آپ کسی بھی مقام و منصب پر فائز حکومت کے ذمہ داروں کو یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنے منصب سے غلط فائدہ اٹھائیں یا اپنے حاشیہ نشینوں کو فائدہ پہنچائیں۔ رسول خداؐ عدل کا مرقع اور ظلم ستیزی کا مظہر تھے۔ آپؐ کی حکومتی روش میں یہ بات نمایاں تھی اور آپؐ خود بھی فرماتے تھے کہ عادل خدا کی طرف سے مامور ہونے والے کو عدل و انصاف کے مطابق عمل کرنا ہے[2]۔

رسولؐ نے اپنی زمام داری کے زمانہ میں، انسانی و الٰہی اقدار و معیار کے مطابق عمل کیا ہے۔ یہ اصول آنحضرتؐ کے سیاسی افکار و کردار میں بخوبی نمایاں تھا اور آپؐ کے سماجی اخلاق کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ آپؐ کی سیرت حسن اخلاق، نصیحت و خیر خواہی، انسانوں کا احترام و اکرام، دوگانگی اور طبقہ بندی سے جنگ اور دوستی و برادری پر استوار تھی۔

رسولؐ اجتماعی عدل پر خاص توجہ رکھتے تھے۔ آپؐ کا کردار، عدل و انصاف قائم کرنے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپؐ خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے تاکہ باطل کو نابود کریں اور عدل و انصاف کو عام کریں۔ آپؐ نے اس اصول پر عمل کرنے کی پاداش میں بہت سختیاں برداشت کیں اور عدل و حق کے دشمنوں نے آپؐ

۱۔ سورہ احقاف، آیت ۳۵

۲۔ سورہ نحل، آیت ۹

کے خلاف بہت سی جنگیں لڑیں۔

آنحضرتؐ معاشرہ سازی اور اخوت و برادری کو عبادت شمار کرتے تھے۔ مومن بھائی کے کھودینے کو آپؐ بدن کے کسی عضو کے کھودینے کے مترادف سمجھتے تھے۔رسولؐ کی نظر میں، حکومت امانت ہے۔ معاذ بن جبل کو پروانہ صوبہ داری دیتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

> ''اے معاذ! میں تمہیں امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اس صورت میں لوگ امین و صحیح کام کرنے والے حاکموں کا استقبال کریں گے اور اپنے امور میں ان پر اعتماد کریں گے''

رسولؐ کے نزدیک ذمہ داری اور منصب ایک سنگین امانت ہے۔ ذمہ داروں کو اس کا سخت پاس و لحاظ رکھنا چاہئے اور اسے مقصد تک پہنچانا چاہئے۔ رسولؐ کی سیرت میں اقدار کے تحفظ کی خاص اہمیت تھی ۔آنحضرتؐ ہر موقع پر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ کے سیاسی نظام میں فریب کاری ، دروغ گوئی اور حیلہ سازی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔آپؐ اپنے عہد و پیمان کے پابند تھے یہاں تک کہ دشمنوں سے کئے ہوئے عہد کو بھی پورا کرتے تھے اور دینداری کو عہد پورا کرنے کا لازمہ سمجھتے تھے۔ اپنے امیروں اور صوبہ داروں کو خیانت و پیمان شکنی اور فریب کاری سے بچنے کی وصیت و تاکید کرتے تھے اور اگر کوئی اس کے خلاف کرتا تھا تو اس کی سرزنش کرتے یا اسے معزول کردیتے تھے۔

رسولؐ جاہ پرستی اور تفوق طلبی سے جنگ کرتے تھے۔آپؐ حکومت و اقتدار کو برتری حاصل کرنے اور ریاست طلبی کا ذریعہ نہیں بناتے تھے اور حاکموں اور زمام داروں کو اس ناپسند انسانی خصلت سے بچنے کی وصیت کرتے تھے۔آپؐ کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ کارندے آپؐ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوں اور آپؐ کے سامنے بادشاہوں اور سلاطین کی مانند سر جھکائیں۔

ظلم و ناانصافی سے آپؐ نے مختلف طریقوں سے مقابلہ کیا۔ فتحِ مکہ کے موقعہ پر شہر میں داخل ہوتے وقت، جب آپؐ سیاسی اقتدار کے اوج پر تھے، ان لوگوں کو معاف کردیا جنہوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے اصحاب کو گالیاں دیں تھیں اور اذیتیں پہنچائی تھیں۔آپؐ نے الٰہی مزاج اور انسانی عظمت کے تحت انھیں آزاد

کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ انھیں دشنام و اذیت دے۔

رسولؐ نے، امت اسلامی کی زمام داری کے دوران، اپنے حاشیہ نشینوں، اقرباء اور وابستہ لوگوں کو کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ آنحضرتؐ سے قرابت کے سبب حکومت کا غلط استعمال کریں۔ فتح مکہ کے بعد رسولؐ کوہ صفا کی بلندی پر کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"ہر شخص اپنے عمل کا رہین و گروی ہے ۔"

اس طرح آپؐ نے یہ سمجھا دیا کہ آنحضرتؐ کے وجود سے کسی کو غلط فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔

رسولؐ کفار اور دشمنان اسلام سے جنگ میں، اسلامی ادب اور انسانی اصول پر عمل کرنے کا حکم دیتے تھے، منجملہ یہ کہ دشمنوں پر پانی بند نہ کرنا، پانی میں زہر نہ ڈالنا، جنگ میں زخمی و مجروح ہونے والے دشمنوں پر رحم کرنا، ان کی آنکھ نہ نکالنا، ان کے کان و ناک نہ کاٹنا، بچوں اور عام لوگوں کو قتل نہ کرنا، پھلدار درخت کو نہ کاٹنا اور اس کی شاخیں نہ توڑنا، کھیتی میں آگ نہ لگانا۔ لیکن یہی رسولؐ رحمت جب یہ دیکھتے کہ حریم دینِ خدا اور الٰہی و انسانی اصول و اقدار پر حملہ ہو رہا ہے تو پھر نرمی و کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ حکم خدا کو جاری کرتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی کی سفارش پر بھی توجہ نہیں کرتے تھے۔

بہر حال رسولؐ کی سیاسی و حکومتی روش میں، الٰہی و انسانی اقدار، آپؐ کی حکمرانی کی بنیاد تھے اور سیاسی اصول و مبانی کے ذریعہ ان اقدار کا تحفظ ہوتا تھا اور ان کی نشر و اشاعت ہوتی تھی۔

منابع و مآخذ :

- ❖ قرآن
- ❖ نہج البلاغہ
- ❖ قانون اساسی جمہوری اسلامی ایران
- ❖ آشوری، داریوش، دانشنامہ سیاسی، انتشارات سہروردی، تہران، ۱۳۴۴
- ❖ ابن اسحاق، عبدالملک، سیرت رسول اللہ، ترجمہ ہمدانی، بنیاد فرہنگ ، تہران، ۱۳۶۶
- ❖ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، دار صار، بیروت ، ۱۳۸۵ق
- ❖ الہندی، کنزالعمال، بیروت
- ❖ جعفریان، رسول، سیرہ رسول خدا، چاپ انتشارات تہران، ۱۳۷۱
- ❖ حسینی، سید علی اکبر، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامی، انتشارات فراھانی، تہران، ۱۳۶۶
- ❖ حکیمی، محمد رضا، محمود، علی، الحیاۃ، ترجمہ احمد آرام، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳۶۵
- ❖ حمید اللہ، محمد، نامہ ھا و پیمانہای سیاسی حضرت محمد واسناد صدر اسلام، سروش، تہران، ۱۳۷۴
- ❖ رضوانی، علی اصغر، صلح طلبی، مسجد جمکران ، قم، ۱۳۸۵
- ❖ رہبر، محمد تقی، رحیمیان، محمد حسن، اخلاق وتربیت اسلامی، سمت، تہران، ۱۳۸۲

کرامت انسانی کے موانع و مشکلات کا تجزیہ

مؤلف: ڈاکٹر صمد بہروز و عبد اللہ نصری
مترجم: مولانا جعفر زیدی

تمام الٰہی مخلوقات میں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جسے تاج کرامت عطا ہوا ہے: وَلَقَد کَرَّمنَا بَنِی آدَمَ وَ حَمَلنَاھُم فِی البَرِّ وَ البَحرِ وَ رَزَقنَاھُم مِنَ الطَّیِبَاتِ وَ فَضَّلنَاھُم عَلیٰ کَثیرٍ مِمّن خَلَقنا تَفضیلاً[۱] ۔یہ کرامت، برتری، امتیاز، صلاحیت اور استعداد ذاتی اور بالقوہ طور پر انسان کے وجود میں پائی جاتی ہے اور انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کو ابھارے اور انہیں شگوفا کرے۔ تکوینی کرامت انسان کے لئے موقع فراہم کرتی ہے تا کہ انسان اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو شگوفا کر کے کمال کے اعلی درجہ پر فائز ہو سکے اور یہ وہی کسبی کرامت ہے جو انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے حاصل کرتا ہے۔

انسانی کرامت کی راہ میں بہت سے موانع، آفتیں اور مشکلات پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض کا تعلق خود انسان کے عمل سے ہے تو بعض کا تعلق شناخت و معرفت سے۔ پیش نظر مقالہ میں نہج البلاغہ کی روشنی میں ہم ان موانع کو جاننے کی کوشش کریں گے جن کا تعلق معرفت و شناخت سے ہے اور اسی طرح سے اس بات کو روشن کریں گے کہ اگر انسان کو انسان اور دنیا کی صحیح معرفت نہ ہو تو انسانی کرامت خدشہ دار ہوتی ہے۔

انسانی کرامت کے سلسلہ میں بہت سے مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن جس چیز کا بہت کم تذکرہ ہوا ہے وہ انسانی کرامت کی راہ میں پائی جانے والی رکاوٹیں اور مشکلات ہیں جو انسان کو اس کے اعلی مقصد تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں اور ان صلاحیتوں کو شگوفا نہیں ہونے دیتے ہیں جس کے ذریعہ انسان کرامات کی اعلی منزلوں کو طے کر سکتا ہے۔

۱۔ سورہ اسراء، آیت ۷۰

اس مقالہ میں ہم نہج البلاغہ میں موجود امام علیؑ کے نورانی فرامین وارشادات کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ انسان اور دنیا کی صحیح معرفت نہ ہونے اور انسانی کرامت کے مخدوش ہونے میں گہرا رابطہ پایا جاتا ہے۔ نہج البلاغہ کی روشنی میں اگر انسان کو عالم ہستی میں اپنے مقام و رتبہ کی صحیح معرفت نہ ہو تو وہ انسانی کرامت کے اعلی رتبہ سے گرنے لگتا ہے اور جو صلاحیتیں پروردگار نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں وہ کبھی بھی شکوفا نہیں ہونگی۔

کرامت کی تعریف:

کرامت مادہ کرم سے لیا گیا ہے۔ صاحب کرامت انسان یعنی نیک اخلاق اور پسندیدہ صفات انسان[۱]۔ کتاب التحقیق فی کلمات القرآن کے مصنف کرامت کے اصلی معنی عزت اور فوقیت بیان کرتے ہیں جس کے مقابل میں ذلت وخواری ہے۔[۲]

کرامت کی نسبت کبھی پروردگار کی جانب دی گئی ہے اقرا و ربك الاكرم[۳]، کبھی فرشتوں کی جانب کراما کاتبین[۴] اور کبھی انسان کی جانب و لقد کرمنا بنی آدم[۵]۔

انسانی کرامت:

انسانی کرامت ایک خاص قسم کی کرامت ہے جو صرف اور صرف انسان سے مخصوص ہے اور دوسری مخلوقات اس سے بے بہرہ ہیں۔ ایسی کرامت جو قدرتی و طبیعی کرامت اور ملکوتی والٰہی کرامت دونوں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ استاد جوادی آملی کا ماننا ہے کہ صرف انسان ہی ملک و ملکوت کو صحیح و سالم طریقہ سے جمع کر سکتا ہے اور پوری طرح سے مکرم بن سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک چونکہ فرشتوں اور جنات میں یہ دو طرح کی کرامت نہیں پائی جاتی ہے لہٰذا سزاوار ہے کہ وہ انسان مکرم کے آگے سجدہ ریز ہوں۔[۶]

۱۔ ابن منظور، مکرم، لسان العرب، مادہ کرم؛ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، مادہ کرم
۲۔ مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن، مادہ کرم
۳۔ سورہ علق، آیت ۳
۴۔ سورہ انفطار، آیت ۱۱
۵۔ سورہ اسراء، آیت ۷۰
۶۔ جوادی آملی، عبداللہ، صورت و سیرت انسان در قرآن، ص۳۲۸

۱۔ تکوینی کرامت: وہ فضیلتیں، صلاحیتیں اور استعداد جس کو انسان کی تخلیق کے وقت اس کی ذات اور فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، حقیقت میں اس کرامت کا خالق خود ذات باری تعالی ہے: ولقد کرمنا بنی آدم و حملناھم فی البر و البحر و رزقناھم من الطیبات و فضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً [۱]۔ پروردگار نے یہ صلاحیتیں انسان کے وجود میں قرار دی ہیں اور انسان صرف ان صلاحیتوں کو لینے والا ہے اور اگر کوئی اس کرامت کے سلسلہ میں لائق ستایش و تمجید ہے تو خود ذات پروردگار ہے، نہ کہ انسان ۔فتبارکَ اللہ اَحسَن الخَالقین [۲]۔

یہ کرامت عمومی ہے یہاں تک کہ غیر مومن کو بھی شامل ہے۔علامہ طباطبائی کے مطابق یہ کرامت حتی مشرک وکافر و فاسق و فاجر کے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ [۳]

۲۔ اکتسابی کرامت: یہ وہ کرامت ہے جسے انسان اپنی محنت و سعی و کوشش سے حاصل کرتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ صرف یہی کرامت قابل تحسین و صد آفرین ہے۔ البتہ اس کرامت تک پہنچنے کی راہ تکوینی کرامت سے ہو کر گذرتی ہے۔ اگر انسان کے وجود اور ذات میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی اکتسابی کرامت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ کرامت، ایمان و تقوا کا قرین و لازمہ ہے اور جتنا شخص ایمان و تقوا والا ہوگا اتنا ہی وہ اکتسابی کرامت کے درجات کو بھی حاصل کر سکتا ہے۔ انّ اَکرمَکُم عندَ اللّٰہِ اَتقاکُم [۴]۔

بعض محققین صرف اکتسابی کرامت ہی کو معیار تعظیم و تکریم انسان جانتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو وہ انسانی کرامت کے قائل نہیں ہیں۔ [۵] اور جو اس اکتسابی کرامت سے محروم ہیں وہ آیۂ کالانعام بل ھم اضل [۶] اور شیاطین الانس و الجن [۷] کے مصداق ہیں اور خطاب کرمنا ان کے لئے نہیں ہے [۸]۔

۱۔ سورہ اسراء، آیت ۱۴
۲۔ سورہ مومنون، آیت ۱۴
۳۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۳، ص ۱۵۵
۴۔ سورہ حجرات، آیت ۱۳
۵۔ صورت و سیرت انسان در قرآن، ص ۳۲۸۔۳۳۲
۶۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹
۷۔ سورہ انعام، آیت ۱۱۲
۸۔ جوادی آملی، امام خمینیؒ و کرامت انسانی، ص ۴۔۷

بعض عرفا اکتسابی کرامت سے محروم افراد کو حیوان ناطق کے دائرہ میں رکھتے ہیں اور انسان سے ان افراد کو وہی نسبت ہے جو مردہ بدن کو انسان سے ہے کہ جن کی صرف صورت اور شکل ہی انسانوں کی طرح ہے[۱]۔ امام خمینیؒ بھی انسانوں کو بالقوہ اور بالفعل انسانوں میں تقسیم کرتے ہیں اور آپ کا ماننا ہے کہ تمام انبیاء کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ انسان بالقوہ کو انسان بالفعل کر دیں۔[۲]

مذکورہ باتوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ صرف اس صورت میں انسان قابل تکریم و تعظیم ہے جب وہ اکتسابی کرامت کو حاصل کرتا ہے ورنہ وہ کرامت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

انسان کو انسان کی صحیح شناخت و معرفت نہ ہونا

۱۔ انسان شناسی کی اہمیت و ضرورت:

پوری تاریخ بشریت میں خدا شناسی اور معرفت پروردگار کے بعد اگر کسی مسئلہ نے فلاسفہ، ماہرین نفسیات اور ماہرین سماجیات کی فکر کو اپنی جانب کھینچتا ہے تو وہ ہے انسان کی شناخت اور اس کے وجودی پہلو کے اسرار و رموز سے واقف ہونا۔ آج تک بہت سی تحقیقات اس ناشناختہ و پر اسرار موجود کو پہچاننے کے سلسلہ میں انجام دی گئی ہیں لیکن آج بھی اس کے وجود کے کچھ ایسے پہلو ہیں جنھیں کشف ہونا باقی ہے اور جو آج بھی سوالات و ابہامات کی اتھاہ تاریکی میں غوطہ زن ہیں۔ بعض محققین اور صاحبان نظر اس سلسلہ میں ایک طرح کی ذہنی کشمکش سے دوچار ہیں۔

الکسیس کارل کا ماننا ہے کہ انسان کی اندرونی دنیا کا ایک وسیع حصہ ابھی کشف نہیں ہوا ہے اور انسانی زندگی پر مطالعہ کرنے والے زیادہ تر افراد کے سوالات ابھی بھی بے جواب ہیں۔[۳]

بشر کی یہ عاجزی و ناتوانی اس وجہ سے ہے کہ انسان اس پورے عالم کا نچوڑ ہے اور تمام عالم کا ماحصل انسان کی ذات ہے۔ استاد جوادی آملی کی تعبیر کے مطابق انسان عالم مجرد و عالم مادہ دونوں کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے[۴]۔ یہی وجہ ہے علامہ جعفری ہر انسان کو ایک قارہ مانتے ہیں جسے مستقل طور پر کشف کرنے

۱۔ ابن عربی، محی الدین، فتوحات المکیہ، ج۲، ص۴۴۱-۴٦۸
۲۔ امام خمینی، شرح چہل حدیث، ص۲۱۸
۳۔ کارل، الکسیس، انسان موجود ناشناختہ، ص۴، ٦
۴۔ جوادی آملی، تفسیر موضوعی قرآن، ج۱۵، ص۱٦۸

اور اس پر تحقیق کی ضرورت ہے[۱]۔ اسی وجہ سے انسان پر ہونے والی صدیوں کی تحقیقات و مطالعات کے باوجود اس کی ذات کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جو ظاہر نہیں ہوئے ہیں اور علم انسان شناسی جس طریقہ سے ترقی کر رہا ہے اس سلسلہ میں اس کے سوالات و ابہامات و مجہولات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ملا صدرا کے مطابق انسان ایک لا انتہا موجود کا نام ہے جس کا کوئی معین مقام و رتبہ نہیں ہے اور دوسرے تمام ممکنات کے برخلاف اس کی کوئی خاص شناخت اور ثابت وجودی رتبہ نہیں ہے اور معرفت حقائق کی چابی نفس انسانی کی معرفت ہے۔[۲]

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا خود کو نہ پہچاننا یا غلط پہچاننا کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ اس کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ممکن ہے انسان مختلف علوم و فنون پر کمند ڈال دے مگر وہ اپنی حقیقی و واقعی شناخت و معرفت سے عاجز ہے؛ وہ دنیا تو کھوج سکتا ہے لیکن خود اس کی ذات اس کے لئے مبہم و مجہول ہے۔ دنیا کو کھوج نکالنا اپنی ذات کے حقائق سے جاہل رہ کر انسان کی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس شخص پر تعجب کرتے ہیں جو اپنی گمشدہ چیز کے تو پیچھے ہے لیکن اپنی گمشدہ ذات سے بالکل غافل ہے[۳]۔ آپ کی نظر میں وہ انسان جو نفس واحد کے حساب و کتاب سے عاجز و ناتوان ہے وہ دوسروں کے بھی حساب و کتاب سے جو کہ بہت زیادہ ہیں، عاجز و ناتوان رہیگا[۴]۔ جب تک انسان کو اپنی صحیح معرفت نہیں ہوگی، عالم خلقت میں وہ اپنی منزلت کو نہیں سمجھ پائے گا۔ وہ اپنے درد کو نہیں پہچان پائے گا اور جب درد کو نہیں جانے گا تو لا محالہ اس کے علاج سے بھی عاجز رہے گا۔

۲۔ صحیح انسانی شناخت کے عملی اثرات:

صحیح انسانی شناخت کے عملی اثرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱. عالمی حادثات کے سلسلہ میں انسانی سوچ اور اس کے رویہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۲. اپنی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی آشنائی جس کے نتیجہ میں انسان کی خود سے توقع معتدل رہتی ہے۔

۱۔ جعفری، محمد تقی، ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ج۱۹، ص ۱۶۳

۲۔ صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ العقلیہ، ج۸، ص ۳۴۳

۳۔ تمیمی آمدی، عبد الواحد، غرر الحکم و درر الکلم، ص ۲۳۳

۴۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۲۰، ص ۳۳۱

۳. شناخت و معرفت خدا کا مقدمہ ہے۔
۴. خود کی تعمیر کا موقع فراہم ہوتا ہے[1]؛ جیسا کہ الکسیس کارل کے نزدیک تعمیر نفس کا عملی فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوبارہ زندہ اور اس کی از سر نو تعمیر و اصلاح کرتا ہے۔[2]
۵. انسان "مجازی خودی" کو "حقیقی خودی" تصور نہیں کرتا اور خود سے بیگانہ نہیں ہوتا۔
۶. انسان اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور بلند و بالا مقاصد کو کشف کرکے انھیں شکوفا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
۷. انسان کی خود کی صحیح معرفت کا معنی یہ ہے کہ رشد، ترقی انسانی کمال اور کرامت انسانی کے حاصل کرنے کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں، انسان اسے صحیح طریقہ سے پہچانے اور اپنے اور دوسروں کے وجود سے ان موانع کو بر طرف کرے۔
۸. زندگی کو ایک مقصد حاصل ہوتا ہے، لغو، بے فائدہ اور خالی پن سے انسانی زندگی کو نجات ملتی ہے۔
۹. دوسرے انسانوں کے انسانی حقوق اور خاص کر ان کے حق کرامت پر خاص توجہ رہتی ہے اور ان کے حقوق پامال نہیں ہوتے۔
۱۰. انسان کی صحیح شناخت، یعنی خلقت کے اصلی مقصد سے آشنا ہونا؛ جب انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ تمام عالم ہستی اپنی تمام تر بزرگی و عظمت کے باوجود انسان کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس وقت وہ اپنے وجود کی عظمت و قیمت کو جان پائے گا اور اپنے مقام و منزلت کو بہتر درک کر پائے گا۔

جب انسان خود اور اپنی خلقت کے اصلی مقصد کو جان لیگا اور نظام خلقت میں اپنے صحیح مقام و رتبہ کو کشف کرلے گا، تو اس کے بعد دنیا اور اس کی رنگینیاں اسے خود سے غافل نہیں کر پائیں گی بلکہ وہ انسانیت کے بلند و بالا مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنی تمام سعی و کوشش کرے گا۔ لا تشغلھم عنھا زینة متاع ولا قرة عین من ولد ولا مال[3]۔ دنیا کے زرق و برق ایسے انسانوں کی آنکھوں کو چوندھیاتی نہیں ہیں اور اس

۱۔ شرفی، محمد رضا، جوان و بحران ہویت، ص ۳۳
۲۔ انسان موجود ناشناختہ، ص ۳۰۵
۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۹

کے تجملات اسے فریب نہیں دے پاتے ہیں؛ جیسا کہ امام علیؑ کی تعبیر کے مطابق بعض لوگ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو چکے ہیں: و لکنھم حلیت الدنیا فی اعینھم و راقھم زبرجھا[۱]۔

اگر انسان خود کو اور جس دنیا میں زندگی گزار رہا ہے اسے پہچان لے تو کبھی بھی اس کا بیٹا نہیں کہلائے گا: فکونوا من ابناء الآخرۃ ولاتکونوا من ابناءالدنیا[۲] اور اپنی اخرت کو بر باد کرکے اپنی دنیا کو آباد نہیں کرے گا؛ جیسا کہ بعض دنیا پرست لوگ اس مصیبت میں گرفتار ہیں: تعمر دنیاك بخراب آخرتك"۔[۳]

۳۔ نظام تخلیق میں انسان کا اپنی منزلت و رتبہ سے ناآشنا ہونا اور اس کے تباہ کن اثرات

اگر نظام تخلیق میں انسان اپنے مقام و منزلت کو نہیں پہچانے گا تو انسانی کرامت کے پیکر پر شدید و کاری ضرب لگے گی جس کی وجہ سے انسان مقام احسن تقویم سے گر کر اسفل سافلین تک پہنچ جائے گا۔ انسان کا اپنے وجود سے جاہل ہونا سبب ہوتا ہے کہ انسان اپنے وجود کی ذات و ماہیت سے پوری طرح بیگانہ ہو جائے اور کسی دوسری چیز کو "خودی" تصور کرے (خود سے بیگانگی)۔ مثال کے طور پر اپنے وجود کے کئی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو وہ پورا وجود تصور کرے اور دوسرے پہلوؤں سے غافل ہو جائے، یا انسان کو صرف مادی مخلوق مانے، یا اس کی تمام توجہ اپنے جسم اور نفس کی خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے میں ہو اور اپنے وجود کے روحانی اور الٰہی پہلو سے غافل ہو۔ ایسا انسان ممکن ہے ایک عمر تک کسی ایسے وجود کی پرورش کرتا آئے جس سے وہ پوری طرح انجان ہو۔ امیر المومنین حضرت علیؑ کی نگاہ میں نظام تخلیق میں انسان کا اپنے مقام و رتبہ کو پہچاننا اسے ہلاکت سے بچاتا ہے: ما ھلک من عرف قدرہ[۴]۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳

۲۔ ایضاً، خط ۴۲

۳۔ ایضاً، خط ۱۷

۴۔ غرر الحکم و درر الکلم، ص ۲۳۳

ایک دوسری روایت کے مطابق آپؑ کی نظر میں جو انسان خود سے جاہل ہو بھلے ہی وہ تمام دنیاوی علوم کا ماہر و جاننے والا کیوں نہ ہو در حقیقت وہ جاہل و نادان ہے۔ العالم من عرف قدرہ و کفی بالمرء جھلا الا یعرف قدرہ[۱]۔

مولانا روم ایسے انسانوں کی تشبیہ ایسے افراد سے دیتے ہیں جو اعلی قسم کا سامان اور بہترین کاریگروں کے ذریعہ اور بہت محنت و مشقت اور بے پناہ سرمایہ خرچ کرنے کے بعد ایک بہترین مکان تعمیر کرواتا ہے، اس مکان میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہوتی ہے۔ ہر لحاظ اور ہر جہت سے وہ مکان بہترین ہوتا ہے لیکن جس دن وہ اس مکان میں رہنے کا ارادہ کرتا ہے اسی دن اسے معلوم پڑتا ہے کہ جس زمین پر اس نے یہ مکان تعمیر کروایا ہے یہ زمین کسی اور کی ہے اور خود اس کی زمین اسی طرح سے ویران و بنجر پڑی ہوئی ہے۔

الف: **خودفروشی:** اگر انسان اپنے وجودی مقام و منزلت سے غافل ہو اور اسے نہ جانے تو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھے گا اور اپنے کو ارزاں فروخت کردے گا۔ امام علیؑ کے نزدیک انسان کی سب سے کم قیمت جنت ہے، اس سے کم میں اگر انسان خود کو بیچنے پر راضی ہوجائے تو یہ گھاٹے کا سودا ہے: انه لیس لانفسکم ثمن الا الجنة فلا تبیعوھا الا بھا[۲]۔

خود فروشی یعنی خود کو دنیا کے عوض بیچ دینا؛ دنیاوی مقام، دنیاوی شہرت، دنیاوی لذت، دنیاوی شہوت، دنیاوی دولت۔ بیشک یہی خسران مبین ہے: ولبئس المتجر ان تری الدنیا لنفسك ثمناً وممالك عند اللّٰہ عوضا"[۳]۔

بعض انسان اس قدر اپنی شان و منزلت کو گھٹادیتے ہیں کہ اپنے وجود جیسے قیمتی و نایاب گوہر کو کہ یہ عظیم کائنات جس کے لئے صرف ایک مقدمہ ہے، اسے بے ارزش چیز کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ امیر المومنینؑ ایسے انسانوں کو سب سے زیادہ احمق قرار دیتے ہیں: من الناس من یبیع نفسه بالدراھم

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۳
۲۔ ایضاً، حکمت ۴۵۴
۳۔ ایضاً، خطبہ ۳۲

والدنانیر و من الناس من یبیع نفسہ باحقر الاشیاء و اھونھا وھولاء فی الحقیقۃ احمق الناس ۔[1]

آنحضرت انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے حصہ میں وہ لوگ ہیں جو خود کو دنیا کے بدلے بیچ کر اپنے نفس کی تباہی و بربادی کا سبب بنتے ہیں، دوسرے حصہ میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی قمیت کو جانا اور اپنے آپ کو دنیا کی قید سے آزاد کرالیا : و الناس فیھا رجلان رجل باع نفسہ فاوبقھا و رجل ابتاع نفسہ فاعتقھا [2]۔

امام علیؑ کی نظر میں اگر کوئی دنیااور اس کی بزرگی وعظمت کا دلباختہ ہو تو وہ دنیا کا غلام بن چکا ہے: من عظمت الدنیا فی عینہ و کبر موقعھا من قلبہ آثرھا علی اللہ تعالی فانقطع الیھا و صار عبدا لھا۔[3] جن لوگوں نے اپنے آپ کو دنیا کے عوض بیچا اور اس کی غلامی کا طوق پہن لیا، ان لوگوں نے خود کو بزرگ و عظیم نعمت یعنی آزادی سے محروم کرلیا ہے۔آپؑ نے انسانوں کو اس طرح کی خرید و فروخت سے سخت منع کیا اور ہر قسم کی قید و بندش سے آزادی، انسان کا فطری حق جانا ہے: لا تکن عبد غیرك و قد جعلك اللہ حرا۔"[4] وہی چیز جو تمام انبیاء خاص کر حضرت ختمی مرتبتؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہے یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔[5]

ب: **لذت پرستی**: نظام تخلیق میں اپنے رتبہ کو نہ پہچاننے کا دوسرا نقصان لذت پرستی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانیت کے اعلی مقصد سے غافل ہوجاتا ہے۔ مکتب لذت پرستی کا ماننا ہے کہ انسان ہر چیز اور ہر کام کا انتخاب اپنی لذت کے مطابق کرتا ہے جو اس کی کامیاب زندگی کا آغاز و انجام ہوتا ہے[6] یعنی انسان صرف دنیاوی لذتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۲۰، ص ۱۷۳
۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۳۳
۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۶۰
۴۔ ایضاً، خط ۳۱
۵۔ سورہ اعراف، آیت ۱۵۷
۶۔ رہنمائی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم و تربیت، ص ۲۰۸

اس مکتب کے مطابق دنیا میں انسان کا مقصد صرف اس کی لذتوں سے بہرہ مند ہونا ہے اور دوسرے انسانی کمالات و فضائل جیسے ایثار، شہامت، درگذر کرنا، سخاوت، بخشش اور کرم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس مکتب میں کوئی ایسا نہیں ہے جو دنیاوی لذتوں کو چھوڑ کر انسانیت کی اعلی منزل پر پہنچ جائے؛ صرف وہی افراد اس مکتب کے پیروکار ہیں جن کا ہم و غم دنیاوی لذتوں کو حاصل کرنے اور عیش و عیاشی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ انسان کا اپنے مقام و منزلت سے ناواقفیت و جہالت ہے کہ اتنی عظیم کائنات اس کے لئے خلق ہوئی ہے۔ کیا یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسان چار دن یہاں لذتیں حاصل کرے اور اس کے بعد ہر چیز ختم ہو جائے؟! اگر مان بھی لیں کہ انسان لذت کا دیوانہ ہے تو کیوں صرف وقتی اور جلدی ختم ہونے والی لذتوں کے پیچھے ہے؟ کیوں وہ آخرت کی ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والی لذت کا خواہاں نہیں ہے؟!

امیر المومنین امام علیؑ کی نگاہ میں وہ لذت جو عذاب الٰہی اور آتش جہنم کا سبب بنے وہ لذت ہی نہیں ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی لذتوں کے علاوہ ہر لذت کمتر اور حقیر ہے: ما خیر بخیر بعدہ النار و ما شر بشر بعدہ الجنۃ و کل نعیم دون الجنۃ فھو محقور و کل بلاء دون النار عافیۃ"۔[1]

کتنا فاصلہ ہے مکتب لذت پرستی میں جو لذت کے علاوہ کسی اور چیز کا قائل ہی نہیں اور مکتب علوی میں جس کے نزدیک فانی اور جلد ختم ہو جانے والی لذتیں بے معنی و پوچ ہیں، وہ اس لائق نہیں ہیں کہ انسان ان سے دل لگائے: ما لعلی و لنعیم یفنی و لذۃ لا تبقی[2]۔

ج: **حیوان نما انسان**: بعض انسانوں کی زندگی کسی حیوان سے کم نہیں؛ یعنی زندگی سے انھیں وہی چاہئے ہوتا ہے جو ایک حیوان کو چاہئے۔ وہ انسان جس کی تمام کوشش اور توجہ صرف جسمانی خواہشوں جیسے کھانے اور پینے پر ہو یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام[3] تو اس کی زندگی ایک حیوانی زندگی سے زیادہ نہیں ہے جو انسانی کرامت و وقار سے میلوں دور ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۳۸۷

۲۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۳

۳۔ سورہ محمد، آیت ۱۲

امیر المومنینؑ کے نزدیک انسان کا مرتبہ اس سے سوا ہے کہ وہ حیوانوں کے طرح صرف کھانے کی فکر میں ہو اور اس کے علاوہ کچھ اور نہ سوچے۔ اتمتلی السائمة من رعیها فتبرك و تشبع الربیضة من عشبها فتربض و یاكل علی من زاده فیهجع قرت اذاعینه اذااقتدی بعدالسنین المتطاولة بالبهیمة الهاملة والسائمة المرعیة۔ کیا جس طرح بکریاں پیٹ بھر لینے کے بعد سینہ کے بل بیٹھ جاتی ہیں اور سیر ہو کر اپنے باڑے میں گھس جاتی ہیں، اسی طرح علی بھی اپنے پاس کا کھانا کھالے اور بس سوجائے۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو جائیں اگر وہ زندگی کے طویل سال گزارنے کے بعد کھلے ہوئے چوپاؤں اور چرنے والے جانوروں کی پیروی کرنے لگے۔[1]

آنحضرتؐ کے نزدیک انسان اس چیز سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے کہ وہ صرف اپنے پیٹ کو بھرنے کی فکر میں رہے اور اعلی انسانی مقاصد سے غافل ہو جائے: فما خلقت لیشغلنی اكل الطیبات كالبهیمة المربوطة همها علفها اوالمرسلة شغلها تقممها تكترش من اعلافها وتلهوعما یراد بها۔ میں اس لئے تو پیدا نہیں ہوا ہوں کہ اچھے اچھے کھانوں کی فکر میں لگا رہوں۔ اس بندھے ہوئے مغلوب جانور کی طرح جسے صرف اپنے چارے ہی کی فکر لگی رہتی ہے یا اس کھلے ہوئے جانور کی طرح جس کا کام منہ مارنا ہوتا ہے، وہ گھاس سے پیٹ بھر لیتا ہے اور جو اس کے ساتھ ہونے والا ہے، اس سے غافل رہتا ہے۔[2]

امام علیؑ پیغمبرؐ کے فریضہ رسالت کو بیان کرتے ہوئے آپ کو ایک ایسے طبیب سے تشبیہ دیتے ہیں جو گھر گھر جا کر روح کے بیماروں کا معالجہ کرتے ہیں۔ بعض روحانی بیمار جو علم و حکمت سے بے بہرہ ہیں اور صرف طبیعی و مادی زندگی کے خواہاں ہیں وہ چوپایوں کی مانند ہیں: فهم فی ذلك كالانعام السائمة والصخور القاسیة[3]۔

ایک دوسرے مقام پر آپ انسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: خدا رسیدہ عالم، راہ نجات پر چلنے والا طالب علم اور عوام الناس کا وہ گروہ جو ہر آواز کے پیچھے چل پڑتا ہے اور ہر ہوا کے ساتھ لہرانے لگتا

۱۔ نہج البلاغہ، خط ۴۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۰۸

ہے۔ اس نے نہ نور کی روشنی حاصل کی اور نہ کسی مستحکم ستون کا سہارا لیا ہے۔ تیسرے گروہ کو آپؑ نے چرنے والے حیوان سے تشبیہ کیا ہے: سلس القیاد للشھوۃ اومغرما بالجمع والادخار اقرب شیء شبھا بھما الانعام السائمہ۔[۱]

امام خمینیؒ کی نظر میں پیدا ہونے کے بعد انسان، حیوان بالفعل ہوتا ہے جو اپنی شہوت و غضب کو کنٹرول کرتا ہے اور اگر کسی مربی یا معلم کے زیر سایہ تربیت نہ پائے تو عجیب و غریب حیوان میں تبدیل ہو جاتا ہے جو صرف اپنے نفس کی پیروی کرتا ہے اور نیک اخلاق و خصال کا اس میں شائبہ تک نہیں ملے گا؛ بلکہ شمع فطرت الٰہی بھی اس کے وجود میں گل ہو گئی ہو گی اور تمام الٰہی و انسانی اقدار کو نفسانی اڑیل گھوڑے کی سموں تلے پامال کرتا چلا جائے گا اور آخرت میں حیوان یا شیطان کی صورت میں محشور ہو گا۔[۲]

وہ انسان جن کی زندگی کا مقصد جسمانی ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ ہو اگر وہ ہزاروں سال بھی زندہ رہیں تو ذرہ برابر بھی انسانیت و کرامت کو درک نہیں کر پائیں گے اور جتنا زیادہ زندہ رہیں گے خود کو حیوانیت سے نزدیک کرتے رہیں گے کیونکہ انہوں نے تمام انسانی وجود کو حیوانیت اور حیوانی ضرورتوں کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ ایسے افراد امام علیؑ کی نظر میں وہ مردہ ہیں جو زندوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں: وذلك میت الاحیاء[۳]۔ جیسا کہ آپؑ کی نگاہ میں ہر وہ انسان جس کے پاس دل وہ اہل درک و خرد نہیں ہے: و ما کل ذی قلب بلبیب ولا کل ذی سمع بسمیع ولا کل ناظر ببصیر[۴]۔

آپؑ بعض انسانوں کو صرف پرچھائیں مانتے ہیں جو انسانی روح سے خالی ہیں اور ان نابینا افراد کے مانند ہیں جو حقیقت کو دیکھنے سے محروم ہیں: ما لی اراکم اشباحا بلا ارواح و ارواحا بلا اشباح و نساکا بلا صلاح و تجارا بلا ارباح و ایقاظا نوما و شھودا غیبا و ناظرۃ عمیاء وسامعۃ صماء و

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

۲۔ شرح چہل حدیث، ص ۱۶۸۔۱۶۹

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۷

۴۔ ایضاً، خطبہ ۸۸

ناطقة بكماء[1]۔

اور چونکہ پوری طرح خدا سے انکا رابطہ ٹوٹ چکا ہے لہٰذا ان کا ظاہر تو انسان جیسا ہے لیکن ان کی روح حیوانی ہے۔ فالصورة صورة انسان و القلب قلب حیوان [2]۔ شہید مطہریؒ کی تعبیر کے مطابق روحانی و معنوی اعتبار سے وہ مسخ ہو کر ایسے حیوان میں تبدیل ہو چکے ہیں کہ عالم حیوان میں بھی اس جیسا متعفن و کثیف وجود نہیں پایا جاتا ہے: بل هم اضل [3]۔ آپ کی نظر میں اگر کسی انسان کی اخلاقی و نفسیاتی خصوصیتیں، کسی درندہ کی خصوصیتوں میں بدل جائے تو ایسے انسان کی روح حقیقت میں مسخ ہو کر حیوان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔[4]

عالم ہستی کی صحیح شناخت و معرفت نہ ہونا:

یہ عالم ہستی جو انسان کے رشد و ترقی و اعلی انسانی کمال تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے یہ اس صورت میں اپنے فرض پر عمل کر سکتا ہے جب اس کے سلسلہ میں انسان کی سوچ اور نقطہ نظر صحیح ہو اور عالم ہستی کے سلسلہ میں اس کی معرفت حقیقت کے مطابق ہو؛ ورنہ ممکن ہے ترقی کے بجائے اس کی تنزلی و پسماندگی کا زمینہ فراہم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم ہستی کے سلسلہ میں انسان کا زاویہ نگاہ اور ذہنیت بلند انسانی مقاصد تک پہنچنے میں نہایت موثر ہیں۔ دنیا کے بارے میں انسان کا صحیح تصور اس سے صحیح فائدہ حاصل کرنے اور غلط تصور غلط فائدہ اٹھانے کا سبب بنتا ہے۔ اس حصہ میں ہم نہج البلاغہ کی روشنی میں عالم ہستی کے بارے میں انسان کے غلط تصور کو بیان کریں گے کہ اس دنیا میں اس کی روش زندگی، اس کے افکار و کردار سب اسی غلط تصور کی وجہ سے ہیں۔ اگر انسان خلقت کے بلند مقاصد و انسانی کرامت کے اعلی درجہ تک نہیں پہنچ پاتا ہے تو سب اس دنیا کے سلسلہ میں اس کے غلط تصور کا نتیجہ ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۸

۲۔ ایضاً

۳۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹

۴۔ مطہری، مرتضی، انسان کامل، ص ۲۴۔ ۲۵

محض مادی زندگی:

بعض انسان عالم ہستی کو محض مادی زندگی کے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور صرف مادی زندگی کے خواہاں ہیں اور اس زندگی کے ماورا کسی دوسری زندگی کے بارے میں نہیں سوچتے ہیں۔ظاہر ہے ایسے افراد اپنی پوری طاقت اس مادی زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں صرف کریں گے اور زندگی کے دوسرے پہلو یعنی اس کے معنوی اقدار سے پوری طرح غافل رہیں گے۔ ان لوگوں کے اعمال ایسے ہیں گویا اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا نہیں ہے؛ حالانکہ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ دنیا آیا ہے وہاں اسے دنیاوی زندگی کی ایک صفت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ الحیاۃ الدنیا، نزدیک زندگی کے معنی میں مذکور ہے۔مذکورہ بالا باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان دنیا کو اصلی گھر اور حقیقی ٹھکانہ قرار دے تو یہ دنیا اس کے لئے نہایت خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوگی؛ لیکن اگر وہ خود کو اس دنیا میں ایک مسافر سمجھے تو یہ دنیا اس کے لئے فائدہ مند ہوگی؛ کیونکہ مسافر ہمیشہ اپنے اصلی گھر اور وطن جانے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور خود کو ہمیشہ واپسی کے لئے تیار و آمادہ رکھتا ہے اور کبھی بھی راستہ کو منزل نہیں بناتا ہے۔ انسان کی زیادہ تر مشکلوں کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو ہی اپنا اصلی وطن سمجھتا ہے حالانکہ اگر دنیا کا پڑاو ہونا انسان کے لئے واضح اور روشن ہو تو اتنی خیانتیں، فتنہ و فساد، جنگ و خونریزی دنیا کی خاطر نہ ہوتی۔

انسان کے مادہ پرست اور حقیقت سے گریزاں ہونے کے عوامل:

یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیوں بعض انسان مادی زندگی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں اور حقیقت سے روگردان ہو کر اپنے اس انتخاب سے انسانی کمالات و فضائل تک پہنچنے سے محروم ہو جاتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عصر رنسانس اور علم کی بے نظیر ترقیوں کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم تمام مشکلات کا حل ہے اور انسان اپنے تمام سوالوں کے جوابات کو تجربہ سے حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجہ میں دھیرے دھیرے وہ دین و وحی اور الٰہی تعلیمات سے دور ہوتا گیا۔

انسان اگر یہ سوچے کہ علمی اور فکری لحاظ سے وہ پوری طرح مستقل ہے اور الٰہی و وحیانی تعلیمات سے بے نیازی کا احساس کرنے لگے تو اس کا انجام اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا ہے۔ وحی سے بے نیازی کا احساس اسے سرکش بنادیتی ہے:

ان الانسان لیطغی ان راہ استغنی[۱]۔ آلبر کاموکے نزدیک انسانی حیات کا فلسفہ مذہب ہے جسے لوگ اندیکھا کر دیتے ہیں[۲]۔ ماکس پلانک کے نزدیک بھی ماہرین علم فیزیک ان افراد کے مانند ہیں جو خطوط و نقوش کو پڑھتے تو ضرور ہیں لیکن ان خطوط کے ماوراجو حقیقت ہے وہ اس سے غافل ہیں[۳]۔یہ دنیا اپنی تمام وسعت کے باوجود خطوط و نقوش کے مانند ہے جس کی تفسیر کو اس کے خالق سے سیکھا جائے۔ رسل انسانوں کی تشبیہ پیدائشی بہرے بچوں سے دیتے ہیں جو کچھ موسیقی دانوں کے درمیان بڑے ہوئے ہیں اور موسیقی کی بعض نوٹ (Note) کو پہچان پاتے ہیں اور ہر نوٹ ان کی ظاہری مشاہدوں سے مربوط ہے لیکن موسیقی کی اہمیت اور کس طرح سے یہ وجود میں آتی ہے ان کے لئے ہر گز قابل درک و فہم نہیں ہے۔ رسل کے نزدیک طبیعت کے سلسلہ میں علم انسان بھی اسی طرح ہے وہ طبیعت کے نوٹس (Notes) کو تو سمجھ لیتا ہے اور اس کے ریاضی و فیزیک رابطوں کو جان لیتا ہے لیکن ان نوٹس کے پیچھے طبیعت کے کون سے اسرار نہفتہ ہیں وہ اسے کبھی نہیں جان پاتا ہے۔[۴]

بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ وہ لوگ جو مادی و طبیعی زندگی کو انسانی خلقت کا ہدف قرار دیتے ہیں وہ سب سے زیادہ غافل انسان ہیں[۵] چونکہ یہ افراد اپنی گمشدہ چیز کو اس خاکی عالم میں تلاش کر رہے ہیں جبکہ ان کی گمشدہ چیز کسی دوسرے عالم میں ہے۔یہ کہ انسان صرف مادی زندگی کے درپئے ہو یا اس مادی زندگی کو وسیلہ بنا کر ماورائے طبیعت کی جانب سیر کرے یہ انسان کے عزم وارادہ و حوصلہ اور دوراندیشی پر منحصر ہے۔ بعض لوگوں کی دیکھنے کی قدرت اتنی محدود ہے کہ دنیا کے علاوہ انھیں کچھ اور نظر نہیں آتا ہے لیکن بعض اپنی بصیرت، دوراندیشی اور تیز بینی کی وجہ سے مادی و طبیعی زندگی کو اس عظیم و وسیع کائنات کا ایک چھوٹا اور معمولی جز مانتے ہیں۔

۱۔ سورہ علق، آیات ۶۔۷

۲۔ ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ص۷۷

۳۔ ایضاً، ص ۷۴

۴۔ رسل، برتراند، مفہوم نسبیت انشتین، ص ۲۳۳

۵۔ ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ص۸۵

دنیا کو استقلال کی نظر سے دیکھنا

دنیا کو دیکھنا آئینہ کو دیکھنے کے مانند ہے؛ کبھی انسان خود آئینہ کو استقلالی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اسے آئینہ میں دکھنے والی تصویر سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ممکن ہے اس نگاہ میں اس کی توجہ آئینہ کی کیفیت، اس کی شفافیت، آئینہ کی بناوٹ و خوبصورتی پر ہو، اسے ابھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ خود اس کی تصویر اس آئینہ میں کیسی دکھ رہی ہے چونکہ استقلالی حیثیت سے آئینہ کو دیکھنا اسے دوسری جانب توجہ کرنے نہیں دے رہی ہے۔ لیکن اگر توجہ آئینہ میں دکھنے والی تصویر کی جانب ہو اس صورت میں خود وہ آئینہ کیسا ہے اس سے غافل ہو جائے گا۔ دنیا کی بھی یہی خصوصیت ہے بعض لوگ دنیا کو استقلالی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان کی تمام توجہ کا مرکز صرف دنیا ہوتی ہے۔ ایسے افراد دنیا کے وسیلہ ہونے اور خلقت کے بلند و بالا مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بعض ایسے بھی افراد ہوتے ہیں جو دنیا کو بلند و بالا مقصد کے حصول کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ ایک چھوٹے سے جملے میں دنیا کی حقیقت اور اس کے وسیلہ ہونے کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان فرماتے ہیں: و من ابصر بها بصرته و من ابصر اليها اعمته، جو دیدہ عبرت سے دنیا کی جانب دیکھتا ہے تو دنیا اسے حقیقت سے روشناس کراتی ہے اور جو اس کی رنگینیوں میں مدہوش ہو جاتا ہے تو دنیا اسے اندھا کر دیتی ہے[1]۔

میرزا حبیب اللہ خوئی اس جملہ کے سلسلہ میں بیان فرماتے ہیں: جو دنیا کو خود سے آشنا ہونے کے لئے وسیلہ اور آئینہ کے طور پر استعمال کرے اور اعلی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسے سیڑھی بنائے تو دنیا اسے صاحب بصیرت کر دیتی ہے لیکن جس کی ساری توجہ صرف اور صرف دنیا کا حصول ہو اور دنیا ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیتا ہے تو دنیا اسے اندھا کر دیتی ہے۔[2]

نہج البلاغہ کے ایک دوسرے فراز میں کس طرح سے دنیا مقصد قرار پاتی ہے اسے آپؑ اس طرح بیان فرماتے ہیں: فان الدنيا مشغلة عن غيرها و لم يصب صاحبها منها شيئا الا فتحت له حرصا عليها و لهجا بها و لن يستغني صاحبها بما نال فيها عما لم يبلغه منها و من وراء ذلك فراق

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۲

۲۔ ہاشمی خوئی، میرزا حبیب اللہ، منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ، ج۵، ص۳۴۰

ما جمع و نقض ما ابرم و لو اعتبرت بما مضی حفظت ما بقی۔ دنیاآخرت سے روگرداں کردینے والی ہے اور جب دنیا اور اس سے کچھ تھوڑا بہت پالیتا ہے تو وہ اس کے لئے اپنی حرص و شیفتگی کے دروازہ کھول دیتی ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ اب جتنی دولت مل گئی اس پر اکتفا کرے اور جو ہاتھ نہیں آیا اس سے بے نیاز رہے۔ حالانکہ نتیجہ میں جو کچھ جمع کیا ہے اس سے جدائی اور جو کچھ بندوبست کیا ہے اس کی شکست لازمی ہے اور اگر تم گذشتہ حالات سے عبرت حاصل کرو تو باقی عمر کی حفاظت کر سکوگے۔[1]

شہید مطہریؒ ہر اس چیز کو جو انسان کو جکڑ کر محو کردے اسے انسانی شخصیت کے خلاف جانتے ہیں جو اسکے جمود کا سبب ہے۔ دنیا کے ساتھ انسان کا رابطہ اگر وابستگی اور وارفتگی کا ہو تو تمام انسانی اقدار نابود و فنا ہو جائیں گے۔[2]

لہٰذا اگر دنیا اور اس کی تمام تر رعنائیاں اس طریقہ سے ہوں کہ انسان کو خود میں مشغول کردے اور انسانی خلقت کے اعلی مقصد یعنی انسانی کرامت تک پہونچنے میں اس کی راہ کی رکاوٹ بنے اور اسے مقصد کے طور پر دیکھا جائے تو ایسی دنیا نہ صرف یہ کہ انسان کی ترقی کا سبب نہیں ہوگی بلکہ یہ انسان کے لئے مضر اور نقصان دہ بھی ہے۔ لیکن اگر انسانی کرامت کے مرتبہ تک پہونچنے کے لئے اسے وسیلہ اور زینہ کے طور پر دیکھا جائے تو یہ دنیا پسندیدہ و مطلوب ہے۔ پھر اس دنیا میں گزارا ایک ایک لمحہ انسان کو اس کے عالی مقصد سے نزدیک کرتا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ میں ایسی دنیا کی مذمت نہیں ہوئی ہے بلکہ اس دنیا کو سراہا گیا ہے۔ حضرت علیؑ نے جب سنا کہ ایک شخص دنیا کو نہایت برا بھلا بول رہا ہے تو آپ نے غصہ کے عالم میں اس سے فرمایا: ان الدنیا دار صدق لمن صدقھا و دار عافیة لمن فھم عنھا و دار غنی لمن تزود منھا و دار موعظة لمن اتعظ بھا مسجد احباءالله ومصلی ملائکةالله ومھبط وحیالله ومتجراولیاءالله اکتسبوا فیھاالرحمة وربحوا فیھا الجنة۔ بلا شبہ دنیا اس شخص کے لئے سچائی کا گھر ہے جو اس کا یقین کرے، اور جو اس کی ان باتوں کو سمجھے اس کے لئے امن و عافیت کی منزل ہے اور جو اس سے زاد راہ حاصل کرے، اس

۱۔ نہج البلاغہ، خط ۴۹

۲۔ مطہری، مرتضی، سیری در نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۲۶۴

کے لئے دولتمندی کی منزل ہے اور جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لئے وعظ و نصیحت کا محل ہے۔ وہ دوستان خدا کے لئے عبادت کی جگہ، اللہ کے فرشتوں کے لئے نماز پڑھنے کا مقام وحی الٰہی کی منزل اور اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔ انھوں نے اس میں فضل و رحمت کا سودا کیا اور اس میں رہتے ہوئے جنت کو فائدہ میں حاصل کیا۔[1]

دنیا کو بدبختی کا ذریعہ سمجھنا

بعض فلاسفہ دنیا کی سیاہ و تاریک تصویر کھینچتے ہیں۔ درد و رنج و بدبختی کے علاوہ جس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک دنیا جہنم کے مانند ہے جس میں انسان قید ہیں اور فرار کی ساری راہیں مسدود ہیں۔ ابو العلاء معری (۳۸۴۔۴۴۹، ۹۹۴۔۱۰۵۷) دنیا کو سراسر رنج و زحمت، ناکامی و بدبختی کا سرچشمہ جانتے ہیں جس میں وقت گذارنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے[2]۔ ایسی دنیا جس میں زندگی گزارنا ایک مہلک بیماری اور ٹھہرنا عذاب ہے[3]۔ ان کے نزدیک نسل کو آگے بڑھانا ناقابل معافی گناہ ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو یہ نصیحت کرتے تھے کہ بانجھ عورتوں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے شادی نہ کریں، ان کے نزدیک بہترین عورت، بانجھ عورت ہے[4]۔ یہی وجہ ہے انھوں نے تادم مرگ شادی نہیں کی اور اس بات پر انھیں ذرہ برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی اولاد سے نعمت عدم کو نہیں چھینا جو کہ دنیاوی نعمت پر برتری رکھتی ہے؛ چونکہ اگر وہ اس دنیا میں آتے تو انھیں رنج و بدبختی کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا۔[5] ان کے نزدیک وہ ماں باپ مجرم ہیں جنھوں نے اولاد کو جنم دے کر اپنی اولاد کے حق میں ظلم کیا ہے، بھلے ہی وہ اولاد آگے چل کر امیر یا توانا خطیب بن جائے۔[6]

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۳۱
۲۔ فروخ، عمر، عقائد فلسفی ابو العلاء فیلسوف معرہ، ص ۵۸ و ۲۲۴
۳۔ ایضاً، ص ۱۱۳، ۱۳۳، ۱۳۹ و ۲۴۸
۴۔ عقائد فلسفی ابو العلاء فیلسوف معرہ، ص ۲۰۵۔۲۰۴
۵۔ ایضاً، ص ۲۲۸
۶۔ ایضاً، ص ۲۲۲

شوپنھاور بھی دنیامیں زندگی گزارنے کو سب سے بڑی بدبختی جانتے ہیں جس کاازالہ خودکشی کرنے سے بھی نہیں ہوگا۔ شوپنھاور کے نزدیک تنہاایک حقیقت موجود ہےاور وہ درد ورنج والم ہے[۱]۔دنیا ایک ایسا جہنم ہے جو دانتہ کے جہنم سے بدتر ہے اور زندگی وہ گناہ ہے جس کا کفارہ صرف موت کی تکلیف کو برداشت کرکے ہوسکتاہے۔[۲]

دنیاکو دیکھنے کے حوالہ سے انسانوں میں فرق

انسانوں میں جوفرق پایاجاتا ہےوہ اس بات پر منحصر ہے کہ دنیاکے بارے میں ان کا نظریہ کیاہے۔ دنیاکے سلسلہ میں جو بدگمان ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ دنیاکی غلط تصویر اس کے ذہن میں ہے۔اگر اس تصویر کو صحیح کردیاجائے تو تمام مصیبتوں، سختیوں، مشکلات، ناکامیوں اور درد ورنج والم کے باوجود اسے دنیا خوبصورت وحکیمانہ لگے گی: الذی احسن کل شی ءخلقہ[۳] جیسا کہ حضرت یوسف نے قید خانہ کو تمام سختیوں، مشکلات اور شکنجوں کے باوجود پسندیدہ بتلایا: رَبِّ السِّجنُ اَحَبُّ اِلی مِمّا یَدعُونَنِی اِلَیہِ[۴] اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا کربلاکے تمام مصائب وآلام کو خوبصورت بتلاتی ہیں[۵]۔دنیاکی صحیح معرفت اور اس کے فلسفہ اور حکمت سے آشنائی اس کی تمام مشکلات اور سختیوں اورپریشانیوں کوخوبصورت بنادیتی ہیں۔

ابو العلاء معری اور شوپنہاور جیسے لوگ جنھوں نے دنیا سے بدگمانی اور مایوسی کے نظریہ کوفروغ دیا ہے ان افراد کا اصلی درد یہ ہے کہ انھیں دنیاکی صحیح شناخت ومعرفت نہیں ہوسکی ہے؛ کیونکہ اگر وہ فلسفۂ تخلیق سے آشنا ہوجاتے تو اس طرح دنیاکے مصائب وآلام کا مرثیہ نہ پڑھتے۔اگر وہ یہ جان جاتے کہ انسان کے کمال تک پہنچنے کا راستہ دنیاکی مشکلات اور سختیوں سے ہوکر گذرتا ہے[۶] اور دنیاآرام وعیش وعشرت کی

۱۔ توماس، ھنری وتوماس دانالی، ماجراھای جاودان در فلسفہ ، ص۳۲۰۔۳۱۸

۲۔ ایضاً، ص۲۷۸

۳۔ سورہ سجدہ، آیت ۷

۴۔ سورہ یوسف، آیت ۳۳

۵۔ مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، ج۱۴، ص۱۱۵

۶۔ لقد خلقنا الانسان فی کبد(سورہ بلد، آیت ۴)

جگہ نہیں ہے[1] تو وہ کبھی بھی دنیا کی مشکلات اور پریشانیوں کو دیکھ کر گھبراتے نہیں۔ اگر وہ فلسفۂ خلقت انسان اور کمال و ترقی کی منزل کو طے کرنے کے لئے انسان کا امتحان سے گزرنے اور مشکلات و سختیوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت سے واقف ہوتے تو وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کو بھی درک کر پاتے اور بے جا شکوہ نہ کرتے:

و لکن الله یختبر عباده بانواع الشدائد و یتعبدهم بانواع المجاهد و یبتلیهم بضروب المکاره اخراجا للتکبر من قلوبهم و اسکانا للتذلل فی نفوسهم و لیجعل ذلک ابوابا فتحا الی فضله و اسبابا ذللا لعفوه؛

ترجمہ: لیکن اللہ سبحانہ، اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجالائی گئی ہو اور انھیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے اور یہ کہ اس ابتلا و آزمائش سے اپنے فضل و امتنان کے کھلے ہوئے دروازوں تک انھیں پہنچائے اور اسے اپنی معافی و بخشش کا آسان وسیلہ و ذریعہ قرار دے۔[2]

کوتاہ فکری و تنگ نظری سب سے بڑا المیہ

بعض انسانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے سلسلہ میں تنگ نظری اور کوتاہ فکری کا شکار ہیں جس کا نتیجہ کھوکھلا پن اور بے مقصد زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؛ جیسا کہ پروفیسر یونگ بیان کرتے ہیں کہ پوری دنیا سے جتنے بھی مریض میرے پاس آتے ہیں ان میں سے دو تہائی وہ افراد ہیں جو پڑھے لکھے اور کامیاب لوگ ہیں لیکن خالی پن اور بے مقصد زندگی کے درد میں مبتلا ہیں۔[3]

اگر دنیا اور اس میں رہنے والے افراد کو انسان مثبت نظر سے نہ دیکھے تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ دنیا ایک قید خانہ ہے اور اس میں رہنے والے تمام افراد معمولی سے بازیچہ سے بڑھ کر نہیں ہیں[4]۔ اگر انسان اس

۱۔ دار بالبلاء محفوفة و بالغدر معروفة لا تدوم احوالها و لا یسلم نزالها احوال مختلفة و تارات متصرفة العیش فیها مذموم، نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۶

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۰

۳۔ نصری، عبداللہ، فلسفہ آفرینش، ص۱۹۸

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۵ اور ۱۸۰

عالم کے نظام کو حکمت سے خالی جانے تو ایسا انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ شہید مطہری کے بقول وہ خود کو دنیا سے پوری طرح انجان پاتا ہے جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ یہاں ایک قیدی کی مانند ہے جس کی پوری کوشش قید خانہ سے فرار ہونے کی ہوتی ہے۔[۱]

ہر طرح کی مشکلات، سختیاں، ظلم وجنگ وجنایت و بربریت کے باوجود اگر کچھ لوگ اس دنیا کی منصفانہ حکمتوں کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو یہ ان کی فکر اور فہم کی کوتاہی ہے۔ کسی چیز کا نہ ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ چیز موجود نہیں ہے۔ اگر ہم نابینا یا کم بینا ہیں تو یہ دلیل نہیں ہے کہ حقیقت بھی موجود نہیں ہے۔ بعض ایسے انسان ہوتے ہیں جن کے کانوں تک حق کی آواز نہیں پہنچتی ہے: وقر سمع لم یفقه الواعیة وکیف یراعی النباۃ من اصمته الصیحه[۲]۔ حقیقت میں یہ لوگ آنکھوں والے اندھے اور کانوں والے بہرے ہیں: ناظرۃ عمیاء وسامعة صماء[۳]۔

کوتاہ فکر فلاسفہ اور ان کے پیروں کاروں کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کے صرف ایک رخ کو دیکھ کر پوری ہستی کے سلسلہ میں فیصلہ سنا دیا! انھیں عالم ہستی کی حکمت، نظام اور عدل و انصاف پر اعتراض ہے حالانکہ عالم ہستی کا ایک وسیع حصہ یعنی عالم آخرت کو انھوں نے ابھی درک بھی نہیں کیا ہے۔ یقیناً اگر ان کی چشم بصیرت وا ہوتی اور وہ عالم مادہ سے ماورا کی حقیقتوں کو درک کر پاتے تو وہ ان اہل ذکر کے مانند ہوتے جن کی توصیف میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ یہ شکوہ نہیں کرتے پھرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی حکمت نہیں ہے:

فکانما قطعوا الدنیا الی الآخرۃ وهم فیها فشاهدوا ما وراء ذلك فکانما اطلعوا غیوب اهل البرزخ فی طول الاقامة فیه وحققت القیامة علیهم عداتها فکشفوا غطاء ذلك لاهل الدنیا حتی کانهم یرون مالا یری الناس ویسمعون مالا یسمعون۔

ترجمہ: گویا انھوں نے دنیا میں ہوتے ہوئے آخرت تک منزل کو طے کر لیا اور جو کچھ دنیا کے عقب میں ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور گویا وہ اہل برزخ کے ان چھپے ہوئے حالات سے جو ان کے طویل

۱۔ سیری در نہج البلاغہ، ص ۲۰۸

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۴

۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۰۸

عرصہ قیام میں پیش آیا ہے، آشنا ہو چکے ہیں اور گویا قیامت نے ان کے لئے اپنے وعدوں کو پورا کر دیا اور انھوں نے اہل دنیا کے سامنے ان چیزوں پر سے پردہ الٹ دیا یہاں تک کہ گویا وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں جسے دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے اور وہ سب کچھ سن رہے ہیں جسے دوسرے نہیں سن سکتے[1]۔

اگر وہ حقیقی زندگی کو اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں تلاش کرتے تو انھیں دنیا بے مقصد اور پوچ نہیں لگتی۔ ان لوگوں کی مثال "مثنوی معنوی" کے اس ہاتھی کی طرح ہے کہ لوگوں نے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا اور رات کی تاریکی میں ہاتھی کو چھو کر سب ہاتھی کے سلسلہ میں اپنی اپنی رائے دے رہے تھے حالانکہ واقعی ہاتھی ان کے نظریات سے بالکل مختلف تھا۔ وہ لوگ جو نظام تخلیق کے سلسلہ میں مایوسانہ نظریہ رکھتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے وجود کی تاریکی میں عالم کا مشاہدہ کیا ہے اور اسی وجہ سے صحیح طور پر عالم کی حقیقت کو درک نہیں کر سکے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کو شمع نور الٰہی سے محروم کر رکھا ہے جس کی روشنی میں عالم ہستی کے تمام زاویہ (دنیا و آخرت) قابل مشاہدہ ہیں اور اپنی کوتاہ فکر سے وہ تمام حقائق کو کشف کرنا چاہتے ہیں اور جب وہ اس کام میں ناکام ہو گئے تو انھوں نے دنیا پر بے مقصد، بے ہدف اور بے حکمت ہونے کی تہمت لگا دی۔

بہ طور خلاصہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اور عالم ہستی کی شناخت و معرفت انسان کی باطنی شخصیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے جو انسان کی ترقی و رشد یا اس کی تنزلی و سقوط کا سبب بن سکتی ہے؛ چونکہ انسان اپنی معرفت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ انسان کی ناقص و غلط معرفت رکھنا، انسانی کرامت کے مرتبہ تک پہنچنے میں اس کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کبھی بھی بارور نہیں ہونے دے گی۔ خود کی غلط تصویر کھینچنے کے سبب وہ ساری عمر ایسی شخصیت کو پروان چڑھانے میں گزار دے گا جو اس کے وجود سے بالکل بیگانہ وانجان ہے۔ اپنے حقیقی مقام و رتبہ کو نہ پہچاننے کے سبب ممکن ہے عالم ہستی میں دنیا اور اس کی لذتوں کو وہ اپنا نصب العین بنا لے اسی طرح سے اگر انسان جہان ہستی کو مستقل حیثیت عطا کرے یا مایوسی و محرومی کی نگاہوں سے اسے دیکھے تو اس طرز فکر کی وجہ سے وہ ان

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۹

سنہرے موقعوں سے غافل ہو جاتا ہے جو دنیا اسے عطا کرتی ہے تاکہ وہ انسانی کرامت کے عالی ترین مقام و رتبہ کو حاصل کرلے جس کے نتیجہ میں وہ قافلہ انسانیت سے بچھڑ جائے گا۔

منابع و مآخذ

- ❖ قرآن کریم
- ❖ نہج البلاغہ
- ❖ ابن ابی الحدید معتزلی، عبدالحمید، شرح نہج البلاغہ، انتشارات کتابخانہ مرعشی نجفی، قم، ۱۴۰۴
- ❖ ابن عربی، محی الدین، الفتوحات المکیہ، دار صادر، بیروت
- ❖ ابن منظور، مکرم، لسان العرب، دارالفکر، دار صادر بیروت، ۱۴۱۴ھ ق
- ❖ امام خمینی، سید روح اللہ، شرح چہل حدیث، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۸۴
- ❖ امام خمینی، سید روح اللہ، شرح چہل حدیث، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۵
- ❖ تمیمی آمدی، عبدالواحد، غرر الحکم و درر الکلم، انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۶۶
- ❖ توماس، ہنری و توماس دانالی، ماجراھای جاودان در فلسفہ، ترجمہ دکتر احمد شہسا، ققنوس، تہران، ۱۳۵۰
- ❖ جعفری، محمد تقی، ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۷۶
- ❖ جعفری، محمد تقی، فلسفہ و ہدف زندگی، مؤسسۂ تنظیم و نشر آثار علّامہ جعفری، تہران، ۱۳۸۵
- ❖ جوادی آملی، عبداللہ، امام خمینی و کرامت انسان، کرامت انسان (نشریہ ھمایش بین المللی امام خمینی و قلمرو دین (کرامت انسان))، شمارہ ۱، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۸۶
- ❖ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن، ج ۱۵، اسراء، ۱۳۸۴، قم
- ❖ جوادی آملی، عبداللہ، صورت و سیرت انسان در قرآن، اسراء، قم، ۱۳۹۰
- ❖ راسل، برتراند، مفهوم نسبیت انیشٹین، امیر کبیر، تہران، ۱۳۴۳
- ❖ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دار العلم الدار الشامیہ، دمشق بیروت، ۱۴۱۲ھ ق
- ❖ رہنمائی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم و تربیت، مؤسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی، قم، ۱۳۸۸
- ❖ سعدی، مشرف بن مصلح، بوستان سعدی، تصحیح و حواشی استاد عبدالعظیم قریب و دکتر یحیٰی قریب، روزبہان، تہران، ۱۳۸۴
- ❖ شرفی، محمد رضا، جوان و بحران ہویت، سروش، تہران، ۱۳۸۹

- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ العقلیہ، ج ۳، دار احیاء التراث، بیروت، ۱۹۸۱
- طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، انتشارات اسماعیلیان، قم، ۱۴۱۷
- علی ابن ابی طالبؑ، دیوان امام علیؑ، پیام اسلام، قم، ۱۳۶۹
- فروخ، عمر، عقائد فلسفی ابو العلاء فیلسوف معرہ، ترجمہ حسین خدیو جم، فیروزہ، تہران، ۱۳۸۱
- کاپلستون، فردریک، تاریخ فلسفہ، ترجمہ اسماعیل سعادت و منوچہر بزرگمہر، سروش، تہران، ۱۳۸۰
- کارل، الکسیس، انسان موجود ناشناختہ، ترجمہ پرویز دبیری، شرکت افست، تہران، ۱۳۴۵
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، مؤسسہ الوفاء، بیروت، ۱۴۰۴ھ ق
- مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن، انتشارات وزارت ارشاد، تہران، ۱۴۱۶ھ ق
- مطہری، مرتضی، انسان کامل، صدرا، تہران، ۱۳۸۵
- مطہری، مرتضی، سیری در نہج البلاغہ، صدرا، تہران، ۱۳۸۴
- مولوی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، نشر علم، ۱۳۸۳
- نصری، عبد اللہ، فلسفہ آفرینش، نشر معارف، قم، ۱۳۸۲
- ہاشمی خوئی، میرزا حبیب اللہ، منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ، ، مکتبۃ الاسلامیہ، تہران، ۱۳۸۵

سماجی برائیوں پر قابو پانے میں مراتب دینداری کا رول۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں

مؤلف: ڈاکٹر محمد باقر آخوندی
مترجم: مولانا عابد رضا نوشاد

متعدد قرآنی آیات اور سماجی تجربوں کے مطابق دینداری، سماجی برائیوں سے بچاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دینداری کی اس خصوصیت کے باوجود بعض دیندار افراد کجروی کا شکار کیوں نظر آتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض اوقات دینداری نہ صرف یہ کہ انسان کو برائیوں سے نہیں روکتی بلکہ سماجی مشکلات وانحرافات کی نئی نئی شکلوں کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے؟

اس تحریر کا مقصد قرآنی آیات اور کتب تفسیر سے اس سوال کا جواب حاصل کرنا ہے۔ نتائج سے واضح ہوتا ہے کہ فوق الذکر سوال کا اصل جواب دینداری کے درجاتی ہونے میں نہفتہ ہے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ دینداری کے کم از کم سات مراتب و درجات ہیں۔ پہلے مرتبہ میں ایمان کی کمزوری کی بنیاد پر سماجی برائیوں کے امکانات زیادہ ہوجاتے ہیں۔ پہلے مرتبہ سے گذرنے کے بعد، ان سے بالاتر مراتب و درجات میں دینداری میں استحکام آجاتا ہے۔

تجربات اور تحقیقات کے مطابق جن کی تائید قرآنی آیات سے بھی ہوتی ہے، جتنی زیادہ دین کی پابندی ہوتی ہے، سماجی برائیوں میں بھی اتنی ہی کمی آتی ہے اور اس کے برخلاف دین کی پابندی میں کمی کے ساتھ ساتھ سماجی برائیوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، دینی معتقدات کی تقویت سے جرائم میں کمی آتی ہے اور اس کی کمزوری سے سماجی مشکلات اور برائیوں میں اضافہ ہوتا ہے[1]۔

۱۔ صدیق سروستانی، رحمت اللہ، آسیب شناسی اجتماعی در ایران، ص ۵۸

سورہ عنکبوت کی پینتالیسویں آیت[1] میں بھی اس بات کی بصراحت تائید ملتی ہے، جس میں نماز کو معاشرتی برائیوں کے خاتمہ کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ اگر دینداری کا یہ نتیجہ ہے تو سوال یہ پیش آتا ہے کہ کبھی کبھی یہ دینداری کجیوں اور انحرافات کی روک تھام کیوں نہیں کر پاتی بلکہ بسا اوقات اس میں اضافہ ہوتا ہے یا انحرافات کی نئی نئی شکلوں ظاہر ہوتی ہیں؟

اس سوال کی مزید وضاحت کے لئے ، دیندار معاشرہ بالخصوص روایتی ماحول میں موجود بعض مسائل و مشکلات کی طرف اشارہ مناسب ہوگا۔ بعض اوقات دینداروں میں کچھ افراد گناہ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ مثلاً نماز پڑھتے ہیں مگر خرید وفروخت کے وقت کم فروشی و گراں فروشی بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں مگر جھوٹ بھی بولتے ہیں، غیبت بھی کرتے ہیں اور تہمتیں بھی لگاتے ہیں۔ دین کی تبلیغ وترویج میں مصروف ہوتے ہیں لیکن اپنے کہے پر خود عمل نہیں کرتے یا کم عمل کرتے ہیں۔ مجالس عزامیں خاص اہتمام وانہماک سے شامل ہوتے ہیں مگر دینی واجبات و محرمات کے معاملے میں پابند نظر نہیں آتے اور دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں مگر بعض اوقات انہی تلاوت شدہ آیات کے برخلاف عمل کرتے ہیں۔ اعاظم دین ومذہب کے مراقد کی زیارت کے لئے رنج سفر اٹھاتے ہیں، اخراجات کے متحمل ہوتے ہیں مگر اپنے ہی ضرور تمند رشتہ داروں، ہمسایوں اور ہم وطنوں کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ معاشرتی زندگی میں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ[2] کے قرآنی اصول کو بھولے بیٹھے ہیں اور اپنے کئے کے بدلے فائدہ کے طالب ہوتے ہیں۔ اپنی دینداری کی شہرت کی بنیاد پر کسی ذمہ داری کو قبول کر لیتے ہیں لیکن اس کی ادئیگی کے وقت اور کمیت و کیفیت کے سلسلہ میں غفلت کا شکار رہتے ہیں۔ بیت المال کی بربادی کے سلسلہ میں ہمیشہ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن خود ان اموال عامہ کی بربادی سے پرہیز نہیں کرتے جو ان کے اختیار میں ہیں۔ یوں تو ان کا اہل مسجد میں شمار ہوتا ہے لیکن غبن، خرد برد اور رشوت بھی انہیں بری نہیں لگتی اور حلال روزی پر اکتفا نہیں کرتے۔ خود کو مومن و دیندار سمجھتے ہیں مگر اپنے عہد و پیمان کی وفا نہیں کرتے۔

۱۔ اُتلُ مَا أُوحِيَ إِلَيكَ مِنَ الْكِتَابِ وَ أَقِمِ الصَّلَوٰةَ إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنهىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكرِ وَ لَذِكرُ اللّٰهِ أَكبرُ وَاللّٰهُ يعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ

۲۔ سورہ حجرات، آیت ۱۰

مذکورہ وضاحت کے مطابق اس تحقیق کا اصل سوال اگرچہ متدین معاشرہ کے ظاہری اعمال و کردار اور سماجی تعلقات کے مطالعہ پر مبنی ہے اور شاید دیندار افراد اور اہل نظر کے آراء و نظریات کی طرف رجوع کرکے اس کی وضاحت میسر ہو لیکن فی الحال اس مقالہ کا مقصد آیات قرآنیہ میں مذکورہ سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔

سماجی برائیوں اور انحرافات کے سلسلہ میں موجود نظریات، صاحبان نظر کے زاویۂ دید کے اختلاف کی بنیاد پر گوناگوں نظر آتے ہیں۔ ہر ماہر سماجیات نے اپنے زاویۂ نگاہ کی بنیاد پر ہی اس کے اسباب کی نشاندہی کی ہے[۱]۔ سماجی برائیوں کو بیان کرنے والے علل واسباب کو ذیل الذکر تقسیم کے مطابق خلاصۃً بیان کیا جاسکتا ہے:

اجتماعی نگرانی کا عدم استحکام

تجربات کہتے ہیں کہ سماج کے تینوں ارکان یعنی خاندان، روزگار اور علاقائی و مقامی اجتماعات میں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں جس کا سیدھا اثر شہریوں کے معاشرتی رویہ اور طریقہ کار پر پڑا ہے[۲]۔ مثلاً خاندان، گھر، گھرانہ یعنی عائلی زندگی جو بچوں کی جسمانی، روحانی، جذباتی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اہم کردار رکھتی تھی، افراد کو ایک شناخت اور شخصیت دیتی تھی نیز استعداد و صلاحیت کو فروغ دینے میں اہم معاون تھی، اپنے بنیادی کردار میں تبدیلیوں کی زد پر آگئی۔ آج کے لوگ اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گذارتے ہیں۔ بسا اوقات تو صرف سونے کے لئے گھر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عائلی زندگی میں اجتماعی روابط و تعلقات میں کمی آئی ہے اور دوستانہ تعلقات بھی بتدریج رسمی تعلقات میں تبدیل ہوگئے ہیں۔

۱۔ اس بات پر توجہ ضروری ہے کہ طرز عمل سے متعلق علوم اور تجرباتی علوم کے درمیان علّیت اور قانون سبب کے لحاظ سے بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ طرز عمل سے متعلق علوم میں علّیت کبھی یقینی نہیں ہوتی، بلکہ ان دونوں عناصر کا ہم وقت، مسلسل، منظّم، اور اطمینان بخش ہونا ملحوظ نظر ہوتا ہے۔ کلّی طور پر طرز عمل سے متعلق علوم میں علّیت کے حوالہ سے ذیل الذکر خصوصیات قابل ذکر ہیں: ہر عنصر کے ایک یا چند خاص علل واسباب ہوتے ہیں، عین ممکن ہے کہ مشترکہ علتیں بھی پائی جاتی ہوں۔ کسی چیز کے وجود کا میدان ہموار کرنے والے علل واسباب میں سماجی و معاشرتی تبدیلیوں کی بنا پر کلّی تبدیلی وجود میں آتی رہتی ہے؛ کسی چیز کے وجود کا میدان ہموار کرنے والے حالات بھی، مختلف معاشروں کی تہذیبوں کے مطابق فرق رکھتے ہیں؛ سماجی عناصر کی حقائق و مشتملات، زمانہ اور خود معاشرہ کے مطابق الگ الگ ہوتے ہیں؛ سماجی عناصر ایک ہی وقت میں مختلف علتوں کے زیر اثر قابل توجہ تبدیلیوں کا شکار ہوتے ہیں؛ علل واسباب کے تقدّم وتاخّر کی تعیین نیز اس بات کی نشاندہی کہ کون سی علّت مؤثر کردار رکھتی ہے، عموماً ایک مشکل کام ہوتا ہے؛ سماجی عناصر کے درمیان علّی روابط مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں؛ بہت سے سماجی عناصر کے علّی روابط میں، تاثیر وتاثر کی کیفیت دوطرفہ ہوتی ہے۔ (لیٹل، ڈانیل، تبیین در علوم اجتماعی، ص ۵۰)

۲۔ انجمن جامعہ شناسی ایران، آسیب ہای اجتماعی در ایران، ص ۱۷

جس کے نتیجہ میں جو گھر اور عائلی زندگی معاشرہ کا اہم رکن سمجھی جاتی تھی اور گھر کے افراد کی اندرونی و بیرونی نگرانی ان کے اخلاق و کردار کو بہتر بناتی تھی، اس میں بنیادی تبدیلی آئی ہے اور بدحالی کا شکار ہوئی ہے[۱]۔

آج کے معاشرہ میں لوگ علاقائی اور مقامی اجتماعات سے بھی محروم ہوگئے ہیں جو اس سلسلہ میں معاون تھے۔ گذشتہ زمانہ میں کسی ایک محلّہ میں لوگ اور گھرانے طویل عرصہ تک زندگی گذارتے تھے اور یہ بات انحرافات اور کجرویوں کی روک تھام کا ایک اہم سبب تھی۔ لیکن عصر جدید میں کسی ایک جگہ یا محلّہ میں زیادہ دنوں تک نہ ٹھہرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرتوں کے سبب محلّوں میں تہذیبی اور قومی تنوّع و تعدد وجود میں آیا ہے، جس کے سبب اجتماعی نگرانی میں بھی کمی آئی ہے۔ بالخصوص بڑے شہروں کے گرد و نواح کے علاقوں میں اس حالت کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے علاقوں میں جرائم کی شرح دیگر علاقوں کی بنسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے[۲]۔

نئے زمانہ میں پیشوں کی حالت بھی بنیادی تبدیلیوں کا شکار ہے۔ بیشتر پیشے قراردادی اور وقتی حیثیت رکھتے ہیں، جس کے نتیجہ میں پیشہ کے لحاظ سے لوگوں کی کوئی مستقل اور قابل اعتماد شخصیت نہیں بن پاتی لہٰذا ان کے افعال و کردار پر کنٹرول بھی ایک مشکل کام ہو جاتا ہے۔ پیشوں کا قراردادی اور وقتی ہونا، لوگوں کے احساسِ امنیت میں کمی کا سبب بنتا ہے اور انہیں کجروی کی جانب لے جاتا ہے[۳]۔

بہت سے ماہرین سماجیات کے مطابق، اجتماعی نگرانی میں کمی، سماجی یکجہتی میں کمی کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح اجتماعی اتحاد کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے اقتدار کی کمزوری کا باعث بھی ہے۔ درنتیجہ اجتماعی برائیوں کی روک تھام سے معاشرہ عاجز ہو جاتا ہے[۴]۔ اس زاویۂ دید کے مطابق، اندرونی اور بیرونی طور پر اجتماعی نگرانی، سماجی برائیوں کی روک تھام میں بے نظیر کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ معاشرتی و

۱۔ محسن تبریزی، علی رضا، وندالیسم، ص ۶۸-۶۹
۲۔ آخوندی، محمد باقر، حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۸۰
۳۔ آسیب ہای اجتماعی در ایران، ۲۰
۴۔ وندالیسم، ص ۹۳

ثقافتی تبدیلیوں کے سبب گذشتہ دور کی طرف پلٹنا ناممکن ہے، لہٰذا ایسا راستہ اختیار کرنا ہوگا جس میں گذشتہ طریقوں کے مثبت عناصر کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے۔

قرآن مجید نے سورہ حج کی اکتالیسویں آیت[1] میں اجتماعی نگرانی اور ایمان[2] کو دینی معاشرہ کی دو اہم خصوصیات کے طور پر بیان کیا ہے۔ اجتماعی نگرانی، اعمال و افعال کو ایک ایسے راستہ پر لگانے کا ذریعہ ہے جس کی توقع ایک معاشرہ کو ہوتی ہے اور جو پیدائش کے وقت سے ہی اجتماعیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور پوری زندگی جاری رہتی ہے۔ اس پورے سلسلہ میں کامیابی کا حصول اجتماعی نگرانی کی باطنی صورت کا میدان فراہم کرتا ہے اور پھر انسان کے وجود میں کنٹرول اور نگرانی کا مستحکم ذریعہ وجود میں آتا ہے جس کا نام ایمان ہے۔ در حقیقت اجتماعی نگرانی ایمان کا ہی نتیجہ ہے۔ ایمان شک و تردید کے ازالہ کا سبب ہے، عمل کو الٰہی فرائض پر استوار کرتا ہے اور مؤمن کو حادثات کے وقت ثابت قدم رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف غیر مؤمن شخص چونکہ خیر و شر کا مالک خود کو سمجھتا ہے لہٰذا ہمیشہ مختلف مشکلات کا شکار رہتا ہے[3]۔ دل میں ایمان بتدریج اس قدر راسخ ہوجاتا ہے کہ سورہ مجادلہ کی آیت نمبر ۲۲[4] کے مطابق الٰہی روح اس کی تائید کرتی ہے۔ یہ مؤید جسے سورہ فتح کی چوتھی آیت میں سکینہ کی تعبیر سے یاد کیا گیا ہے، مومن کے ایمان کا نتیجہ ہے اور اس کی پوری زندگی کو روشن و منور کردیتا ہے نیز چھوٹی بڑی سماجی برائیوں اور انحرافات سے اسے محفوظ رکھتا ہے[5]۔ یعنی ایسے انسان کے پاس نگرانی کا سب سے زیادہ مضبوط، مؤثر، سدابہار اور دائمی ذریعہ ہوتا ہے، جس کا تسلسل ایمان کی تقویت کا سبب ہوتا ہے اور ایمان کی تقویت اجتماعی نگرانی کو مزید قوت و استحکام بخشتی ہے۔ چنانچہ اگر اجتماعی نگرانی معاشرہ کے ہر فرد کے وجود میں اوّلین مؤثر

۱۔ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

۲۔ بہت سی آیات میں نماز اور زکات کو ایمان کی علامت بتایا گیا ہے۔

۳۔ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (آل عمران۶۸)؛ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ (محمد/۱۱)؛ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا... (بقرہ/۲۵۷)؛ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (اعراف/۲۷)؛ إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ (آل عمران/ ۱۷۵)۔

۴۔ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ

۵۔ طباطبائی، سید محمد حسین، ترجمہ تفسیر المیزان، ج۹، ص ۳۰۲

عامل کے بطور راسخ ہو جائے تو سماجی کجروی اور انحراف میں کمی آئے گی۔ اجتماعی نگرانی کا تسلسل اور اس کی پائیداری سے اجتماعی ہمدلی و ہم آہنگی میں مزید استحکام آتا ہے اور ترقی و پیشرفت کا ماحول فراہم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں معاشرتی توازن برقرار اور اجتماعی نظام ثابت و استوار رہتا ہے۔ اس مقالہ کا دعویٰ یہ ہے کہ دینداری کی تقویت کے ذریعہ گھرانہ[1]، محلّہ اور پیشہ[2] میں ایمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اجتماعی نگرانی کے اندرونی و بیرونی آثار و نتائج کی بازگشت انہی چیزوں کی طرف ہو گی اور در نتیجہ اجتماعی نگرانی میں اضافہ کے ذریعہ انحرافات کے انسداد کا میدان ہموار ہوگا[3]۔

معاشرہ سے لگاؤ میں کمی

کسی جماعت یا اجتماع کے وجود میں آنے کا ایک عامل و محرک، اس سے لگاؤ ہے جو چار عناصر پر مشتمل ہوتا ہے: لگاؤ، فرض شناسی، سماجی اتحاد و ہم آہنگی اور ایمان۔ جسے بھی اپنے معاشرہ سے لگاؤ ہوگا وہ معاشرہ کے اجتماعی اقدار کے بر خلاف کوئی عمل انجام نہ دے گا۔ نہ صرف یہ کہ اقدار شکنی سے خود پرہیز کرے گا بلکہ دوسروں کو بھی اس عمل سے باز رکھے گا۔ ہیر شی کہتے ہیں کہ انحراف و کجروی کی پہلی وجہ، معاشرہ سے لگاؤ میں کمی ہے[4]۔

معاشرے کے سلسلہ میں فرض شناسی بھی انسان پر ایک ایسا فرض ہے جس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں: اقدار کے لئے فرض شناسی، اجتماعی فرض شناسی، اجتماعی مقاصد کے لئے فرض شناسی، معاشی و اقتصادی منابع و مصادر کے لئے فرض شناسی[5]۔ ان چار چیزوں کے سلسلہ میں انسان جس قدر اپنے آپ کو معاشرہ کا مقروض سمجھے گا اتنا ہی کم انحراف و کجروی کا شکار ہوگا۔ دوسری جانب، اجتماعی سرگرمیاں جتنی زیادہ ہوں گی، انحراف کا خطرہ بھی اتنا ہی انسان سے دور ہوگا۔ اس بنا پر، بے روزگار افراد جو اجتماعی سرگرمیوں میں کم شریک رہتے ہیں، انہیں انحراف کا خطرہ زیادہ لاحق ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق، دینی و معاشرتی

۱۔ سورہ روم، آیت ۲۱

۲۔ سورہ جمعہ، آیت ۹-۱۰

۳۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۷۱-۹۴

۴۔ رابرٹسن، یان، در آمدی بر جامعہ، ص ۱۷۶

۵۔ چلبی، مسعود، جامعہ شناسی نظم، ص ۷۱

اقدار پر انسان کا یقین و ایمان بھی افراد کی تربیت و حفاظت میں ایک اہم عنصر شمار ہوتا ہے۔انسان کا ایمان جتنا مستحکم ہوگا، اتنا ہی کجروی کا کم شکار ہوگا۔ لہٰذا اگر معاشرہ سے لگاؤ مضبوط نہ ہو، فرض شناسی نہ ہو، اجتماعی سرگرمیوں اور دین و اخلاق کی پابندی میں کمی ہو تو سماج کے لوگ انحراف، کجروی اور برائیوں کی زد پر ہوں گے۔

سورہ غافر کی ۳۷ویں اور ۵۶ویں آیت [۱] کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی چیز سے محبت اور لگاؤ انسان کے عقل و شعور پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی اثر پذیری کی مقدار اور قسم کو معیّن کرتا ہے [۲]۔یعنی دین سے لگاؤ، اس کی طرف رجحان کا میدان ہموار کرتا ہے اور دینی شخصیات سے لگاؤ ان کے آراء و نظریات سے متاثر ہونے کا میدان فراہم کرتا ہے [۳] چونکہ دین سے محبت اس کی طرف رجحان کا سبب ہے، در نتیجہ یہ محبت و انسیت دینداری کی تقویت کا بھی سبب بنتی ہے لہٰذا دینداری کے تحفظ و استحکام کا ایک اہم ذریعہ دین اور دینی شخصیات سے محبت میں اضافہ کرنا ہے۔ اس کے برخلاف، ان دونوں کی نسبت محبت و انسیت میں کمی دینداری میں کمی اور بتدریج اس کی نابودی کا سبب ہے جس کے نتیجہ میں جرائم کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے [۴]۔اس لئے کہ سورہ بقرہ کی ۱۷۷ویں آیت [۵] کے مطابق دینداری، افراد معاشرہ کو سماج سے لگاؤ رکھنے

۱۔ أَسْبابَ السَّماواتِ فَأَطَّلِعَ إِلى إِلهِ مُوسى وَ إِنِّي لَأَظُنُّهُ كاذِباً وَ كَذلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ وَ صُدَّ عَنِ السَّبيلِ وَ ما كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلاَّ في تَباب (غافر/۳۷)۔ إِنَّ الَّذينَ يُجادِلُونَ في آياتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطانٍ أَتاهُمْ إِنْ في صُدُورِهِمْ إِلاَّ كِبْرٌ ما هُمْ بِبالِغيهِ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّميعُ الْبَصير (غافر/۵۶)۔

۲۔ مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج۱۹، ص ۳۹؛ طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۸، ص ۶۸۹؛ طبرسی، فضل بن حسن، مشکاۃ الانوار فی غرر الاخبار، ج۵، ص ۲۳۸

۳۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۳، ص ۲۵۵؛ تفسیر نمونہ، ج ۱۲، ص ۲۳۷و۱۷۰ - ۲۴۳؛ مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۶، ص ۶۷۳

۴۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۳، ص ۲۵۵؛ تفسیر نمونہ، ج ۱۲، ص ۲۳۷و۱۷۰ - ۲۴۳؛ مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۶، ص ۶۷۳

۵۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْمَلائِكَةِ وَ الْكِتابِ وَ النَّبِيِّينَ وَ آتَى الْمالَ عَلى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبى وَ الْيَتامى وَ الْمَساكينَ وَ ابْنَ السَّبيلِ وَ السَّائِلينَ وَ فِي الرِّقابِ وَ أَقامَ الصَّلاةَ وَ آتَى الزَّكاةَ وَ الْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذا عاهَدُوا وَ الصَّابِرينَ فِي الْبَأْساءِ وَ الضَّرَّاءِ وَ حينَ الْبَأْسِ أُولئِكَ الَّذينَ صَدَقُوا وَ أُولئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (بقرہ/۱۷۷)۔

والا، پابند، باایمان اور فرض شناس بناتی ہے[۱]۔

اجتماعی سرمایہ کی قلّت

مختلف وجوہات کی بنیاد پر، اجتماعی سرمایہ کی طرف توجہ اور اس کی اہمیت میں روزافزوں اضافہ ہوا ہے اور اس نے بہت سے محققین کو غور و فکر پر مجبور کیا ہے۔ فوکویاما کے مطابق اجتماعی سرمایہ ایک غیر رسمی قاعدہ ہے جس سے افراد معاشرہ کے درمیان باہمی رابطہ کو تقویت ملتی ہے۔ ان کی نظر میں اگرچہ اجتماعی سرمایہ خود ایک قاعدہ ہے تاہم دیگر سماجی قواعد کا نتیجہ بھی ہے۔ فوکویاما کی تعریف کے مطابق، معاشرتی اعتماد، معاشرتی تعلقات اور معاشرتی سرگرمیاں بھی اجتماعی و معاشرتی سرمایہ کا نتیجہ ہیں نیز اس کے وجود کا سبب بھی ہیں۔

پوتنام بھی اجتماعی سرمایہ کو سماجی تنظیموں کی بعض خصوصیات جیسے اعتماد، قواعد اور روابط و تعلقات کا مجموعہ مانتا ہے جو ہم آہنگ اقدامات میں آسانی کے ذریعہ معاشرہ کی افادیت میں اضافہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی بعض آیات کی تحلیل و تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ اجتماعی سرمایہ کے اصل عناصر یہ ہیں: معاشرتی اعتماد، اخلاقی و دینی فرائض کی پابندی اور روابط و تعلقات۔ معاشرتی و اجتماعی اعتماد میں کمی، دوسروں کی بنسبت بدگمانی میں اضافہ کرتی ہے جس کے نتیجہ میں دوطرفہ تعلقات اور سماجی اتحاد میں بھی کمی آتی ہے۔ چونکہ سماجی اتحاد، معاشرتی تعلقات اور اخلاقی و دینی فرائض کی پابندی، معاشرہ سے لگاؤ کے عناصر بھی ہیں لہٰذا ان میں کمی سماجی برائیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ، یہی تینوں عناصر (سماجی اتحاد، معاشرتی تعلقات اور اخلاقی و دینی فرائض کی پابندی) اندرونی و بیرونی اجتماعی نگرانی کی تشکیل و تقویت کا باعث بھی شمار ہوتے ہیں لہٰذا ان کی کمزوری اجتماعی نگرانی کی کمزوری کا سبب ہے۔ اس مقالہ کی نظر میں دینداری ایک مکمل و مستحکم اور بیدار کنندہ عنصر کی حیثیت سے اجتماعی سرمایہ کے اصل عناصر[۲] (اعتماد، اتحاد و ہم آہنگی اور دوطرفہ تعلقات[۳]) کی دائمی تقویت کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۱۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۷۱

۲۔ وَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلاً قَرْيَةً كانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتيها رِزْقُها رَغَداً مِنْ كُلِّ مَكانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذاقَهَا اللَّهُ لِباسَ الْجُوعِ وَ الْخَوْفِ بِما كانُوا يَصْنَعُونَ (نحل/۱۱۲)۔

۳۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (حجرات/۱۰)۔

اقدار اور قواعد کا تضاد

ثقافتی و قومی تنوع، سلیقوں کے اختلاف، نسلی تعصبات اور ذرائع ابلاغ کے فروغ و ارتقاء کے نتیجہ میں معاشرہ میں مختلف بلکہ متضاد اقدار وجود میں آتے ہیں۔ اقدار کا تصادم، قواعد کے تصادم پر منتہی ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ دو یا چند حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اقدار و قواعد کا تصادم سماجی اتحاد اور ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتا ہے، سماجی تعلقات کی کمزوری کا سبب بنتا ہے، اجتماعی اعتماد میں کمی لاتا ہے اور جذباتی اور دوستانہ روابط کو محدود کر دیتا ہے[۱]۔

یہ صورتحال اجتماعی سرمایہ کی قلّت اور اجتماعی نگرانی کی کمزوری کا سبب ہے جس کے نتیجہ میں اجتماعی انحرافات اور سماجی برائیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مقالہ کا دعویٰ یہ ہے کہ دینداری کی تقویت کے ذریعہ قواعد و اقدار کے تضاد کی بنیاد پر رونما ہونے والی برائیوں کا انسداد اور اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ دین، مؤمنین کے درمیان برادرانہ احساس کی تبلیغ و ترویج کرتا ہے[۲]۔ ظن و گمان[۳] اور صحبت و ہمنشینی[۴] کی بنیاد پر وجود میں آنے والی برائیوں کی تقلیل اور اس کا انسداد بھی، تقویت ایمان اور استحکام دینداری کے ذریعہ ممکن ہے۔ سورہ حجرات کی دسویں آیت[۵] کے مطابق مؤمنین کے درمیان رشتۂ اخوت قائم ہے اور ان کے تعلقات بھی ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح گہرے، جذباتی اور دوستانہ ہیں۔ اس لئے کہ جو چیز ایک معاشرہ کی حفاظت کرتی ہے اور دینداری کو استحکام عطا کرتی ہے وہ وفاق و اتحاد ہے، تضاد و اختلاف نہیں۔

سورہ فصلت کی چونتیسویں آیت[۶] کے تحلیل و تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سماجی تعلقات معجزہ جیسا کام کرتے ہیں۔ اس آیت میں اچھائی اور برائی کے نتائج کی نشاندہی کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اِدْفَعْ

۱۔ جامعہ شناسی نظم، ص۱۱۷

۲۔ قُلْ يا أَهْلَ الْكِتابِ تَعالَوْا إِلى كَلِمَةٍ سَواءٍ بَيْنَنا وَ بَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللَّهَ وَ لا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَ لا يَتَّخِذَ بَعْضُنا بَعْضاً أَرْباباً مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (آل عمران/۶۴)۔

۳۔ يا أَيُّهَا الَّذينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثيراً مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَ لا تَجَسَّسُوا وَ لا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَ يُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ وَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحيمٌ (حجرات/۱۲)۔

۴۔ وَ لا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لاَ السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذي بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَداوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَميم (فصلت/۳۴)۔

۵۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

۶۔ وَ لا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ لاَ السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذي بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَداوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَميم

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ یعنی برے اور تنفر انگیز معاشرتی تعلقات کا جواب اچھے، دوستانہ اور پرتپاک معاشرتی تعلقات کے ذریعہ دیجئے اور ہر گز برائی کا جواب برائی سے نہ دیجئے [1]۔

یہ اہم بات سورہ مؤمنون کی ۹۶ ویں آیت میں بھی الگ انداز میں بیان ہوئی ہے: اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۔ یہ حکمت عملی، دوستانہ اور گہرے سماجی تعلقات میں پہلے سے ہی موجود ہوتی ہے، تو پھر الگ سے اس آیت میں اس بات کی نصیحت کی کیا ضرورت تھی؟ اس بات کا جواب سورہ فصلت کی چوتیسویں آیت میں موجود ہے: فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ اس آیت میں ولی سے مراد دوست ہے اور حمیم بہت گرم پانی کو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدن کے پسینہ کو بھی حمیم کہتے ہیں۔ حمام کو بھی اسی تناسب سے حمام کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں بہت محبت کرنے والے مہربان دوست کے معنی میں ہے لہٰذا گہرے، دوستانہ اور محبت بھرے تعلقات بالخصوص اگر وہ غیر دوستانہ اور دشمنی بھرے تعلقات کے مقابلہ میں اختیار کئے جائیں تو دشمن کو مہربان دوست میں تبدیل کر سکتے ہیں [2]۔ اس لئے کہ جو بھی کسی سے بدی کے ساتھ پیش آتا ہے وہ اس بات کے لئے تیار رہتا ہے کہ سامنے والا شخص بھی بدی سے ہی جواب دے گا لیکن جب وہ دیکھے گا کہ یہ شخص نہ صرف بدی کا جواب بدی سے نہیں دیتا بلکہ خوبی و نیکی کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہے تو اس کے وجود میں ایک طوفان برپا ہو جائے گا، اس کا ضمیر بیدار ہو جائے گا، اپنی حرکت پر نادم و پشیمان ہوگا اور مد مقابل شخص کی عظمت و بزرگی کا کلمہ پڑھے گا۔ یہی وہ مرحلہ ہوگا جب محبت، مہربانی اور دوستی، نفرت، کینہ اور دشمنی کی جگہ لے لے گی [3،4]۔

تاریخ بھی شاہد ہے کہ رسول اکرمؐ بھی اس حکمت عملی کی طرف ہمیشہ توجہ رکھتے تھے۔ بعنوان مثال فتح مکہ کے موقع پر دشمن ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ آج تو سخت اور عبرت آموز انتقام کا دن ہے اور ایک دریائے خوں بہے گا، مگر پیغمبر رحمت نے اذھبوا فانتم الطلقاء کہہ

۱۔ تفسیر نمونہ، ج۲۰، ص ۲۸۲

۲۔ المیزان فی تفسیر القران، ج۱۷، ص ۵۹۵

۳۔ اگر چہ یہ قانون دائمی نہیں تاہم غالب ضرور ہے۔ اس لئے کہ ہمیشہ اس قسم کے قوانین سے غلط فائدہ اٹھانے والے کچھ افراد موجود ہوتے ہیں۔ جب تک انہیں ان کے اعمال و کردار کی سخت ترین سزا نہیں ملتی برائی سے دستبردار نہیں ہوتے۔

۴۔ تفسیر نمونہ، ج۲۰، ص ۲۸۲

کر سبھی کو دامن عفو میں جگہ دی۔ مشرکین مکہ پر حضور اکرمؐ کی یہ حکمت عملی ایسی اثر انداز ہوئی کہ سورہ نصر کی دوسری آیت کے مطابق یدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْواجاً ، لوگ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں شامل ہوتے گئے اور انہوں نے دل و جاں سے اسلام کو تسلیم کیا[1]۔

البتہ واضح رہے کہ مذکورہ آیت میں ارشاد ہوا ہے: گویا وہ ایک بہت محبت کرنے والا دوست ہے (كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ)؛ مقصد یہ ہے کہ مذکورہ حکمت عملی کے اختیار کرنے سے اگروہ حقیقی طور پر ایک گہرے دوست میں تبدیل نہ بھی ہو تو کم از کم اپنے آپ کو ان کے جیسا ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا۔ مخالفین کے مقابلہ میں ایسی حکمت عملی آسان نہیں ہوتی لہٰذا بعد کی آیت (سورہ فصلت/۳۵)[2] میں اس کی تمہیدی بنیادوں کو مختصر اور پر معنٰی عبارتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے: وَ ما يلَقَّاها إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا اور یہ (خصلت) صرف صبر کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ صبر واستقامت ان کا ہنر ہے جو ایمان و تقویٰ کی مضبوطی کے حامل ہوتے ہیں: إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۔ غیظ و غضب صرف ایمان و تقویٰ کے ذریعہ قابل مہار ہے۔ اس لئے کہ ایمان کے ذریعہ روح اس قدر وسعت کی حامل ہو جاتی ہے کہ پھر مؤمن دشمنوں کی ایذارسانیوں سے بآسانی متاثر نہیں ہوتا اور آتش انتقام شعلہ ور نہیں ہوتی[3]۔

آیات قرآنیہ میں زمان، مکان، زبان، قوم اور رنگ و نسل کی قید کے بغیر انسان کو مخاطب قرار دیا گیا ہے[4] اور اس کتاب میں ہر وہ چیز موجود ہے جو اس کی اجتماعی زندگی کے فروغ وارتقاء کا سبب ہے[5]۔ بعض آیات الٰہیہ کے مفاہیم سے واضح ہوتا ہے کہ نفاذ دین (معاشی، معاشرتی، آسائشی و تہذیبی)

۱۔ تفسیر نمونہ، ج۲۰، ص ۲۸۳

۲۔ وَ مَا يلَقَّهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبرُواْ وَ مَا يلَقَّهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (فصلت/۳۵)

۳۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن ، ص ۹۴-۷۱

۴۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِی أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَينَاتٍ مِّنَ الْهُدى وَ الْفُرْقَانِ (بقرہ/۱۸۵)؛ وَ ما أَرْسَلْناكَ إِلاَّ كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشيراً وَ نَذيراً وَ لكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لا يَعْلَمُونَ (سبا/۲۸)؛ قُلْ يأَ ايهَا النَّاسُ إِنی رَسُولُ اللَّهِ إِلَيكمْ جَمِيعًا (اعراف/۱۵۸)؛ وَ مَا هُوَ إِلَّا ذِكرٌ لِّلْعَالَمِينَ (قلم/۵۲)؛ تَبَارَك الَّذِی نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلى عَبْدِهِ لِيكونَ لِلْعَلَمِينَ نَذِيرًا (فرقان/۱)؛ وَ مَا يعْلَمُ جُنُودَ رَبِّك إِلَّا هُوَ وَ مَا هِی إِلَّا ذِكرَى لِلْبَشَرِ (مدثر/۳۱)؛ هَذَا بَيانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ (آل عمران/۱۳۸)

۵۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱، ص ۶۴

آثار و برکات[۱] کا سبب ہوتا ہے اور سماج کی ہمہ گیر ترقی و پیشرفت کا ضامن ہوتا ہے[۲]۔ بالفاظ دیگر دینداری معاشی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی فروغ و ارتقاء کا میدان ہموار کرتی ہے اور ایک صحیح و سالم معاشرہ کو وجود بخشتی ہے۔

سورہ نحل کی آیت ۹۷ میں بھی نفاذ دین کے نتیجہ میں حیوۃ طیبہ کی نوید دی گئی ہے[۳]۔ ظاہر ہے کہ پاکیزہ حیات کا قرآنی تصوّر زندگی کے ثقافتی و معاشرتی پہلوؤں کو بھی شامل ہوتا ہے[۴]۔ سورہ عنکبوت کی آیت ۴۵[۵] میں بھی دینداری کے نتیجہ میں اصلاح معاشرہ کا مژدہ سنایا گیا ہے اور صریحاً تاکید کی گئی ہے کہ قائم کرنے سے ہر قسم کی کجی و انحراف کا معاشرہ سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔

آیات قرآن کے مطابق، دین کے عدم نفاذ کی صورت میں معاشرہ کی حالت غیر ہوگی۔ یہ آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اگر معاشرہ میں دین کو رسوخ حاصل نہ ہو تو برائی و کجی اور سماجی مشکلات معاشرہ کو تباہ و برباد کردیں گی۔[۶] سورہ فتح کی تیئیسویں[۷]، سورہ احزاب کی باسٹھویں[۸]، سورہ اسراء کی ستترویں[۹]

۱۔ برکات برکت کی جمع ہے اور ثبات کے معنیٰ میں ہے۔ اس بناپر ہر اس نعمت کو برکت کہا جاتا ہے جو دائم و ثابت ہو۔ اس کے مقابلہ میں بے برکت موجودات وہ ہیں جو جلد فنا پذیر ہو جاتے ہیں (تفسیر نمونہ، ج۶، ص۲۶۶)

۲۔ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرى آمَنُوا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنا عَلَيْهِمْ بَرَكاتٍ مِنَ السَّماءِ وَ الْأَرْض (اعراف/۹۶)؛ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقامُوا التَّوْراةَ وَ الْإِنْجيلَ وَ ما أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ وَ كَثيرٌ مِنْهُمْ ساءَ ما يَعْمَلُون (مائدہ/۶۶)

۳۔ مَنْ عَمِلَ صالِحاً مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَياةً طَيِّبَةً (نحل/۹۷)

۴۔ تفسیر نمونہ، ج۷، ص ۱۲۸

۵۔ وَ أَقِمِ الصَّلوٰةَ إِنَّ الصَّلوٰةَ تَنْهىٰ عَنِ الْفَحْشاءِ وَالْمُنكَرِ

۶۔ ظَهَرَ الْفَسادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِما كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (روم/۴۱)؛ وَ لكن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (اعراف/۹۶)؛ وَ ما أَصابَكُمْ مِنْ مُصيبَةٍ فَبِما كَسَبَتْ أَيْديكُمْ (شوری/۳۰)؛ وَ ما كانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرى بِظُلْمٍ وَ أَهْلُها مُصْلِحُونَ (ھود/۱۱۷)؛ قالُوا طائِرُكُمْ مَعَكُمْ أَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ (یس/۱۹)؛ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذاقَهَا اللَّهُ لِباسَ الْجُوعِ وَ الْخَوْفِ بِما كانُوا يَصْنَعُونَ (نحل/۱۱۲)

۷۔ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِى قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ وَ لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلا

۸۔ سُنَّةَ اللَّهِ فِى الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَ لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلا

۹۔ سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلا

اور سورہ آل عمران کی ایک سو سینتیسویں آیت[۱] سے واضح ہوتا ہے کہ دینداری کے ضعف کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی اجتماعی و ثقافتی پریشانیاں، اجتماعیات کے قوانین سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لئے سورہ انعام کی گیارہویں[۲]، سورہ نمل کی انہترویں[۳] اور سورہ روم کی بیالیسویں آیت[۴] میں رسول اکرمؐ کی ایک اہم الٰہی داری یہ بیان ہوئی ہے کہ لوگوں کو زمین پر سیر و سفر کی ترغیب دلائیں تاکہ وہ گذشتہ قوموں کی سرگذشت اور باقیماندہ آثار کو دیکھیں کہ کس طرح ان کے گھر منہدم اور نسلیں منقطع ہوگئیں تاکہ ان کی غلطیاں یہ نہ دہرائیں اور ان چیزوں میں مبتلا نہ ہوں جن میں وہ مبتلا ہوئے تھے[۵]۔

سورہ اسراء کی نویں آیت[۶] کے مطابق، انسان اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں قرآن مجید پر عمل پیرا ہو کر سب سے سیدھے، مستحکم اور صاف راستہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر قرآن مجید کا مقصد معاشرہ میں انسان کی ترقی و پیشرفت ہے جو مذکورہ آیت[۷] کے مطابق ہدایت اقوم ہے اور معاشرہ کا فروغ و ارتقاء اس کا خوبصورت نتیجہ ہے[۸] نیز کجی و انحراف، جرائم اور ناجائز جنسی تعلقات جیسی برائیوں میں کمی کا سبب اور سچائی، دوستی، تعاون، انفاق، اعتماد، امانت داری، صبر، توکل اور سکون و اطمینان جیسے اوصاف حسنہ کا باعث ہے۔

۱۔ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ

۲۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ

۳۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ

۴۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ

۵۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۶، ص ۲۹۳

۶۔ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ

۷۔ یہ قرآن یقیناً اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور ان مومنین کو جو نیک اعمال بجالاتے ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان لیے بڑا اجر ہے۔

۸۔ يا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَ هُدًى وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس/۵۷)؛ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ ما هُوَ شِفاءٌ وَ رَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنينَ وَ لا يَزيدُ الظَّالِمينَ إِلاَّ خَسارا (اسراء/۸۲)؛ وَ لَوْ جَعَلْناهُ قُرْآناً أَعْجَمِيًّا لَقالُوا لَوْلا فُصِّلَتْ آياتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَ عَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذينَ آمَنُوا هُدىً وَ شِفاءٌ وَ الَّذينَ لا يُؤْمِنُونَ في آذانِهِمْ وَقْرٌ وَ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولئِكَ يُنادَوْنَ مِنْ مَكانٍ بَعيد (فصلت/۴۴)

سیّال ہونا دینداری کی ایک اہم خصوصیت

متعدد قرآنی آیات[۱] کی تحلیل و تفسیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دینداری سیّال و متحرک ہے اور اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یہی خصوصیت دینداری کی کمزوری اور کبھی کبھی نابودی کا سبب قرار پاتی ہے لہٰذا ہمیشہ ضرورت رہتی ہے کہ ہوشیار رہا جائے۔ اگر اسے استحکام نہ ملے تو نابود ہو جاتی ہے اور اگر اس کی ترقی کا میدان ہموار ہو تو اسے فروغ ملتا ہے۔ چونکہ دینداری، ایمان و عمل صالح کا نتیجہ ہوتی ہے اور انہیں دو عناصر کی بنیاد پر پروان چڑھتی ہے نیز ان دونوں کی تقویت یا تضعیف دینداری کی تقویت یا تضعیف کا سبب قرار پاتی ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ دینداری کی سیّالیت بھی انہی دو عناصر یعنی ایمان و عمل صالح سے وابستہ ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے عمل کا ذمہ دار ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی ذمہ داری سے عاری نہیں ہوتا۔ دینداری اور ذمہ داری کا یہ امتزاج اس کی سیّالیت کی اہم وجہ ہے، اس لئے کہ یہ امتزاج، دینداری کے وجود اور اس کے شدت و ضعف کا سبب بنتا رہتا ہے۔

چونکہ ایمان دینداری کا ایک اہم حصہ ہے لہٰذا دینداری کی سیّالیت کی ایک اہم وجہ اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ آیات قرآنیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایمان بھی ایک سیّال حقیقت ہے جس کا سلسلۂ تکمیل جاری رہتا ہے[۲]۔ پس اگر اس سیّالیت میں مناسب ثبات و دوام نہ پایا گیا تو اس کی کمزوری یا نابودی کا امکان رہے گا۔ یہ خصوصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے چونکہ یہ دینداری کے بے وقفہ فروغ و ارتقاء میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہی خصوصیت ایمان کے تنزلزل اور اس کی کمزوری کا بھی سبب بن سکتی ہے لہٰذا یہ ایک ایسا خطرہ بھی ہے جو ابتدائے راہ میں دینداروں کو لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر ایمان میں استحکام اور ثبات و دوام نہ آئے تو اس کے تنزلزل اور خاتمہ کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر چہ ایمان جب تک

۱۔ سورہ توبہ ۱۶، ۴۷، ۵۵؛ سورہ فاطر ۲۳؛ سورہ نحل ۹۰؛ سورہ فتح ۵؛ سورہ کہف ۱۰۳؛ سورہ اسراء ۳۹، ۴۱؛ سورہ ابراہیم ۲۷؛ سورہ حمد ۷؛ سورہ بقرہ ۱۰۱؛ سورہ آل عمران ۷۲، ۱۰۲؛ سورہ منافقون ۹؛ سورہ نساء ۱۳۷؛ سورہ مائدہ ۵۷؛ سورہ نمل ۵۳؛ سورہ تحریم ۶، ۸؛ سورہ مائدہ ۹۳، ۱۰۵؛ سورہ ابراہیم ۳۵؛ سورہ انعام ۱۵۰؛ سورہ انفال ۴۵؛ سورہ طہ ۱۶؛ سورہ اعراب ۱۷۶

۲۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا (سورہ نساء: ۱۳۷)

ثابت و مستحکم نہیں ہو جاتا اس وقت تک ذاتی طور پر سیّال ہی رہتا ہے تاہم ماحول اور شرائط و حالات بھی اس کی سیّالیت میں شدت کا سبب بنتے ہیں۔

ا۔ سماجی ماحول کی تبدیلی ایمان کی سیّالیت میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ جب ایک انسان ایک منظّم و ہم آہنگ دینی ماحول سے غیر منظّم اور دین سے غیر ہم آہنگ ماحول میں قدم رکھتا ہے تو اپنے ایمان کے درجہ کے تناسب سے اس نئے ماحول کے زیر اثر آ جاتا ہے اور اس کے ایمان میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ عقائد و نظریات میں بھی تزلزل اور کمزوری آ جاتی ہے۔ انسان جتنے معاشروں میں داخل ہوتا ہے اتنے ہی اثرات قبول کرتا ہے جو کبھی کبھی متضاد بھی ہوا کرتے ہیں مگر اس معاشرہ اور ماحول کی تاثیر میں نہ کمی آتی ہے نہ کوئی دوسری چیز اس تاثیر کی جگہ لیتی ہے۔ سورہ نساء کی ۱۳۹ سے ۱۴۴ ویں آیت میں اس کیفیت کی وضاحت کی گئی ہے[۱]۔ ان آیات میں ایسے مؤمنین کا ذکر کیا گیا ہے جو کفّار کے ساتھ معاشرتی تعلقات قائم رکھنے کی غرض سے ان کے یہاں آمد و شد رکھتے ہیں اور بتدریج ان سے مانوس ہونے لگتے ہیں پھر ان کی تہذیب اور معتقدات سے متاثر بھی ہونے لگتے ہیں۔ کافر سماج سے لگاؤ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ کفار کی تہمتوں، طعنوں اور استہزاء کی تصدیق و تائید ہو اور انسان خود کو ان جیسا ظاہر کرے، لیکن جب اپنے اسلامی سماج میں پلٹ کر آئے تو خود کو مؤمن و دیندار ظاہر کرے اور کفار سے بیزاری کا اظہار کرے۔ مؤمنوں کے کفار سے سماجی تعلقات کا تسلسل ایمان کی سیّالیت میں اضافہ کا سبب ہے اور اور لوگ مسلسل

۱۔ الَّذينَ يَتَّخِذُونَ الْكافِرينَ أَوْلِياءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنينَ أَ يَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَميعاً (۱۳۹) وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتابِ أَنْ إِذا سَمِعْتُمْ آياتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِها وَ يُسْتَهْزَأُ بِها فَلا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا في حَديثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذاً مِثْلُهُمْ إِنَّ اللَّهَ جامِعُ الْمُنافِقينَ وَ الْكافِرينَ في جَهَنَّمَ جَميعاً (۱۴۰) الَّذينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِنَ اللَّهِ قالُوا أَ لَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ وَ إِنْ كانَ لِلْكافِرينَ نَصيبٌ قالُوا أَ لَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنينَ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيامَةِ وَ لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكافِرينَ عَلَى الْمُؤْمِنينَ سَبيلاً (۱۴۱) إِنَّ الْمُنافِقينَ يُخادِعُونَ اللَّهَ وَ هُوَ خادِعُهُمْ وَ إِذا قامُوا إِلَى الصَّلاةِ قامُوا كُسالى يُراؤُنَ النَّاسَ وَ لا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلاَّ قَليلاً (۱۴۲) مُذَبْذَبينَ بَيْنَ ذلِكَ لا إِلى هؤُلاءِ وَ لا إِلى هؤُلاءِ وَ مَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبيلاً (۱۴۳) يا أَيُّهَا الَّذينَ آمَنُوا لا تَتَّخِذُوا الْكافِرينَ أَوْلِياءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنينَ أَ تُريدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطاناً مُبيناً (۱۴۴)

ایمان لانے پھر کافر ہو جانے پھر ایمان لانے اور پھر کافر ہو جانے کی حالت میں رہتے ہیں یہاں تک کہ ایمان پوری طرح متزلزل اور کفران کے وجود میں سما جاتا ہے۔[۱]

۲۔ شرائط و حالات کی سختی بھی وہ مرحلہ ہے جب ایمان اور دینداری کی سیّالیت نمایاں ہوتی ہے۔ سخت کوائف و حالات میں ایمان اسی وقت پائیدار رہ سکتا ہے جب پہلے سے مضبوط و مستحکم ہو۔ اگر ایمان مستحکم نہ ہو بلکہ متزلزل ہو تو انسان ناامیدی و مایوسی کا شکار ہو جائے گا[۲]۔ اس لئے کہ ایمان کی کمزوری کے بعد سخت پریشانی کو تحمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان جب بھی مایوس و ناامید ہوتا ہے، دائرۂ ایمان سے قدرے دور ہو جاتا ہے اور پُر امید ہوتے ہی دوبارہ دائرہ ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔ حالات کی سختی و تنگی کی طرح ہی خوشحالی کے دوران بھی مضبوط و مستحکم ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورہ ہود کی دسویں آیت[۳] کے مطابق آسائش و خوشحالی کے ایام میں بھی انسان پر غرور و غفلت کی حالت طاری ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ سورہ ہود کی گیارہویں آیت[۴] کے مطابق صبر اور عمل صالح اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان ایسے حالات میں بھی اپنے ایمان پر ثابت و استوار رہے۔ سخت حالات ہوں یا آسائش و خوشحالی کے ایام، انسان اسی وقت صبر و استقامت کا مظاہرہ کر سکتا ہے جب ایک حد تک اس کا ایمان ثابت و استوار ہو۔[۵]

۳۔ کجروی و انحراف کا راستہ اختیار کرنا بھی ایمان کی کمزوری اور عدم استحکام کا پیش خیمہ ہے۔ ایمان کی کمزوری، اس کی سیّالیت میں شدید اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے کہ انحراف

۱۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا (سورہ نساء: ۱۳۷)

۲۔ وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ (ہود/۹)

۳۔ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ (ہود/۱۰)

۴۔ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (ہود/۱۱)

۵۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱۰، ص ۲۳۴

میں اضافہ کے ساتھ دائرۂ ایمان سے خروج اور پھر دوبارہ ورود میں بھی اتنی ہی تیزی آتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ مرحلہ آتا ہے کہ پھر ایمان کی طرف بازگشت نہیں ہو پاتی۔[۱]

۴۔ سورۂ توبہ کی ۷۷ویں آیت[۲] اور متعدد روایات[۳] سے واضح ہوتا ہے کہ جھوٹ اور پیمان شکنی، نفاق کی نشانیاں ہیں اور انسان کو دائرۂ امن وہدایت یعنی دائرۂ ایمان سے خارج کرنے اور پھر اس میں داخل کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جھوٹ کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ دائرۂ ایمان سے خارج ہونے اور پھر اس میں داخل ہونے کے سلسلہ میں بھی شدت آتی ہے اور سرانجام ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب ایمان کی طرف بازگشت نہیں ہو پاتی۔

۵۔ سورہ بقرہ کی ۲۶۴ویں آیت[۴] کے مطابق، ریاکار انسان بھی اپنے ریاکارانہ عمل کے وقت دائرہ ایمان سے خارج رہتا ہے۔ ہر ریاکاری کے ساتھ انسان دائرۂ ایمان سے باہر ہو جاتا ہے اور اس ریاکارانہ عمل کے ختم ہوتے ہی دوبارہ دائرۂ ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔ ریاکارانہ اعمال کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ایمان سے خارج ہونے اور پھر اس میں داخل ہونے کا سلسلہ تیز ہو جاتا ہے اور آخرکار وہ مرحلہ آتا ہے جب اسے دائرۂ ایمان میں دوبارہ شمولیت کی توفیق نہیں ہو پاتی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث کے مطابق مؤمن دائرۂ ایمان واسلام سے باہر نکل کر سرحد کفر تک پہنچ جاتا ہے[۵]۔

۱۔ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: اگر مؤمن گناہان کبیرہ کا مرتکب ہو یا گناہان صغیرہ پر مصر ہو جس کی نہی کی گئی ہے، تو وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور پھر اسے مؤمن نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایسی صورت میں وہ دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور اسے مسلمان کہا جائے گا۔ ایسے افراد اگر اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے طلب مغفرت کریں تو دوبارہ دائرۂ ایمان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ج۱، ۱۵۷)

۲۔ فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (توبہ/۷۷)

۳۔ سئل رسول اللہؐ یکون المؤمن جبانا؟ قال نعم، قیل و یکون بخیلا؟ قال نعم، قیل یکون کذابا؟ قال: لا (نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۲، ص ۳۲۲)۔ اسی طرح امیر المؤمنین حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں: لا یجد العبد طعم الایمان حتی یترك الکذب هزله وجده (مشکاۃ الانوار فی درر الاخبار، ص ۱۵۶)۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں: ایاك و مصادقة الکذاب فانه کالسراب، یقرب علیك البعید، و یبعد علیك القریب (نہج البلاغہ، حکمت ۳۷)

۴۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (بقرہ/۲۶۴)

۵۔ اصول کافی، ج۱، ۱۵۷

۶۔ سورۂ نساء کی ۶۵ویں آیت[1] کے مطابق ایمان ایک کامل و جامع حیثیت رکھتا ہے اور اس کی یہ جامعیت لازمی و ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر، مؤمن کا تمام احکام الٰہیہ کے سامنے تسلیم رہنا لازمی ہے لیکن اگر بعض اوامر و احکام پر ایمان رکھتا ہو لیکن دیگر اوامر و احکام پر ایمان نہ رکھتا ہو تو ایمان کئی حصوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اس میں سیّالیت اور آنے جانے والی حالت پیدا ہو جائے گی۔ یہ صورتحال اس وقت زیادہ مرحلۂ ظہور میں آتی ہے جب احکام الٰہیہ میں سے کوئی حکم اس شخص کے فائدہ میں نہ ہو یا اس پر عمل سے اسے بظاہر کوئی نقصان ہو رہا ہو۔ ایسی صورتحال میں اوامر الٰہیہ سے شانہ خالی کرنے کا امکان و احتمال بڑھ جاتا ہے، مگر یہ کہ اس کے ایمان میں ضروری استحکام پایا جاتا ہو۔

۷۔ ظلم بھی ایک ایسا عامل و سبب ہے جس سے ایمان کی آمد و رفت اور سیّالیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سورۂ انعام کی ۸۲ویں آیت[2] میں ایمان کو ذہنی و عینی، انفرادی و اجتماعی اور معاشی و ثقافتی واطمینان اور امن و امان نیز ہدایت کا سرچشمہ بیان کیا گیا ہے، مگر شرط یہ رکھی گئی ہے کہ وہ آلودۂ ظلم نہ ہو اور درنتیجہ اس کے اثرات ختم نہ ہوں[3]۔ اس کا مطلب ظلم[4]، ایمان کے ذریعہ وجود میں آنے والے امن و امان اور ہدایت کی راہ میں رکاوٹ ہے اور ایمان کی سیّالیت میں اضافہ کا سبب ہے۔ چونکہ ایمان کے مختلف مراتب و درجات ہیں لہٰذا ظلم کا اثر بھی مراتب دینداری سے تعلق رکھتا ہے۔ دینداری کے تمام مراتب و درجات میں، بس اسی وقت ایمان کی سیّالیت اور آمد و رفت کا سلسلہ تھم سکتا ہے جب مؤمن اپنے درجۂ ایمان کے تناسب سے ہی ظلم سے دور ہو[5]۔ دینداری کے اعلیٰ درجات میں جو چیز ظلم کا مصداق ہو وہ ایمان

۱۔ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُواْ فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُواْ تَسْلِيمًا (سورہ نساء/۶۵)

۲۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَ لَمْ يَلْبِسُواْ إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَ هُم مُّهْتَدُونَ (انعام/۸۲)

۳۔ آیت میں موجود لفظ لبس، ستر و پوشیدگی کے معنیٰ میں ہے (راغب اصفہانی، حسین بن محمد، مفردات الفاظ القران، ص ۷۴۴)

۴۔ ظلم، اعتدال و میانہ روی سے خارج ہو جانے کا نام ہے۔ مذکورہ آیت میں اس کا ذکر سیاق نفی میں نکرہ کی صورت میں آیا ہے جو میں عمومیت پیدا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ آیت کے سیاق سے واضح ہوتا ہے کہ ظلم، ایمان کے آثار حسنہ اور فوائد بے بہا کی راہ میں رکاوٹ ہے، لہٰذا یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ آیت میں مذکور ظلم سے خاص ظلم مراد ہے جو ایمان کے لئے مضر ہے اور اس کی خرابی و بے ثمری کا سبب ہوتا ہے (المیزان فی تفسیر القرآن، ج۷، ۲۷۸-۲۸۲)

۵۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۷، ص ۲۷۸-۲۸۲

اثرات کو زائل کر دیتی ہے جبکہ وہی چیز نچلے درجات میں ظلم محسوب نہ ہوگی اور اس کے نتیجہ میں اثرات ایمان مخدوش نہ ہوں گے۔ دینداری کے مراتب و درجات میں اضافہ کے ساتھ ظلم کے مصادیق کا دائرہ بھی مزید وسیع، دقیق اور جزئی ہو جاتا ہے۔

اب تک کی گفتگو سے واضح ہوا کہ دینداری کی سیّالیت اور آمد و رفت ایک حقیقت ہے جس میں اضافہ کے ساتھ دینداروں کی کجی و انحراف کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دین و ایمان کی تقویت و استحکام کے ذریعہ ہی دینداروں کے انحراف کا انسداد اور معاشرہ سے انحرافات کے اسباب و محرکات کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے زاویہ سے اگر دیکھا جائے تو دینداری کی سیّالیت، اس بات کا بھی سبب بنتی ہے کہ تمام مسلمان سایۂ ایمان میں باقی رہ کر الزام کفر سے محفوظ رہیں۔[1] یہ وہی حقیقت ہے جس کی بنیاد پر دینداری کو مختلف درجات و مراتب کا حامل جانا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ بعض سماجی مشکلات و خطرات کی تبیین و تشریح بھی کی جاسکتی ہے۔ الغرض دینداری کا سیّال ہونا جہاں ایک بے نظیر موقع ہے وہیں ایک اہم خطرہ بھی ہے۔

مراتب دینداری

بعض قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے[2] کہ دینداری کے الگ الگ درجات ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۶ اور سورۂ فتح کی چوتھی آیت میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ بعض دیندار افراد، حالت ایمان میں بھی شرک کے بعض درجات کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے ایمان کی تقویت یا تضعیف کا امکان رہتا ہے اور قوت و ضعف کے اعتبار سے اس کی درجہ بندی بھی کی جاسکتی ہے۔ ان آیات قرآنیہ کے مطابق، دینداری ایک ثابت و غیر متغیر حقیقت کا نام نہیں ہے جو معاشرہ کے کچھ لوگ معاشرتی اعمال کے بموجب اس کے دائرہ سے نکل جائیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے مختلف درجات ہیں جس میں تمام افراد اپنے تمام دینی اعمال کے باوجود شامل رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، دینداری ذومراتب حقیقت کا نام ہے جس کے نچلے مراتب و درجات میں ایمان کے ساتھ ساتھ ایک قسم کا شرک بھی موجود ہوتا ہے یعنی ایمان

۱۔ دائرۂ ایمان جتنا تنگ ہوگا، اتنے ہی افراد اس دائرہ سے باہر ہوں گے اور اتنا ہی ان پر کفر کا الزام عائد ہوگا۔ یہ وہی کام ہے جو تکفیری جماعتیں انجام دے رہی ہیں۔

۲۔ یرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (سورۂ مجادلہ/۱۱)؛ وَ لِكُلٍّ دَرَجاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَ لِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمالَهُمْ وَ هُمْ لا يُظْلَمُونَ (احقاف/۱۹)؛ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (سورۂ فاطر/۱۰)

ناخالص ہوتا ہے۔ لیکن بتدریج ایمان کی تقویت کے ساتھ اس کی ناخالصی ختم ہوتی جاتی ہے۔ دینداری کی درجہ بندی کا تعلق ، افراد کے ظرف وجود اور معیار ادراک سے بھی ہے اور پیغام دین کی ان پر تاثیر کی نوعیت، مقدار اور تنوع سے بھی۔ بعنوان مثال ، بعض مفسرین کے مطابق قرآن مجید میں لفظ مستضعفین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے مختلف جسمانی و نفسیاتی کمیوں یا سماجی، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی موانع کے باعث حقیقت اسلام آشکار نہیں ہو پائی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اسلام نہیں لا پائے یا پھر اس کی پابندی ان کے لئے ناممکن ہوتی ہے[۱]۔ لہٰذا آیات و روایات [۲] کے مطابق یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دینداری کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔

مراتب دینداری کو دو زاویوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ آیات و روایات [۳] سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان آیات قرآنی پر جتنا عمل پیرا ہوگا اور اس کی زندگی جس قدر قرآنی ہوگی وہ اتنا ہی دیندار ہوگا لہٰذا جس طرح قرآن کے مختلف بطون و مراتب ہیں اِنَّ للقرآن ظهراً و بطناً و لبطنه بطناً الی سبعین ، اسی طرح دینداری کے مراتب بھی لا متناہی ہیں [۴]۔ اس نظریہ کے مطابق، (درجات قرآن کے تناسب سے) دینداری کے بے پایاں مراتب و درجات ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور نظریہ ہے جس میں دینداری کے سات درجے بیان کئے گئے ہیں جو علم سماجیات کے عام طریقوں کی بنیاد پر ترتیب دئے گئے ہیں [۵]:

۱۔ ظاہری دینداری

۲۔ غیر ثابت و ناپائیدار دینداری

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱۵، ص ۵۱-۵۸؛ تفسیر نمونہ، ج۴، ص ۱۸۴-۱۸۸

۲۔ امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں: ایمان کے دس درجات ہیں، سیڑھی کی طرح جس کے ذریعہ زینہ بہ زینہ انسان اوپر جاتا ہے۔ (مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، ج۶۹، ص ۱۶۵)

۳۔ قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ فِي وَصِيَّتِهِ لِابْنِهِ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يا بُنَيَّ . . . وَ عَلَيْكَ بِقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ وَ الْعَمَلِ بِمَا فِيهِ وَ لُزُومِ فَرَائِضِهِ وَ شَرَائِعِهِ وَ حَلَالِهِ وَ حَرَامِهِ وَ أَمْرِهِ وَ نَهْيِهِ وَ التَّهَجُّدِ بِهِ وَ تِلَاوَتِهِ فِي لَيْلِكَ وَ نَهَارِكَ فَإِنَّهُ عَهْدٌ مِنَ اللَّهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى إِلَى خَلْقِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ أَنْ يَنْظُرَ كُلَّ يَوْمٍ فِي عَهْدِهِ وَ لَوْ خَمْسِينَ آيَةً وَ اعْلَمْ أَنَّ دَرَجَاتِ الْجَنَّةِ عَلَى عَدَدِ آيَاتِ الْقُرْآنِ فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يُقَالُ لِقَارِئِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَ ارْقَ فَلَا يَكُونُ فِي الْجَنَّةِ بَعْدَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ أَرْفَعُ دَرَجَةً مِنْهُ (صدوق، ۱۴۰۴، ج۲: ۶۲۸)

۴۔ حسن زادہ آملی، حسن، انسان و قرآن، ص ۱۷۹-۱۷۷

۵۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۱-۱۹۷

۳۔ تفصیل طلب دینداری

۴۔ بے شبہ دینداری

۵۔ دینداری حالت تضاد میں

۶۔ خالص دینداری

۷۔ مثالی دینداری۔

ان مراتب کو صعودی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ یعنی پہلا مرتبہ کمترین مرتبہ ہے جب کہ ساتواں بلند ترین مرتبہ ہے۔ دینداری کے شروعاتی مراتب و درجات میں ایمان، شرک بمعنی نا خالصی کے ہمراہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آخری مرتبہ سے جس قدر پہلے مراتب کی طرف آیئے انسان کے انحراف اور ارتکاب گناہ کا احتمال بھی بڑھتا جائے گا، نیز نفاق اور منافقانہ اعمال و کردار میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا اور اسی تناسب سے دینداروں کی تعداد میں بھی کمی آتی جائے گی۔ یہی سبب ہے کہ پہلے دو درجوں میں دینداروں کی تعداد سب سے زیادہ جب کہ آخری دو درجوں میں سب سے کم نظر آتی ہے۔ دین پہلے مرحلہ سے آگے بتدریج مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ دینداری کے تیسرے مرتبہ سے دین کے اجتماعی نمونے رفتہ رفتہ معاشرہ میں نمایاں ہونا شروع ہوتے ہیں اور انہیں استحکام حاصل ہوتا ہے[1]۔

سماجی برائیوں کے مقابلہ میں مراتب دینداری کا مزاحمتی کردار

سورۂ حجرات کی چودہویں آیت[2] کے مطابق، دینداری کا سب سے ابتدائی مرحلہ کلمۂ شہادتین کے ذریعہ تحقق پذیر ہو جاتا ہے۔ یعنی جو بھی اللہ کی وحدانیت اور رسول اکرمؐ کی رسالت کا اقرار کرے وہ مسلمان ہے اور دینی سماج میں دوسروں کے طرح مساوی حقوق کا حامل ہے۔ چنانچہ کسی کو اس کے مسلمہ حقوق کی پامالی کا حق نہیں[3]۔ چونکہ اس مرحلہ میں دین کی حیثیت ظاہری اور بربنائے مصلحت ہوتی ہے لہٰذا اس مرحلہ میں دین قلبی نہیں ہوتا اور انسان کے اعمال و کردار دین کے زیر نگرانی نہیں آپاتے۔ یہی وجہ کہ اس

۱۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۱-۱۹۷

۲۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَ لٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَ إِنْ تُطِيعُوا اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ لا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمالِكُمْ شَيْئاً إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (سورہ حجرات/۱۴)

۳۔ المیزان فی تفسیر القرآن ،ج۱، ص ۴۵۶-۴۵۸

مرحلہ سے متعلق دیندار طبقہ ہمیشہ کجی و انحراف کے خطرہ سے دوچار رہتا ہے۔ ان کی دینداری نہ صرف یہ کہ انہیں برائیوں سے محفوظ نہیں کرتی بلکہ اس مرحلہ میں عنصر نفاق میں اضافہ کا امکان رہتا ہے جس کے بموجب کجروی و انحراف میں بھی اضافہ ہوتا ہے[1]۔

اس مرحلہ میں دینداروں کے معاشرتی و اجتماعی اعمال و افعال، منفعت پر مبنی ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، اگر ان کا فائدہ دیندار رہنے میں ہو تو دیندار رہتے ہیں اور اگر بے دین رہنے میں ہو تو دین کو اہمیت نہیں دیتے۔ اس لحاظ سے ایسے افراد کے دو رخ ہوتے ہیں، دو شخصیتیں ہوتی ہیں اور ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ درحقیقت، دینداری کے اس درجہ میں اکثریت ایسے منافق افراد کی ہوتی ہے جن کی شخصیت میں تعادل و توازن نہیں پایا جاتا جب کہ عین ممکن ہے خود کو سرآمد روزگار سمجھتے ہوں۔ ایسے افراد بظاہر تو ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہیں مگر اندر سے بزدل، متزلزل اور منافق ہوتے ہیں۔ منافق فساد و انحراف والا ہوتا ہے مگر اسی نفاق کی بنیاد پر خود کو نیک و اصلاح پسند ظاہر کرتا ہے۔ منافق، مفاہیم و تعلیمات دین کے ادراک سے خود کو محروم کرلیتا ہے اور مسلسل ایمان و کفر کے درمیان آمد و شد کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی نظر میں دین صرف منافع و مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ وہ مؤمنوں کے ساتھ ہوتا ہے نہ کافروں کے ہمراہ بلکہ اس کے فوائد و منافع ہی اس کی ہمراہی کا تعیّن کرتے ہیں۔ اگر دینداری کا یہ درجہ و مرتبہ رائج و جاری رہے تو اس کے منفی نتائج معاشرتی و ثقافتی تضاد، دینداری کی قلّت، فساد و انحراف کی شدّت، اجتماعی سرمایوں کی نابودی وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ تاہم اس مرحلہ میں ظواہر دین کی پابندی نہ صرف منفی پہلو نہیں رکھتی بلکہ کم از کم دینداری کی ظاہری شکل کو قدرے محفوظ رکھتی ہے اور وقتی طور پر معاشرتی و ثقافتی امن قائم رہتا ہے۔

سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۱۰۶[2] اور سورۂ نساء کی ۱۳۷ ویں آیت[3] میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو ایمان تو رکھتے ہیں مگر ان کے ایمان میں شرک کا امتزاج ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایمان و کفر کے درمیان آمد و

۱۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۴

۲۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ

۳۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا۔

شد کی حالت میں رہتے ہیں[۱]۔

دوسرے مرحلہ میں، ایمان دل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک اہم اور بنیادی مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ میں پہلے والے مرحلہ اور درجہ کی نسبت خطرۂ انحراف و کجروی میں کمی آتی ہے، تاہم ابھی ایمان کمزور ہوتا ہے، اس میں ابھی اتنا استحکام نہیں پایا جاتا اور دیندار ایمان و کفر کے درمیان متزلزل رہتا ہے۔ اگر اس آمد و شد اور تزلزل کے دوران ایمان کی تقویت ہو جائے تو بتدریج اس میں ضروری استحکام آجاتا ہے، خطرۂ انحراف و گناہ کم ہو جاتا ہے اور دینداری کے مراتب میں ارتقاء آتا ہے۔ لیکن اس دوران اگر گناہ و عصیان کی تقویت ہوئی تو انحراف کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور بتدریج دینداری کے مراتب میں بھی تنزل آتا ہے۔ اس صورتحال میں اجتماعی نگرانی کے سبب انحراف کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس مرحلہ میں اجتماعی نگرانی میں اضافہ کے ذریعہ علانیہ جرائم میں تو کمی آئے گی مگر نفاق میں اضافہ ہوگا جس کے نتیجہ میں غیر علانیہ اور مخفیانہ جرائم میں اضافہ ہوگا۔ معاشرتی دباؤ کی شدت سے بچنے کا ایک راستہ نفاق ہے۔ لہٰذا نفاق میں اضافہ کے سبب خطرات و نقصانات میں اضافہ کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے[۲]۔

تیسرے درجہ میں، صاحبان ایمان اللہ کے اوامر و نواہی کے سامنے اجمالی طور پر نہیں بلکہ تفصیلی طور پر تسلیم ہو جاتے ہیں۔ دین کی پابندی میں یہ تفصیلی طریقہ، ایمان کے ثبات و استحکام کا نتیجہ ہوتا ہے جو بتدریج حاصل ہوتا ہے اور سورۂ بقرہ کی ۱۸۳ویں آیت[۳] اور سورۂ آل عمران کی ۱۳۴ویں آیت[۴] کے مطابق اس کے نتیجہ میں تقویٰ انسان کا ملکہ ہو جاتا ہے[۵]۔ دین کے قلب میں سما جانے کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ضبط نفس کی حالت کے بموجب اس مرحلہ میں گناہ و کجروی کا امکان کم ہو جاتا ہے تاہم اس کی شدت و کمی کے تناسب سے جرائم اور نفاق کی مقدار میں بھی کمی یا بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس درجہ میں ابھی تک

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۹، ص ۴۵۱

۲۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۷

۳۔ یاأیھا الَّذِینَ آمَنُواْ کُتِبَ عَلَیکُمُ الصِّیامُ کمَا کُتِبَ علَی الَّذِینَ مِن قَبْلِکمْ لَعَلَّکمْ تَتَّقُونَ

۴۔ وَ سَارِعُواْ إِلی مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّکمْ وَ جَنَّةٍ عرضُها السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِینَ۔ الَّذِینَ ینفِقُونَ فی السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَ الْکاظِمِینَ الْغَیظَ وَالْعَافِینَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ یحِبُّ الْمُحْسِنِینَ (آل عمران/۱۳۳-۱۳۴)

۵۔ تفسیر نمونہ، ج۳، ص ۹۶-۹۹؛ فضل اللہ، سید محمد حسین، تفسیر من وحی القرآن، ج۶، ص ۲۷۱

دامن دینداری شک و تردید سے محفوظ نہیں ہوا ہوتا اور ایمان و کفر اور گناہ و ثواب کے درمیان انسان کی آمد و شد جاری رہتی ہے[۱]۔

سورۂ حجرات کی پندرہویں آیت[۲] میں دینداری کا ایک ایسا مرحلہ اور درجہ بیان ہوا ہے جس میں انسان قلبی ایمان کے استحکام کی بنیاد پر اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ اس مرتبہ میں شک و تردید کی جگہ یقین لے لیتا ہے[۳]۔ سورہ صف کی دسویں اور گیارہویں آیت[۴] سے بھی یہی بات ہوتی ہے۔ حصول یقین اور ازالۂ شک کے بموجب گناہ و انحراف کے احتمال میں شدید کمی آتی ہے اور پھر سماج کا ڈر انحرافات کی کمی یا بیشی میں کوئی خاص اثر نہیں رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر، یقین کے ذریعہ تقویت ایمان کے سبب منافقانہ انداز میں کمی آتی ہے اور صداقت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اس درجہ میں جرائم حقیقی معنوں میں صفر کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور دینداری کو مکمل تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس سے بالاتر مراتب و درجات میں تقویت ایمان کی بنیاد پر ارتکاب جرم کا احتمال بھی ختم ہو جاتا ہے اور زندگی کے انفرادی، اجتماعی، معاشی، سیاسی الغرض تمام امور میں ایک تحفظ کی کیفیت آ جاتی ہے[۵]۔

سورۂ یونس کی ۶۲ویں آیت[۶] کے مطابق، دینداری کے آخری مرحلہ اور درجہ میں مؤمن دنیا و آخرت کے کسی امر میں خوف، وحشت یا اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ کے سامنے سراپا تسلیم اور مطمئن رہتا ہے۔ اس مرتبہ میں دین اور دینداری ایک دوسرے پر مکمل انطباق رکھتے ہیں۔ اسی طرح سماج کے دینی نمونے جن کا آغاز تیسرے مرحلہ سے ہی ہو چکا تھا، وہ اب عینی و مصداقی حیثیت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ اس درجہ کی دینداری درحقیقت دین کا وہ مثالی معیار ہے جس کی بنیاد پر انسان کے

۱۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۶-۱۸۰

۲۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ رَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

۳۔ تفسیر نمونہ، ج ۲۲، ص ۲۱۳

۴۔ يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَ رَسُولِهِ وَ تُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَ أَنفُسِكُمْ ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ

۵. حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۸ و ۱۸۰-۱۸۲

۶۔ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ

تمام احساسات و جذبات اور افعال و افکار وغیرہ دین پر منطبق ہوتے ہیں، لہٰذا نچلے درجوں کے دیندار افراد اسے معیار دین اور ایک نمونہ کے بطور دیکھتے ہوئے اس کے احساسات و جذبات، اعمال و افعال اور افکار و کردار کو دین پر منطبق سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔

سورۂ عنکبوت کی پینتالیسویں آیت [۱] سے استفادہ کرتے ہوئے، درجۂ دینداری کے ارتقاء کے سبب شرح جرائم میں کمی کا نظریہ مزید واضح ہوتا ہے۔ اگرچہ مذکورہ آیت میں بصراحت نماز کو برائیوں کی روک تھام کا ایک عامل و سبب متعارف کرایا گیا ہے تاہم معاشرہ میں ایسے نمازی افراد بھی ہیں جو اقامہ نماز کے باوجود بہت سے گناہوں کے مرتکب نظر آتے ہیں۔ اس تضاد کا تعلق ان کے درجۂ دینداری سے ہے، اگر چہ نماز دینداری کے دوسرے درجہ کی ایک خصوصیت ہے[۲]۔ لیکن اسی کے ساتھ مذکورہ آیت کی بنیاد پر، گناہوں کے ارتکاب کا احتمال بھی اسی درجہ کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اگر کوئی اسی درجۂ دینداری اور مرحلۂ ایمان میں رہ جائے اور آگے نہ بڑھے، تو اس کے یہاں یہ امکان پایا جائے گا کہ وہ نماز بھی پڑھے اور برائیاں بھی انجام دے۔ بالفاظ دیگر، صرف نماز پڑھ لینا فحشاء و منکرات سے نہیں روکتا بلکہ نماز کے ساتھ ایک اور صفت کی ضرورت ہے تاکہ وہ برائیوں کے مقابلہ میں انسان کو تحفظ فراہم کر سکے۔

دینداری کے خصوصیات کی تحلیل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جیسے جیسے مراتب دینداری ارتقائی منزلوں کو طے کرتے ہیں، نماز کے ساتھ ایک اور عامل کا اضافہ ہو جاتا ہے جو نماز کی تحفظ بخشی کی صلاحیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس عامل و محرک کا نام خشوع [۳] ہے جو دین کے رگ و پے میں سما جانے کے ذریعہ بتدریج حاصل ہوتا ہے۔ دینداری کے چھٹے درجہ میں خشوع اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر سختی ہو یا آسانی، صحت ہو یا مرض، پیری ہو یا جوانی، دولتمندی ہو یا فقر، سردی ہو یا گرمی، صلح ہو یا جنگ، سرداری ہو یا

۱۔ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ

۲۔ حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آن، ص ۱۷۷

۳۔ خشوع مؤمن کے دل میں پیدا ہونے والی ایک حالت کا نام ہے جس کی بدولت انسان کی توجہ تمام دوسری جگہوں سے منقطع ہو کر صرف معبود حقیقی کی جانب ہوتی ہے اور اس کا اثر براہ راست انسان کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا خاشع مؤمن وہ ہے جو زندہ و متحرک ایمان کا حامل ہو اور مقام ربوبیت کی جانب اس طرح متوجہ ہو کہ معبود کے سامنے اپنے آپ کو ذلت و خواری میں غرق پائے اور اپنے دل کو ہر اس شئے سے منقطع کر لے جو اس کے مقصد کی راہ میں حائل و مانع ہو۔ (المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱، ص ۲۳۰)

غلامی، حاکمیت ہو یا محکومیت، اجتماع ہو یا تنہائی، شب ہو کہ روز، ہر حال میں خشوع تمام نمازوں پر سایہ فگن رہتا ہے۔ اس درجہ و مرتبہ میں جس میں تمام نمازوں میں خشوع کا مکمل امتزاج رہتا ہے، گناہ وانحراف کا احتمال صفر کے قریب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ خشوع کی معیت میں نماز تَنھیٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنکرِ کا مصداق بن جاتی ہے۔ الغرض، صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ نماز میں خشوع وہ عنصر ہے جو انحراف و کجروی کے مقابلہ میں نمازی کی سپر بن جاتا ہے۔ کسی بھی نماز میں حالت خشوع ہی یہ اثر پیدا کرتی ہے، چاہے وہ لمحہ بھر کے لئے کیوں نہ ہو۔ دینداری کے پہلے مراتب و درجات میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ نماز میں خشوع کی معیت کے لمحات، عدم معیت کے لمحات کے ذریعہ بے اثر ہو جاتے ہیں جبکہ دینداری کے اعلیٰ درجات میں نماز اور خشوع کی معیت جاری رہتی ہے اور تمام نمازوں پر خشوع کے احاطہ کی بدولت اس کے آثار بھی باقی رہتے ہیں اور انسان کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

نتیجہ

ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ دینداروں میں گناہ، انحراف اور کجروی کا امکان ان کے درجۂ دینداری پر منحصر ہے۔انسان پہلے تینوں درجات ایمان سے بالاتر، ساتویں درجہ کی طرف جتنا نزدیک ہوگا دینداری کا تعلق اس کے باطن سے اتنا ہی مستحکم اور تحفظ بخش ہوتا جائے گا۔ دینداری کے نچلے درجوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں انحراف و کجروی کا خطرہ زیادہ پایا جاتا ہے لیکن دینداری کے درجات میں ارتقاء کے ذریعہ انحراف کا امکان بھی کم ہو جاتا ہے۔ دینداری کے پہلے اور دوسرے درجہ میں صفت نفاق کا امکان زیادہ ہوتا ہے، جس کا براہ راست تعلق دینی معاشرہ میں موجود سماجی دباؤ اور ڈر سے ہے۔ اگرچہ پہلے دو درجوں میں اجتماعی نگرانی یا سماج کے ڈر کے سبب وقتی طور پر جرائم اور بالخصوص بڑے جرائم میں کمی آتی ہے تاہم اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے عنصر نفاق کے سبب ڈھکے چھپے انحرافات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر دینداری کے باوجود اکثر افراد گناہ، انحراف اور کجروی کا شکار نظر آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہ دینداری کے پہلے دو درجوں تک محدود ہیں۔ جب تک دینداری کے درجات میں ارتقاء نہیں آتا اس وقت تک یہ صورتحال تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں معاشرتی برائیوں کے سد باب کے لئے اجتماعی نگرانی اور سماجی خوف قائم کرنے سے بہتر ہے کہ دینداری کے اعلیٰ درجات تک معاشرہ کو لے جایا جائے۔ تب

کہیں جاکر جرائم میں کمی آئے گی اور انسان باطنی طور پر مستحکم ہوگا اور اسی استحکام کے تناسب سے وہ برائیوں کے مقابلہ میں محفوظ ہوگا۔

در حقیقت دینداری کے اعلیٰ مراتب و درجات تک رسائی کے ذریعہ اس کا ایمان دل میں اتر جائے گا اور اس پر کسی بیرونی عنصر کے بجائے اس کے اندرونی عنصر کا ہی کنٹرول ہوگا۔ جتنا دینداری کے مراتب میں اضافہ ہوگا اتنا ہی انسان برائیوں کے مقابلہ میں محفوظ ہوگا اور آخری مرتبہ میں تو گناہ و انحراف حتیٰ خطا کا امکان بھی صفر ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ درجات دینداری کا ارتقاء خود انسان کے ارادہ پر منحصر ہے لہٰذا خود دینداروں کو چاہئے کہ وہ اپنے درجۂ دینداری میں اضافہ کرتے رہیں۔

اندرونی و حقیقی دینداری کے ذریعہ دینداری کی درجہ بندی ہوتی ہے اور اس کے مختلف درجات کا تعین ہوتا ہے۔ ہر درجہ میں انحراف و کجروی کا امکان بھی الگ کیفیت کا حامل ہوتا ہے اور وہ کیفیت اسی درجہ سے مخصوص ہوتی ہے۔ لہٰذا دینداری کے پہلے مرتبہ سے لے کر آخر تک جیسے جیسے دین اندرونی ہوتا جاتا ہے اور دل و جاں میں سماتا جاتا ہے ویسے ویسے انحراف کا امکان بھی کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ بتدریج صفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح نفاق اور منافقانہ رویہ جو کہ دین کے اندرونی نہ ہونے کا نتیجہ ہے، اس کا ظہور بھی دینداری کے ابتدائی مراحل و درجات میں زیادہ ہوتا ہے لیکن بتدریج دینداری کے مراتب کے ارتقاء کے ساتھ اس میں کمی آتی جاتی ہے۔ دینداری کے ہر درجہ و مرتبہ میں، دیندار شخص کے اندر خاص علامتیں پیدا ہوتی ہیں جن کے سبب وہ درجہ دیگر درجات سے متمائز ہوتا ہے، نیز یہ علامتیں اس خاص درجہ سے متعلق اسباب انحراف کے خاتمہ کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔

منابع و مآخذ

- قرآن کریم
- نہج البلاغہ، ترجمہ محمد دشتی، مؤسسہ فرہنگی تبلیغاتی امیر المومنین، قم، ۱۳۷۹
- آخوندی، محمد باقر، حاشیہ نشینی در شہر مشہد و چشم انداز آیندہ، مؤسسہ تحقیقات و مطالعات بین المللی ابرار معاصر شعبہ خراسان (تحقیق منتشر نشدہ)، ۱۳۸۲
- انجمن جامعہ شناسی ایران، آسیب ھای اجتماعی در ایران، انتشارات آگہ، تہران، ۱۳۸۳
- چلبی، مسعود، جامعہ شناسی نظم، نشرنی، تہران، ۱۳۷۵

- ❖ حسن زادہ آملی، حسن ،انسان وقرآن، قیام، قم،۱۳۸۱
- ❖ رابر تسون، یان، درآمدی بر جامعہ ،انتشارات آستان قدس رضوی، مشہد،۱۳۷۷
- ❖ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، مفردات الفاظ القرآن، بیروت دار القلم
- ❖ صدوق، محمد بن علی، الخصال الممدوحۃ والمذمومہ
- ❖ صدیق سروستانی، رحمت اللہ، آسیب شناسی اجتماعی، دانشگاہ تہران ، تہران، ۱۳۸۵
- ❖ طباطبائی، سید محمد حسین ،ترجمہ تفسیر المیزان، دفتر انتشارات اسلامی جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ ، قم، ۱۳۷۴
- ❖ طبرسی، فضل بن حسن ، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ناصر خسرو، تہران،۱۳۷۲
- ❖ طبرسی، فضل بن حسن، مشکاۃ الانوار فی غرر الاخبار، نشر المکتبہ الحیدریہ ، نجف اشرف،۱۳۷۷
- ❖ فضل اللہ، سید محمد حسین، تفسیر من وحی القرآن، دار الملاک للطباعہ والنشر، بیروت،۱۴۱۹
- ❖ کلینی، محمد بن یعقوب ،اصول کافی، ترجمہ کمرہ ای، اسوہ، قم، ۱۳۶۳
- ❖ لیتل دانیل، تبیین در علوم اجتماعی، ترجمہ عبد الکریم سروش، صراط، تہران،۱۳۸۱
- ❖ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدرر الائمۃ الاطہار، ، انتشارات اسلامیہ، تہران
- ❖ محسنی تبریزی، علی رضا ، وندالیسم، انتشارات آن، ۱۳۸۳
- ❖ مکارم ملامہدی، جامع السعادات، چاپ سنگی، تہران، ۱۳۱۲

دین اسلام کا سیاسی رخ اور گلوبلائزیشن

مؤلف: ڈاکٹر غلام رضا بھروز لک
مترجم: مولانا مہدی باقر خان

گذشتہ دو صدیوں میں مسلمانوں کی فکر و عمل کی دنیا میں، سیاسی اسلام ایک اہم تصور کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ عالمی سیاست میں مغربی جدت پسندی اور سیاسی اسلام کے مابین چشمک بالخصوص مغربی جدیدیت کی تعلیمات سے نبرد آزمائی کے حامی، بین الاقوامی سطح پر دین اسلام کے سیاسی رخ کو متعارف کرانے کا اہم سبب رہے ہیں۔ سرد جنگ کا اختتام اور سوشلزم پر مبنی سیاسی نظام کی زوال پذیری جسے مغرب کا آزاد اقتصادی نظام اپنے لئے خطرے کی گھنٹی سمجھتا تھا تاہم روز بروز اسے داخلی مشکل مسائل اور نت نئ تنقیدوں کا سامنا تھا نیز دوسری طرف مسلم ممالک میں اسلامی تحریکوں اور نہضتوں کا معرض وجود میں آنا باعث ہوا کہ مغربی دنیا، سیاسی اسلام کی طاقت و توانائی کی طرف مزید متوجہ ہوئی یہاں تک کہ اسے سرخ خطرہ ہونے کے بجائے اسلام کے سبز خطرہ ہونے کی بات ماننی پڑی۔ دین اسلام کے سیاسی پہلو کی اہمیت گذشتہ چند دہائیوں بالخصوص ایران کے اسلامی انقلاب اور انتفاضہ فلسطین کے بعد مزید آشکار ہو گئ ہے۔

گذشتہ دو صدیوں میں دنیائے اسلام کی در پیش دو بنیادی پریشانیاں اسلامی ثقافت کی اندرونی زبوں حالی اور مغربی جدت پسندی کی چوطرفہ یلغار سے تعبیر ہیں۔ مفکرین اسلام نے مغربی دانشوروں کے برخلاف اسلامی معاشروں کو موجودہ بحران سے نجات دلانے کے لئے نہ جدید یورپ کا اتباع اور نہ ہی عہد قبل اسلام کی طرف بازگشت کا مشورہ دیا ہے بلکہ اسلام کے روشن ماضی اور اس کی سنت و اقدار کی طرف رجوع کرنے کو عظمت رفتہ کی بازیابی کا طریقہ جانا ہے۔ اس رو سے اسلامی معاشرہ کی نوسازی اور اس کی بیداری کی اسلامی تحریکیں، مغربی جدیدیت کے مقابل ایک نظریہ بن کر ابھری ہیں تاہم اسے اسلامی معاشروں میں مغرب پرستی کے خلاف رد عمل کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کشمکش پچھلی دو دہائیوں میں اپنے عروج کو پہونچ چکی ہے۔ اس دوران مغربی جدیدیت نے ایک غیر اسلامی رجحان کو بھڑکانے والے

عنصر کا کام کیا ہے جس کے نتیجہ میں اس سماج کے لوگ مغربی جدت پسندی کے مقابل اور اپنے اپنے ممالک میں حاکم تقریباً جدید اور مغرب نما حکومتوں کی اسلام سازی اور اس کے احیاء کے درپے ہو گئے۔ ان ایام میں مسلم معاشروں کا اصل جھگڑا ان حاکموں اور حکومتوں سے تھا جو مغربی جدت پسندی کی تاسی میں اندھی ہو چکی تھیں۔ جس شدت و طاقت سے مغرب زدہ جدید حکومتیں اسلامی معاشرہ پر حکمرانی کرتی تھیں اتنی ہی شدت وصلابت سے مسلمان سیاسی بیداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ سیاسی اسلام کا مغربی جدیدیت سے چند الگ الگ انداز میں اب تک تقابل کیا جا چکا ہے۔ پھر بھی گذشتہ چند دہائیوں میں دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات نے سیاسی اسلام کو نئے حالات سے روبرو کرایا ہے۔ مغربی جدیدیت سے متعلق خود مغربی مفکرین کا تنقیدی رخ اور مابعد جدیدیت اور آفاقیت جیسے نعروں نے دنیا میں اس نظریہ کو نئے حالات سے دوچار کرا دیا ہے۔

اس مضمون میں تجزیہ کا موضوع تازہ حالات کی نوعیت، مشکلات اور امکانات، دین اسلام کے سیاسی نقطۂ نظر سے ہے[۱]۔ کیا آفاقیت اپنا مضمون ومنشور ہے یا محض وہ تازہ حالات جس کے نتیجہ میں مختلف مکاتب فکری کے درمیان نزاع اور تقابلی صورت حال پیدا ہو گئی ہے؟ کیا آفاقیت سیاسی اسلام اور مغربی جدیدیت کے مابین گذشتہ تقابلی کشمکش کا استمرار ہے یا بیسویں صدی کے مقابلہ اسلام کی طرف عالمی جھکاؤ کے تئیں قدرے مختلف حالات فراہم کرنے والا ہے۔ تازہ ترین صورتحال میں سیاسی اسلام کے لئے کیا بہتر مواقع ہیں؟ کیا تازہ حالات اسلامی رجحانات کے عالمی فروغ کے لئے مزید سازگار ماحول فراہم کر سکتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ میں کوشش یہ ہے کہ مذاکراتی تجزیوں سے استفادہ کیا جائے چنانچہ اس کے لئے مذاکرات کے عالمی منشور کے باب میں موجود مواد کے تجزیہ وتنقید کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ براہ راست آفاقیت پر گفتگو کرنا اس سے مختلف عالمی منشور کے اختلافی نکات پر گفتگو کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ زیر نظر مقالہ کی رو سے، آفاقیت رقابت مذاکراتی اختلافات اور سیاسی ونظریاتی مسائل کے لئے ایک ایسی تازہ صورت حال ہے جو نئے مسائل ومشکلات سے ہم آغوش ہے۔

اس مقالہ میں سیاسی اسلام سے مراد اپنی بحث وگفتگو ہے جو داخلی طور پر چاہے جتنی متنوع ہے مگر مجموعی طور پر اس میں اسلامی تشخص کا احیاء ہی مرکزی خیال کی حقیقت رکھتا ہے چنانچہ اسلامی مفکرین ہمیشہ

۱۔ موثقی، سید احمد، جنبشہای اسلامی معاصر، ص ۹۴

اپنے سیاسی مستقبل پر غور وخوض کرتے وقت اسلامی تعبیرات واصطلاحات سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنے سیاسی مستقبل کو اسلام میں ہی تلاش کرتے ہیں۔[۱]

سیاسی اسلام کیا ہے؟

اسلام کے سیاسی رخ کی وضاحت کیسے کی جا سکتی ہے یا یوں کہا جائے کہ اسلام کس طرح گلوبلائیزیشن سے تعاملات کر سکتا ہے؟ کیا واقعاً اس کا وجود ہے یا محض یہ مختلف فکری رجحان کا تنوع ہے؛ یہاں دو باتیں اہم ہیں پہلے سیاسی اسلام کے تصور کی وضاحت اور دوسرے اس کی نظریاتی حقیقت کی تشکیل۔

سیاسی اسلام وہ عنوان ہے جو اس کے سیاسی جہات کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی، اسلامی بیداری، شدت پسندی اور اسلامی رجحانات جیسے الفاظ وترکیبیں ان مباحث میں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے محقق نے اس سلسلے میں مختلف اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔

واضح رہے کہ بنیاد پرستی اور شدت پسندی جیسی اصطلاحات کسی بھی لحاظ سے اسلامی تحریکوں کی اصلی کیفیت بتانے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ دینی بنیاد پرستی دراصل مغربی عیسائیت سے جنمی ہوئی فکر ہے جس کا تعلق امریکہ کے بیسویں صدی کے اوائل سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں سے ہے[۲]۔ اس لحاظ سے وہ دنیائے اسلام کے عصری رجحانات سے مختلف ہے[۳]۔ اسلامی شدت پسندی چونکہ مغربی نقطۂ نظر سے سیاسی مسائل میں اسلامی اقدار کی مداخلت سے تعبیر ہے لہٰذا اس نکتہ کے توصیفی معنی کی رو سے کسی نظریہ یا سیاسی عمل کو بیان کرنے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ شدت پسندی بنیادی طور پر ایک ایسی صفت کا نام ہے جو کسی سیاسی نقطۂ عمل کی تعریف وتوضیح کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تفکر سے متعلق عمل میں اعتدال بھی ہو سکتا ہے اور شدت پسندی بھی چنانچہ اسلامی مکتب فکر کے سیاسی رخ پر گفتگو کے لئے سیاسی اسلام اور اسلامی رجحان جیسی تراکیب کو بنیاد پرستی اور ریڈیکلزم جیسی اصطلاحات پر اولویت حاصل ہے۔

۱۔ بابی، سعید، ہراس بنیادین: اروپامداری وظہور اسلام گرایی، غلام رضا جمشیدیھا وموسی عنبری، ص ۲۰

۲۔ Eliade, Encyclopedia of Religion, Macmillan Publishing Company, Inc, Electronic edition produced by Infobases, Inc., Provo, Utah.

۳۔ بھروزلک، غلام رضا، ومہدویت وجہانی شدن، کتاب نقد، ش ۲۴

ایک اہم فکری و نظریاتی مسئلہ یہ ہے کہ اسلام وسیاسی دین اسلام میں پائے جانے والے تمام رجحانات پر دلالت کرتا ہے؛ کیا اس عنوان کے ذیل میں اسلام کے سیاسی رخ اور آفاقیت کے مابین ہونے والی رقابت پر گفتگو کی جاسکتی ہے ۔ یہ سوال اس لئے اٹھتا ہے چونکہ بعض نے سیاسی اسلام سے متعلق مسلمانوں کے داخلی اختلافات کے سبب اس کی ہمہ گیریت اور معتبریت پر سوال اٹھائے ہیں[۱]۔ اس اعتبار سے اسلام کے تئیں پائے جانے والے افکار ورجحانات میں یکجہتی اور یکرنگی نہیں پائی جاتی چونکہ مختلف الجہات افکار کی بہتات اور کبھی کبھی متعارض نظریات کے سبب ان سب رجحانات کو کوئی ایک نام دینا دشوار ہے چنانچہ عام طورپر ان سب کو اسلامی رجحانات کا عنوان دیا جاتا ہے ؛ یہ اس کا ایسا استعمال تھا جس سے مغربی طاقتوں کی تمام ترجمہ تفریقی اور امتیازی پالیسیوں کے باوجود اسلام سے جڑے تمام افکار ورجحانات کو ایک عنوان کے تحت استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ مشرقی مطالعات کی وہ شکل قرار پاتا ہے جسے ماڈرن عرب نے اسلام سے اپنی تفکیک و شناخت کے لئے ایجاد کیا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطۂ نظر سے اسلام کے مختلف نظریات کو سمجھنے کے لئے مستشرقین کی معکوس تھیوریاں وجود میں آتی ہیں یا ایک مضبوط مغربی مطالعات کا تصور ابھرکے آتا ہے ۔ سرپھرے اورینٹلسٹ نے اسلام کا وہ نام نہاد تصور پیش کیا ہے جس سے ان کی اس دین کو ہلکا کرکے دکھانے کی کوشش صاف نظر آتی ہے ، ان کے لئے اسلام ، کسی چسپاں کردینے والی شی سے زیادہ کی حقیقت نہیں رکھتا ہے ۔ اس کی ساری اہمیت ان کی رو سے محض ان معنی مفاہم کی وجہ سے جو وہ بنام اسلام اس دین سے ملحق کردیتے ہیں[۲]۔

اس طرز تفکر کے مقابل اسلام کے آفاقی مذاکراتی منشور کو مد نظر رکھتے ہوئے ایجابی گفتگو کی جاسکتی ہے ۔ دور حاضرین میں ، دنیائے اسلام ایک ایسے حالات سے روبرو ہے جس کی خصوصیات اور تاثیر گزاریاں اسلامی برادری قربت ویکجہتی کی فضا بھی مرتب کرسکتا ہے چنانچہ ہمیں ایسے مطالب تلاش کرنے چاہئے جو مسلمانوں کے مابین تالیف قلوب کا باعث ہوں تاہم مذاکراتی منشور کی تحلیل کے وقت ایسے محور تلاش کرنے چاہئے جو اتحاد کو فروغ دینے والے ہوں؛ کسی بھی گفتگو میں ہی وہ بنیادی بات ہے جس سے

۱۔ El-Zein, Abdul Hamid, 1977, "Beyond ideology & Theology" ,in: Annual Review of Anthropology, VI.

۲۔ ہراس بنیادین: اروپامداری وظہور اسلام گرایی، ص ۷۴

اس کی سمت وسو، معین کی جاسکتی ہے[1]۔ اس رو سے سیاسی اسلام ہی وہ موضوع گفتگو ہے جس سے اس دین کے سیاست عملی کا تشخص طے کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی اسلام کی گفتگو میں اسلام محور اصلی ہوتا ہے[2]۔ تاہم یہ اس میں محض اعتقادی موضوع کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ انتہائی آفاقی جہتوں کو اپنے اندر سمائے رہتا ہے اور پوری انسانی زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔ اس طرح کا طرز تفکر تقریباً تمام ایسی فکری رجحانات کا جس کا اسلامی سیاست سے تعلق ہے مشترک ہے چنانچہ ان سب کو اسلامی سیاست کے زمرہ میں شمار کی جاسکتا ہے، دیگر نظریات کی رو سے جیسے الیویہ روا، ہشام شرابی وغیرہ جن کا تذکرہ آگے آئے گا ایک دوسرے قسم کے سیاسی اسلام کا مشاہدہ کریں گے اور اسلامی سیاسی کے تئیں ایک جامع نگاہ کا تصور انتہائی دشوار ہے۔

سیاسی اسلام اور اس کے نبوغ کے شرائط؛ مغربی جدیدیت کا چیلنج

گلوبلائزیشن کے مقابل سیاسی اسلام کا استمرار، استحکام اور زوال پذیری اس کے منصّہ شہود پر آنے کے علل واسباب پر منحصر ہے، اسلام کا سیاسی نبوغ گذشتہ دو صدیوں میں اسلام سے جڑی تمام سرگذشت میں سب سے اہم مباحث میں سے ایک ہے دین اسلام کا سیاسی تصور دراصل اسلامی معاشروں کو درپیش مسائل سے جوجھنے کے پیش نظر معرض وجود میں آیا ہے۔ ہرایر دکمجیان نے اپنے تجزیہ میں عصری اسلامی تحریکوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ اس کے مختلف ادوار کو گاہے بگاہے اسلامی معاشرہ میں پیش آنے والے مسائل کے ساتھ تحلیل کرے چنانچہ اس نے ابن خلدون سے استناد کرتے ہوئے اسلامی معاشرہ کا اسے درپیش تغیرات سے ادوار میں تقابل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے تجزیہ میں اسلامی معاشروں کی عصری تحریکیں، تشخص، احکام اور ثقافت سے متعلقہ مسائل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان تمام مسائل کی جڑ اسلام معاشروں کا جدیدیت کے ساتھ رقابتی رویہ ہے۔ دکمجیاں کی رو سے اسلامی تحریکیں انہی بحرانی کیفیتوں کا ردعمل ہیں[3]۔ اس کی نظر میں اسلام نے حاشیہ پر جانے اور اپنے آپ میں غرق ہونے کے بجائے

۱۔ Laclau & Mouffe, 2001Hegemony & Socialist Strategy , London: Verso,2nd Ed.

۲۔ ہراس بنیادین: اروپامداری و ظہور اسلام گرایی، ص۲۰

۳۔ دکمجیان، ہرایر، اسلام در انقلاب: جنبش ہای اسلامی در جہان عرب (بررسی پدیدہ بنیاد گرایی اسلامی)، ترجمہ حمید احمدی، ص۳۱

جیسا کہ مغربی دنیا میں عیسائیت کے ساتھ ہوا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور یہی سبب بنا کہ وہاں کے دیندار عوام اور ان کی حکومتوں میں کشمکش پیدا ہوئی[۱]۔

پھر بھی دکجیان نے محض اس کے بحرانی عوامل پر توجہ کی مگر سیاسی اسلام کے مغربی جدیدیت کے ساتھ تعامل پر قطعاً تحلیلی رخ نہیں اپنایا۔ کیا اسلامی تحریکیں ماڈرنزم کے مقابلہ اسلامی تشخص کو ثابت کرنے میں کامیاب رہیں ہیں یا نہیں اور اسلامی تحریکوں کو ایک مستقل رجحان کی حیثیت حاصل ہے یا نہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جو دکمجیاں کے تجزیہ میں تشنہ توضیح ہیں ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کو اس دین کو درپیش مسائل سے جوڑکے پیش کیا جائے۔ ایک الگ گفتگو میں الویہ روا نے[۲] کوشش کی ہے کہ سیاسی اسلام اور اس کے ظہور و نبوع حتی اس کی شکست کا جائزہ لے۔ اس نے سیاسی اسلام سے کو اس دین کی تجدید کاری کے رو سے دیکھا ہے۔ روا، دیکجبان کے مقابلہ سیاسی اسلام سے کم متفق ہیں اور اسے وقتی مانتے ہیں۔ اس نے اسلام کے تازہ فکری رجحانات کو روایتی علما یا بنیاد پرستوں اور اسلام سیاسی کے حامیوں[۳] کے مابین تقسیم کر دیا ہے اور اس نبرد آزما عنصر کو جسے اس نے سیاسی اسلام سے تعبیر کیا ہے اسلامی معاشروں کے سماجیات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے دینی سماج کے اقتصادی، اجتماعی اور مشرق وسطیٰ کی حکومتوں کے بحرانی مسائل کا نتیجہ قرار دیا ہے جہاں ان علاقوں سے شہروں کی طرف وسیع پیمانے پر ہجرتیں ہوتی ہیں[۴]۔

ایسے میں سماج کے پڑھے لکھے لوگ جو خود تمام اسلامی تحریکوں کا سرچشمہ ہیں احساس محرومی اور بے اہمیتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ گروہ اپنے ساتھ درپیش اس محرومی کے حالات کی وجہ سے ایک نظریہ کا سہارا لیتا ہے اور اپنی سماجی زندگی میں پائے جانے والے خلا کو اس سے پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس نظریہ کے سہارے انقلاب اور مضبوط حکومت جیسے خواب دیکھتا ہے۔ روا کی رو سے سوشلسٹ رجحانات کی معاشرہ میں شکست کے بعد پڑھے لکھوں کے اسلامی نظریات ایسے ہی حالات میں پھلتے پھولتے ہیں بہرحال اس کے نقطۂ نظر میں اہم بات یہ ہے کہ سیاسی اسلام، شریعت اسلامی کے تجدد کا ذریعہ اور بدل نہیں ہے لہٰذا

۱۔ جنبش ہای اسلامی در جہان عرب، ص ۲۳

۲۔ روآ، الیویہ، تجربہ اسلام سیاسی، محسن مدیر شانہ چی و حسین مطیعی امین،

۳۔ ایضاً، ص ۳۵۔۲۱

۴۔ ایضاً، ص ۵۹و۵۸

اس تحریک کی شکست بھی یقینی ہے[۱]۔ رواکے نظریات کاخلاصہ یہ ہے کہ نا مطلوب اسلامی رجحانات معاشرہ کو عدم مذہبیت اور سیکولرزم کی طرف لے جاتے ہیں کیونکہ اہل اسلام نے جو تازہ راستہ اختیار کیا ہے وہ آخر میں عام اوررائج سیاست کارخ اختیار کرلے گا[۲]۔ جیساکہ رواکے تجزیہ سے صاف واضح ہے کہ اس کی فکری بنیادیں معاشروں کو ایک نئے مغرب کی تعمیر کی طرف جھکاؤپر وار کرتی ہیں۔ جس کی بنیاد پر وقتی طورپر اقتصادی اور اجتماعی بحران کے پیش نظر سیاسی اسلام جیسے افکار معرض وجود میں آرہے ہیں اور انہیں آخر میں شکست کاہی سامنا ہونا ہے۔

ہشام شرابی [۳] کے کام کو بھی اسلام گرائی کی ساجیات کاایک حصہ شمار کیاجاسکتا ہے۔ شرابی نے کوشش کی ہے کہ روایتی قسم کے معاشروں کو جہاں مردوں کو سب پر بالا دستی حاصل ہوتی ہے اسلامی معاشرے کے تجزیہ کاذریعہ قرار دیا جائے مگر سرانجام اس نے دنیائے عرب کے سیاسی وسماجی حالات کوبنیادی محور قرار دینے کے باوجود مسلمانوں کے بنیاد پرستانہ نظریات پر ہی زیادہ توجہ دی ہے چنانچہ اس کی تحقیق میں بنیاد پرستانہ نظریات کو سرمایہ کارانہ نظام کے ساتھ ملاکے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے مطابق یہ بنیادپرستی کی وہ قسم ہے جو سرمایہ دارانہ فکر سے ملکر اپنی روایتی کیفیت سے الگ ہو گئی ہے اس طرح سے کہ اس میں وہ قدامت پسندانہ اور اصلاح طلبانہ مزاج نہیں ہے بلکہ دین اسلام کے تشخص کی موجودہ بحرانی کیفیت کے پیش نظر ایک جدید، سیکولر اور جمہوری وآزادی بخش [۴] دین کے طورپر دنیائے عرب میں نظر آتا ہے۔ شرابی نے اپنی تالیف میں جو نتیجہ پیش کیا ہے اس میں ایک ایسی زندگی اور معاشرہ کو پیش کیا ہے جس میں عورتیں انقلابی تحریک میں پیش پیش ہیں اور جمہوریت کی روایتی انداز پر تنقید کی جارہی ہے [۵]۔

چنانچہ اس قسم کی نتیجہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شرابی بھی رواکی طرح مغربی جدیدیت کے نقطۂ نظر سے اسلام کے تازہ افکار ورجحانات کو دیکھتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ اسلام کی طرف بڑھتے رجحانات عرب سرزمین پر ایک عبوری دور میں ہے اور یہ گذر جائے گااور جدید تہذیب اس کی جگہ لے لیگی تاہم ایک سیکولر

۱۔ تجربہ اسلام سیاسی، ص ۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۳۔ شرابی، ہشام، پدر سالاری جدید، سید احمد موثقی

۴۔ ایضاً، ص ۲۴۴

۵۔ ایضاً، ص ۲۴۴-۲۳۱

ڈیموکریٹک نظام وہاں بھی غالب آجائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شرابی کے نظریہ میں اسلامی معاشرہ کے بنیاد پرستانہ رویے میں مردوں اور عورتوں کا شانہ بشانہ رہنا اور اس سماج کا جدیدیت کی طرف آگے بڑھنا جس میں سرمایہ دارانہ تفکر کی آمیزش بھی ہے سب سے خاص بات ہے۔

۱۹۷۰ کی دھائی تک مغربی ممالک میں رائج سماجی رجحانات سے قطع نظر، بعض نے اسلامی معاشروں میں جنم لینے والی تحریکوں کو الگ انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے البتہ عصری اسلامی تحریکوں کو سمجھنے کے لئے ان کے گذشتہ سماجی تحریکوں سے فرق کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے[۱]۔ اس چیز کو کاستلز کے یہاں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس نے سماجی تحریکوں کی تحلیل میں اس کا ذکر کیا ہے [۲]۔ اس کے مطابق سماجی تحریکوں میں ۳ چیزیں بہت اہم ہیں۔ تحریک کی نوعیت مخالفین تحریک اور اس کا سماجی نقطہ نظر اور مقصد کاستلز کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ ان تمام تحریکوں کو جو اس گلوبلائزیشن کے دور میں ظہور پذیر ہو رہی ہیں ان کی نوعیت کی بنا پر ہی تعریف کی جائے چنانچہ اس نے ان کی تشخیص کے لئے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

تحریکوں کی وہ صورت حال جو موجودہ حالت کی وجہ سے وجود میں آئے، مزاحمتی کیفیت کہ جو اپنی مفاد پرستی اور مزاحمت سے پہچانی جائے اور تیسرے وہ تحریک جس کی سیاست عملی طے شدہ ہو اور محض مزاحمت کے رد عمل تک محدود نہ ہو۔

اس لحاظ سے کاستلز کی نظر میں تمام دینی تحریکیں مغرب کی غیر ترقی یافتہ معاشروں سے تقابل کے نتیجہ میں وجود میں آئیں البتہ اس کی شروعات مغرب کی بالادستی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے [۳]۔

سیاسی اسلام اور مغرب کے مابین تقابلی تجزیہ میں بابی سعیدی کی کوشش یہ رہی ہے کہ بیسویں صدی میں اسلام کے سیاسی رجحانات کو مابعد جدیدیت [۴] اور لاکلائیو اور معرفہ کی مذاکراتی تحلیل کی بنیاد پر پیش کیا جائے۔ اس کے پیش نظر، سیاسی اسلام ایک ایسا منشور ہے جو خالص مقامی طور پر وجود میں آئے اور

۱۔ مہدویت وجہانی شدن

۲۔ نش، کیت، جامعہ شناسی سیاسی معاصر، محمد تقی دلفروز

۳۔ کاستلز، مانوئل، عصر اطلاعات: اقتصاد، جامعہ وفرہنگ، ترجمہ حسن چاوشیان وہمکاران، تہران، طرح نو، ج ۲، ص ۲۴، ۲۶

۴۔ ہراس بنیادین: ارو پامداری و ظہور اسلام گرایی

جدیدیت کی بنیاد پر تشکیل پائے۔ اسلامی تشخص پر حملہ جس کی بنیادیں رسولؐ اور ان کی شریعت پر ایمان اور ان کی خلافت و جانشینی کے اعتقاد پر استوار ہیں باعث بنا کہ دین اسلام کے سیاسی و تحریکی رجحانات کا احیاء ہوا اور اس آواز کو دبانے والی طاقتیں ناکام ہوئیں اور رفتہ رفتہ اسلامی معاشروں و اسلامی پیروکاروں کی سیاسی بیداری کی آواز ہمہ گیر ہوتی چلی گئی۔ بابی سعید کا تجزیہ لیوتار کی تھیوری پر مشتمل ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اسلام کا سیاسی چہرہ میں وہ بدل تھا جس نے مغربی جدیدیت یا یورپ کی قطبی اور مرکزی حقیقت کو چیلنج کیا در حالیکہ دیگر سیاسی نظریات جیسے اشتراکیت آزاد خیالی اور جدیدیت کے اصولوں سے مقابلہ نہ کر پانے کی وجہ سے عملی طور پر یورپ کی بالادستی کو نقصان نہیں پہنچا سکے، نتیجہ میں محض اسلام کا سیاسی رخ ہی ہے جو ۱۹۸۰ کے دہائی سے اب تک حالات کو متاثر کئے ہوئے ہے۔

مجموعی طور پر مذکورہ بالا تمام تجزیوں میں مذاکراتی تجزیہ سب سے بہتر طریقہ سے سیاسی اسلام کی ظہور پذیری کو عصر حاضر میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تاہم شرابی جیسے لوگوں کے تجزیے مغربی جدیدیت کی برتری کے سیاسی اسلام سے تقابل کو صحیح ڈھنگ سے نہیں پیش کر سکتے کیونکہ وہ مغربی تسلط زدہ نقطہ نظر سے، سیاسی اسلام کا تجزیہ کرتے ہیں چنانچہ یہ نظریہ، روائی نظر میں سیاسی اسلام کے شکست اور شرابی کی نظر میں اسلامی رجعت پسندی سے تعبیر ہے۔ کاستلز کی تھیوری باوجود اس کے کہ مغربی تفکر سے بہت متاثر نظریات پر استوار نہیں پھر بھی سیاسی اسلام کا دیگر معاصر نظریات سے صحیح تقابل نہیں پیش کر سکا۔

گلوبلائزیشن اور اس کی تعریف

گلوبلائزیشن ایسا موضوع ہے جو گذشتہ چند دہائیوں سے پوری دنیا میں خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے، اس سے متعلق الگ الگ قسم کی تحلیل اور نظریات معرض وجود میں آچکے ہیں، سر دست اس کی نوعیت اور کیفیت پر گفتگو مقصود ہے جس میں مختلف میدانوں جیسے اقتصادیات سماجیات، ثقافت، سیاست اور مختلف نظریات کی روشنی میں آفاقیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پائے جانے والے نظریات کو ۳ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں سب سے پہلے اس سلسلہ کی شروعات دوسرے اس کا ایک عالمی پروجیکٹ کی شکل اختیار کر لینا اور تیسرے ایک مسلم الثبوت رجحان کی شکل اپنا لینا شامل ہے۔ یان شولت نے گلوبلائزیشن کے

۱۔ جامعہ شناسی سیاسی معاصر، ص ۵۱

الگ الگ معنی تحریر کیے ہیں، اس کا عالمی و آفاقی ہونا، آزادی کی یقین دہانی، اس نعرہ کی ہمہ گیریت، مغربی مقبولیت یا امریکی رنگ میں ڈھلنا ایک نیا دائرہ اثر تشکیل دیتا ہے[1]۔ مذکورہ بالا تمام صاحبان نظر نے آفاقیت کو ایک خاص تناظر میں دیکھا ہے اور اگر ہم گلوبلائزیشن کو عالمی مذاکراتی موضوع کی حیثیت سے جانچنا پرکھنا چاہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس موضوع سے متعلق نقطہ ہائے نظر کی نہضت کا اندازہ لگانا ہوگا چنانچہ ہم ان نظریات کا جائزہ لیں گے جس میں گلوبلائزیشن کو عالمی موضوع کی حیثیت سے برتا گیا ہے۔

عالمی مذاکرات اور گلوبلائزیشن کا تجزیہ

گلوبلائزیشن، عصری ادب و نگارشات میں الگ الگ نقطہ نظر سے بحث و گفتگو کا موضوع رہا ہے البتہ اس میں آفاقیت کی نوعیت و کیفیت سے قطع نظر زیادہ تر اس کی روش پر توجہ کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے آفاقیت کو کسی عالمی منشور کے تجرباتی موضوع کے طور پر دیکھا جائے۔ سردست مواد میں نظریات کا خاصہ اختلاف نظر آتا ہے۔ شبہات اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ بعض نے اپنے نظریات کی خاطر خواہ تشریح و وضاحت نہ کرتے ہوئے آفاقیت پر اپنا تجزیہ پیش کر دیا ہے در حالیکہ عالمی منشور و مذاکرہ کے سلسلے میں نظریات الگ الگ ہیں پہلے ہم کوشش کریں گے اس سلسلے میں موجود نظریات و تحلیلوں کو پیش کریں پھر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

نورمن فرکلاس نے گلوبلائزیشن سے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے:

عملی طور پر آفاقیت سے ایک خاص قسم کا موضوع گفتگو سمجھ میں آتا ہے در حالیکہ یہ محض گلوبلائزیشن کی قسم ہے جسے ایک ناقابل تبدیلی واقعیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے نئے آزاد خیالی کی روش اور تازہ سیاسی ترجیحات پر استوار آفاقیت کا ایک سلسلہ ہے[2]۔

اگر ہم فرکلاف کے نظریہ کو لاکلائیو اور موفہ کے بیانات کی بنا پر سمجھنے کی کوشش کریں تو گلوبلائزیشن کی نئی قسمیں اور جہتیں دریافت ہوں گی جیسا کہ دوسروں نے بھی گلوبلائزیشن کے نظریاتی اور

۱۔ Lyotard, J.F. The Postmodern Condition: a Report on knowledge, trans. By G.Bennington & Massumi, Manchester, Manchester University Press, 1984.

۲۔ شولت، یان، نگاہی موشکافانہ بہ پدیدہ جہانی شدن، مسعود کرباسیان

متنوع ہونے کی بات کہی ہے[۱]۔ کہ ہم آج کسی ایک منشور پر عالمی مذاکرہ کے بجائے مختلف اور کثیر الجہات گلوبلائزیشن سے روبرو ہیں۔

درحالیکہ مذکورہ نظریہ کے مقابل بعض نے عالمی سطح پر ایک موضوع گفتگو ومذاکرے کی بات کہی ہے جیساکہ محمد رضا تاجک لکھتے ہیں:

ایک لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ گلوبلائزیشن، عالمی منشور یا عصری تہذیب سے ماوراء چیز ہے، دیگر موضوعات گفتگو کی طرح گلوبلائزیشن کا دیومالائی موضوع بھی طاقت مزاحمت شناخت، متن، حاشیہ، داخلی مسائل، بیرونی مسائل، سنجیدہ سرگذشت، کھیل کی زبان، سچائیاں، تظاہر ماورائی تصورات وغیرہ سے تشکیل پایا ہے[۲]۔

ان کی رو سے گفتگو کا ماورائی اور عصری تہذیب سے پرے ہونا قدرے ابہام کا سبب ہے، گفتگو کا ماورائی تصور اس کے تجزیہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے باوجود اسی کے کہ بعض گفتگو سے متعلق نظریات، اور فرکلاف کی طرح غیر مذاکراتی چیزوں کو قبول کرتے ہیں مگر گفتگو کا ماورائی تصور ان نظریات میں پیش نہیں کیا گیا ہے لاکلائیو اور موفہ کی سطح نظر کے مطابق گفتگو میں خارجی عناصر نہیں پائے جاتے چنانچہ سب کچھ خود گفتگو کی مرکزیت کے پیش نظر قابل وضاحت ہے[۳]۔ اسی جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کا سفر ہر طرح کی دیومالائی تہذیب کے منافی ہے لہٰذا تہذیب کا ماورائی تصور اور گلوبلائزیشن ایک دوسرے کی ضد ہیں تاجیک نے کوشش کی مختلف چیزوں کو بغیر صراحت ووضاحت کے گلوبلائزیشن کے تعلق سے پیش کرے مگر آخر میں کاسٹلز کے نظریہ کی تاسی کرتے ہوئے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے گلوبلائزیشن میں مختلف چینل یا قانونی اور مزاحمتی عناصر پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے ہمیں عالمی گفتگو کو جدیدیت مان لینا چاہئے[۴]۔ دیگر افراد جیسے گیڈنز[۱]۔ گلوبلائزیشن کے جدید ہونے پر مصر ہیں اور گلوبلائزیشن اور وجدیدیت کو یکساں مانتے ہیں۔

۱۔ Fairclough, Norman, Languaage and Power, London, Longman, 2001, P 207.

۲۔ تاجیک، محمد رضا، جہانی شدن وہویت، در رہیافتہای سیاسی وبین المللی، ش ۳، تابستان، ۱۳۸۱

۳۔ Jorgensen, Marianne & Philips, Louis, Discourse Analysis As theory & method, London, Sage Publication, 2002.

۴۔ عصر اطلاعات: اقتصاد، جامعہ وفرہنگ

بعض نے گلوبلائزیشن کو پوسٹ ماڈرنزم سے تعبیر کیا ہے۔ سید عبد العلی قوام اپنی کتاب " جہانی شدن وجہان سوم " میں گلوبلائزیشن کو پوسٹ مابعد جدیدیت کا عبوری دور تصور کیا ہے۔ ان کی نظر میں گلوبلائزیشن کی سب سے اہم خاصیت اس سے متعلق گفتگو کے قواعد کی تشکیل ہے، یہ قواعد انتہائی نامحسوس طریقہ سے جدیدیت کی تہوں میں پوشیدہ ہیں اس لحاظ سے اسی جدیدیت کی طرح جو فوکو کی نظر میں عہد قدیم کے شکم ہی کی پیداوار ہے اور اسی سے ظہور پذیر ہوا ہے آفاقیت بھی اسی قسم کے عناصر کا نتیجہ ہے۔ اس اعتبار سے آفاقیت اور جدیدیت دو الگ الگ جہتیں قرار پائیں گی جن کا آپس میں تقابل کیا جانا چاہئے البتہ یہ دھیان رہے ، کہ جدیدیت یورپ کی پیداوار اور سب کی افسانوی و دیو مالائی تخلیقات کے سبب وجود میں آئی ہے مگر گلوبلائزیشن ایک ایسی تبدیلی ہے جو عالمی سطح پر محسوس کی جا سکتی ہے جو ہر قسم کی فکر و تہذیب کو شامل کیے ہوئے ہے تاہم اس سے آفاقیت کا خاکہ بہت چھوٹا ہے یہاں تک کہ اس سے بہت سے جدیدیت کی کذب وافترا پردازیاں بھی روشن ہو جاتی ہیں[۲]۔

بہر حال ایسا لگتا ہے کہ اکثر کے اعتبار سے آفاقیت، مابعد جدیدیت کی ایک عبوری حالت ہے چنانچہ اسے جدیدیت کے مقابل ایک نئے موضوع گفتگو کی حیثیت حاصل ہے[۳]۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ گلوبلائزیشن عملی طور پر کن نئے عنوانات کو وجود بخشتا ہے؟ جدیدیت کے تصور کے سقوط وزوال کے بعد اور عالمی سطح پر اس کے مرکزی موضوعیت کے خاتمہ کے بعد دیگر عالمی وجہانی موضوعات گفتگو ومذاکرے اس کی جگہ لے سکتے ہیں؟

اختلاف آراء کے پیش نظر گلوبلائزیشن زیادہ مناسب عنوان ہے جو موجودہ صورتحال میں گفتگو کا موضوع قرار دیا جا سکتا ہے البتہ اس مسلم الثبوت حیثیت سے متعلق بھی مختلف نظریات ہیں اور تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ ہر ایک اپنے لحاظ سے آفاقیت کی تعریف کر رہا ہے۔ آفاقیت ٹکنالوجی کے فروغ اور زمان ومکان کے فاصلے سمٹ جانے کے سبب ایک اہم موضوع گفتگو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

۱۔ قوام، سید عبد العلی، جہانی شدن وجہان سوم، تہران، ص ۵۶۔۲۵۵

۲۔ جامعہ شناسی سیاسی معاصر ، ص۔۹۶

۳ ۔ایضاً

عالمی موضوعات، اختلاف نظر کے سبب ایسی صورت حال کے شکار ہوگئے ہیں جہاں ہر ایک آفاقیت جیسے موضوع کو اپنے لحاظ سے بیان کرنے میں مصروف ہے۔ دیوڈ ملز اور انٹونی میک گرو نے آفاقیت سے متعلق نظریات کو دو گرہوں پر تقسیم کیا ہے[۱]۔ شولٹ نے ۶ اہم نظریات کو اس سلسلے میں بیان کیا ہے[۲]۔ اس لحاظ سے گلوبلائزیشن کے اس دور میں عالمی معاشرہ ایک آفاقی سماج میں تبدیلی ہوکے رہ گیا ہے جہاں بیک بہت سارے موضوعات پر گفتگو اور اختلاف رائے ہوتی ہے ظاہر ہے ایسے معاشروں میں بالادستی کی ہوڑ آسانی سے جغرافیائی اور سرحدی تبدیلی کا باعث نہیں بنتی تاہم ایک خاص معاشرہ میں کچھ خاص اور محدود موضوعات ہی توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔

ایک اور بات جو گلوبلائزیشن کے تعلق سے پائے جانے والے مختلف نظریات کے بارے میں قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اگر ہم گلوبلائزیشن کو اکلوتا آفاقی موضوع مانیں تو پھر اس میں زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی جیسے سیاسی ودیگر مسائل کے بارے میں مستقل رائے اور اس کا حل ہونا چاہئے درحالیکہ محض یہ مان لینا کہ گلوبلائزیشن ایک آفاقی موضوع ہے بہت سارے سیاسی سوالات کے جواب فراہم نہیں کرتا۔ گلوبلائزیشن بھی قوم پرستی جیسے دیگر موضوعات کی طرح انسانی زندگی کے دیگر موضوعات کی طرز پر ہی دیکھا جانا چاہئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آفاقیت سے متعلق موجودہ تمام اہل نظر نے اس سے متعلق اپنی رائے کو کسی خاص مکتب فکر سے جوڑ کر پیش کیا ہے چنانچہ سب نے اسے اپنے لحاظ سے تفسیر کیا ہے جیسے کہ ہم جدیدیت، مابعد جدجدیت اور آفاقیت جیسی اصطلاحات میں دیکھتے ہیں۔

لاکلاؤ اور موفہ نے گلوبلائزیشن سے متعلق اپنے نظریہ کو ہجمونی اور سوشلسٹ اسٹریٹجی " نامی کتاب کے سکینڈ ایڈیشن کے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے چند بائیں بازو کے نظریات کی تردید کرتے ہوئے اسے آزاد کیپٹلیزم کے خلاف مقابلہ کے مناسب حالات کے طور پر جانا ہے آفاقیت اور جدیدیت آزاد خیالی کو انہوں نے ان کی رو سے محض ایک سفسطہ مانا ہے۔

جب جب گلوبلائزیشن کو اطلاعات وٹکنالوجی کی پیشرفت کا نتیجہ قرار دیکر بیان کیا جاتا ہے جس کی سیاسی جہتیں ہمارے لئے ایسی تصویر بن کے سامنے آتی ہیں جسے تسلیم کرنے کے علاوہ ہمارے پاس دوسرا کوئی

۱۔ نگاہی موشکافانہ بہ پدیدہ جہانی شدن، ص ۸۔۷

۲۔ Laclau & Mouffe, op.cit,pp.Xvii.

چارہ نہیں ہوتا ہے۔ بہر حال اتنا تو طے ہے کہ عالمی سطح پر دائیں اور بائیں بازو کی سیاست کے اب کوئی معنی نہیں رہے بلکہ دنیا بھر کے اقتصادی بحران سے نجات کے لئے یا اچھی سیاست ہے یا بری سیاست۔ اگر ہم مجموعی رابطوں کی بنا پر سوچیں تو ہمیں ان مغالطوں سے دور ہونا پڑے گا۔ گلوبلائزیشن کے ہمہ گیر ہونے کے دعوے اور عالمی سطح پر محض اسی موضوع کا قابل مذاکرہ قرار دینا، لاکلائیو اور موفہ کے وہ مغالطے ہیں جو جدید آزاد خیالی کے حامیوں کی طرف سے آزاد خیال جمہوریت کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں۔ ہوارث[1] کی نظر میں سماجی تقسیم بندی کو عالمی سطح پر موضوع گفتگو قرار دینے کے لئے تین (۳) باتیں قابل ذکر ہیں۔

ا۔ ایسے رابطوں کو فروغ دیا گیا جو تفریق و امتیاز پر منحصر تھے اور اس سے محض دشمن وجود میں آئے تاہم اس کے نتیجہ میں یہ خیال کیا گیا کہ اس سے ہماری سرحدیں محفوظ رہیں گی۔

۲۔ اپنے قومی اور علاقائی تشخص کے لئے رابطوں کو ایک خاص انداز میں تشکیل دیا گیا۔

۳۔ رابطوں میں تفکیک کے بعد اسے کسی عالمی ایجنڈے پر اپنے تشخص کے اعتبار سے اپنا موقف پیش کرنا۔ مذکورہ صورت حال کے پیش نظر، گلوبلائزیشن کا موضوع مزید اختلافات کا شکار ہو گیا ہے اور ہر مکتب خیال اپنے تصور کو ہی درست مان کے گفتگو کرتا ہے۔ اسی سے جدیدیت اور مابعد جدید اور پوسٹ ماڈرن نیز مذہبی نقطہ نظر کا اختلاف آفاقیت سے متعلق شروع ہو جاتا ہے ایسے میں اسلام کے سیاسی نقطۂ نظر کو نئے چیلنج کا سامنا ہوتا ہے۔

دین اسلام کا سیاسی رخ: عالمی اور آفاقی ہونے کے امکانات اور دشواریاں

مذکورہ بالا گفتگو کے پیش نظر اب اس سوال کا جواب فراہم کرنا لازمی ہے کہ گلوبلائزیشن نے دین اسلام کے لئے کیا کیا مواقع اور موانع فراہم کے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہمیں گلوبلائزیشن سے متعلق جملہ نظریات پر نظر ثانی کرنی پڑے گی اور پھر اسی کے مطابق دین اسلام کے سیاسی پہلو کو پیش کرنا ہوگا چنانچہ لاکلائیو اور موفہ بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ امکانات اور چیلنجز کو کسی بھی موضوع سے متعلق مختلف آراء کے درمیان پائی جانے والی نسبت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ امکان یا مواقع ایسی حالت کو کہتے ہیں جو کسی بھی چیز سے متعلق غالب افکار کے مقابل تازہ راستے فراہم کرے تاہم کسی ایک اہم نظریہ پر یا

---

۱. Laclau Emesto. New Reflec

موضوع کے کمزور ہو جانے اور اس کی جگہ کسی دوسرے نظریہ یا موضوع کے آجانے کی صورت میں اس سے متعلقہ امکانات کی اہمیت دوچندان ہو جائے[۱]۔

موجودہ عالمی منظر نامہ میں بالخصوص بہت سارے تسلیم شدہ فکری رجحانات کے خاتمے کے بعد جمہوریت نے کم و بیش دیگر عالمی افکار کو تحت الشعاع قرار دے رکھا ہے ڈھیروں رجحانات جیسے دینی بنیاد پرستی، نسوانیت، بایاں فکری محاذ، حتی سیاسی اسلام اور دیگر بہت سے نظریات، جدیدیت جیسے موضوعات کے آتے ہی آجکل اس دور میں کم توجہی کا شکار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس موضوع کی ہمہ گیریت گذشتہ چند دہائیوں سے سب پر آشکار ہے تاہم جدیدیت کا استمرار ہے۔ مشرقی بلاک اور اشترا کیت کے بعد، امریکہ میں لبرل ڈیموکریسی نے خود کو اکلوتے بدل کے طور پر متعارف کرایا چنانچہ آج امریکہ اپنے فوجی اور اقتصادی دبدبہ کے سبب متلاشی ہے کہ اس نظریہ کو بھی بچائے رکھا جائے۔

جدیدیت سے متعلق گفتگو میں بحرانی کیفیت اور اسی آزاد فکر جمہوریت کے تعلق سے آراء کا تشتت دراصل اس کی صحیح تعریف کے فقدان کے سبب جسے قدیم مفکرین نے اسے بیان بھی کیا ہے[۲] تاہم اس میں بھی کافی حد تک انسانی زندگی کے مادیت زدہ ہونے اور معنویات سے دور ہونے کے سبب ایسا ہوا ہے دوسری طرف پوسٹ ماڈرنزم سے جڑے اہل نظر کی تنقیدوں نے اسے مزید پیچیدہ بنادیا ہے۔ اس طرح سے کہ انہوں نے خود ماڈرنزم سے متعلق سوال اٹھایا ہے، درحالیکہ ان تمام تنقیدوں کے باوجود ابھی بھی لبرل گفتگو نے اپنی ماڈرن موضوعیت کو محفوظ کر رکھا ہے البتہ یہ سچ ہے کہ موجودہ صورت حال کو ماڈرنزم کے زوال اور کسی نئے تصور کے جاگزین ہونے کو یقین سمجھ لینا چاہئے۔

ماڈرنزم کے زوال کو دو رخ سے سیاسی اسلام کے لئے اکیسویں صدی میں نئے مواقع وامکانات کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے۔ پہلی امکانی صورت کو ایسے مفکرین کے تجزیوں سے جوڑکے دیکھنا چاہئے جنھوں نے گلوبلائزیشن کو ادیان کی بازگشت کا دور قرار دیا ہے۔ جارج واگل کا ماننا یہ ہے کہ آج ہم عالمی سطح پر دینی بیداری کی ایسی تحریکوں کو مشاہدہ کررہے ہیں جس سے بین الاقوامی سطح کے سیکولرزم کو نقصان پہونچنے والا

۱۔ ہوارث، دیوید، گفتمان، در دیوید مارش وجری استوکر، روش ونظریہ درعلوم سیاسی، امیر محمد حاج یوسفی، ص۔۲۰۵

۲۔ Laclau,Ernesto. New Reflection on the Revolutions of Out Time, London, Verso, 1990

ہے[۱]۔ اس لحاظ سے بیسویں صدی آخری ماڈرن اور سیکولر صدی قرار پائیگی تاہم اکیسویں صدی عقلی روشن فکری سے لیکر دینی بیداری کے نتیجہ میں کم از کم پوسٹ سیکولر دور میں داخل ہو گی[۲]۔ دراصل عصری دینی رجحان، تیسری دنیا یا تھرڈ ولڈ کی سیکولر قوم پرستی، پر مادیت زدہ سرمایہ داری، ترقی یافتہ ممالک اور کمیونزم یوروپ پر منحصر اور استوار ہیں[۳]۔

عصر حاضر میں ادیان کی بازگشت کی بنیادی وجہ خود ادیان کی معنوی جوابدہی اور افکار کی کوشش ہے۔ براؤنے بھی دنیا کے مستقبل سے متعلق اظہار خیال کرتے وقت اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ادیان اپنی آفاقی اشتراکیت گرائی کے سبب دلکش ترین نظریہ کی حقیقت رکھتے ہیں ایسے میں آفاقیت ان کی اہمیت دو چندان ہو جاتی ہے۔

عصر حاضر میں دینی نظریات کی اہمیت کا اندازہ دنیا کے دیگر معتبر و مقبول نظریات سے لگایا جاسکتا ہے اس طرح سے کہ بعض اوقات ایک رجحان جو عالمی سطح پر حاوی ہو اسے کمزور بنا کر پیش کرنے کی فضا ہموار کرکے رفتہ رفتہ بعض کمزور نظریات بھی بین الاقوامی سطح پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتے ہیں[۴]۔

مذکورہ اقتباسات کے مد نظر، آفاقیت کے اس دور میں سیاسی اسلام کے لئے اہم بات دنیائے اسلام میں اس کا فعال ہونا اور اسلامی تشخص کی طرف اس کی بازگشت ہے، دراصل یہ تشخص وہویت سے جڑے ہوئے نظریات کا ایک سلسلہ ہیں جو یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں جیسے نسوانیت کے بعد عالمی سطح پر مذہبی شدت پسندی مختلف ادیان کے سامنے ماننے والوں بالخصوص یہودیوں، عیسائیوں اور حتی بعض جگہوں پر مسلمانوں کے درمیان بھی نظر آئی ہیں۔

اسلامی تشخص ہی وہ چیز ہے جس کے سہارے سیاسی اسلام نے دنیائے اسلام میں جدیدیت کے خلاف اپنی اولویت و برتری کو برقرار رکھا ہے[۵]۔ اس سے مغرب کی مرکزیت کو خاص نقصانات پہونچے ہیں

۱۔ گنون، رنہ، بحران دنیای متجدد، ضیاء الدین دہشیری

۲۔ ہینس، جف، دین، جہانی شدن وفرہنگ سیاسی در جہان سوم، داود کیانی، ص ۱۹

۳۔ ایضاً

۴۔ ہینس، جف، پیشین، ص ۶۴

۵۔ ایضاً، ص ۶۹۔۶۸

اور ظاہر ہے یہ کسی اور طریقہ سے ممکن بھی نہیں تھا[1]۔ ظاہر سی بات ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس دور میں سیاسی اسلام بھی اپنی خصوصی شناخت پر منحصر رہتے ہوئے دیگر ہویتوں پر اپنی برتری برقرار رکھے گا۔ کاسٹلز نے اسی بات کا ذکر کیا ہے[2]۔

غور طلب ہے کہ ابھی آزاد خیال جمہوریت کا موضوع پورے طور پر زوال پذیر نہیں ہوا ہے اور اس نے کسی جہت سے اپنا تسلط محفوظ رکھا ہوا ہے چنانچہ اس اعتبار سے سیاسی اسلام کے لئے ابھی کچھ چیلنج باقی ہیں یہی پوسٹ ماڈرنزم کا نعرہ بھی اسلام کی سیاسی مقبولیت کی راہ میں مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب اہم مسئلہ اسلام کو آفاقیت سے ربط دینے کا ہے کیونکہ اسے آفاقیت سے ہماہنگ کرنے کی راہ میں کہیں نہ کہیں دینی بالادستی کو ٹھیس پہونچنے کا اندیشہ ہے تاہم اس سے اسلامی تشخص کو بھی نقصان پہونچ سکتا ہے۔ سیکولرزم اور مغربی تعلیمات کو بھی کسی حد تک تعاون مل سکتا ہے[3]۔ مفکرین اسلامی کی طرف سیاسی وسماجی مسائل پر اسلامی تشخص کے پیش نظر اظہار نظر نہ کرنا بھی اسلام کے سیاسی رخ کو نقصان پہونچا سکتا ہے[4]۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں دین اسلام کے لئے جو اہم مسائل ہیں ان میں اس بات کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہوگا کہ گلوبلائزیشن کے اس پورے دور میں مغربی جدیدیت کی مرکزیت کے خاتمہ سے اسلام کے سیاسی نظریہ کو جو مواقع فراہم ہوئے ہیں وہ بہت اہم ہیں دوسری طرف اس کا اعتبار اور ہر جگہ اس کی موجودگی اس کا اہم پہلو ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دیگر نظریات کا زوال یا اسلام کو روکنے کی کوششوں کا اس پر کوئی منفی اثر نہیں ہوگا۔

گذشتہ کچھ عرصہ میں اسلام کے سیاسی نظریہ کی بین الاقوامی مقبولیت اسے عالمی سطح پر تمام سیاسی وسماجی محاذ پر مقبول ترین لائحہ عمل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

۱۔ Laclau, Ernesto, op.cit, p.66.

۲۔ ہر اس بنیادین: اروپامداری وظہور اسلام گرایی، ص ۱۲۹

۳۔ ایضاً، ص ۹۰

۴۔ Rorty, Richard, Contingency, Solidarity, & Cambridge, Cambridge University Press, 1989

نتیجہ

سیاسی اسلام ایسا موضوع ہے جو گذشتہ دو صدیوں بالخصوص دو دہائیوں اور ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد جدیدیت سے روبرو ہے اور عالمی سطح پر توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ کلاسیکی نظریات اور مکاتب فکر میں سیاسی اسلام کو بیشتر جدیدیت کی عینک سے دیکھا گیا اور " روا" جیسے قلمکاروں نے اسے ناساز گار، ناکام اور شکست آمیز جیسے نظریہ سے تعبیر کیا علاوہ ازیں، مابعد جدیدیت کا تصور اور ایک خاص نقطہ نظر سے کئے جانے والے مطالعات نے اسلام کی قدرے مختلف تصویر پیش کی۔ درحالیکہ گذشتہ دو دہائیوں میں مابعد جدیدیت اور گلوبلائزیشن نے سیاسی اسلام کے لئے بالکل مختلف حالات پیدا کردئے جیسا مذکورہ اقتباسات میں استدلال کیا گیا ہے۔ گلوبلائزیشن، نظریاتی گفتگو ومذاکرے کے لئے بالکل تازہ صورت حال فراہم کرتا ہے البتہ ابھی دنیا پر آزاد خیالی اور جمہوریت کا نظریہ غالب ہے مگر مابعد جدیدیت پر ہونے والی تنقیدیں اور جدیدیت کی داخلی بحرانی کیفیت، اسلام کے سیاسی نظریہ کے لئے مناسب فضا ہموار کر رہی ہے۔ امید ہے اسلام حقیقی اور مسلمانوں کا تشخص دونوں عنقریب بحال ہو سکیں گے۔

منابع و مآخذ

- موثقی، سید احمد، جنبشہای اسلامی معاصر، تہران، ۱۳۷۲
- بابی، سعید، ہراس بنیادین: اروپامداری و ظہور اسلام گرایی، غلام رضا جمشیدیھا و موسی عنبری، انتشارات دانشکدہ تہران، تہران، ۱۳۷۹
- بھروزلک، غلام رضا، مہدویت وجہانی شدن، کتاب نقد، ش ۲۴
- دکمجیان، ہرایر، اسلام در انقلاب: جنبش ہای اسلامی در جہان عرب (بررسی پدیدہ بنیاد گرایی اسلامی)، حمید احمدی، انتشارات کیہان، تہران، ۱۳۷۷
- روآ، الیویہ، تجربہ اسلام سیاسی، محسن مدیر شانہ چی و حسین مطیعی امین، انتشارات الہدی، تہران، ۱۳۷۸
- شرابی، ہشام، پدر سالاری جدید، سید احمد موثقی، نشر کویر، تہران، ۱۳۸۰
- نش، کیت، جامعہ شناسی سیاسی معاصر، محمد تقی دلفروز، انتشارات کویر، تہران، ۱۳۸۰

❖ کاستلز، مانوئل، عصر اطلاعات: اقتصاد، جامعه وفرہنگ، ترجمه حسن چاوشیان وہمکاران، ، طرح نو، تہران ، ۱۱۳۸۰ ـ شولت، پان، نگاہی موشکافانه به پدیده جہانی شدن، مسعود کرباسیان، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۸۲

❖ قوام، سید عبدالعلی، جہانی شدن وجہان سوم، دفتر مطالعات سیاسی وبین المللی، تہران، ۱۳۸۳

❖ ہوارث، دیوید، گفتمان ، دیوید مارش وجری استوکر، روش ونظریه درعلوم سیاسی، امیر محمد حاج یوسفی، پژوہشکده مطالعات راہبردی، تہران، ۱۳۸۷

❖ گنون، رنه، بحران دنیای متجدد، ضیاء الدین دہشیری، انتشارات امیر کبیر، تہران ، ۱۳۷۸

❖ ہینس، جف، دین، جہانی شدن وفرہنگ سیاسی در جہان سوم، داود کیانی، پژوہشکده، مطالعات راہبردی تہران، ۱۳۸۱

❖ Lyotard, J.F. The Postmodern Condition: a Report on knowledge, trans. By G.Bennington & Massumi, Manchester, Manchester University Press,1984.

❖ Eliade, Encyclopedid of Religion,Macmillan Publishing Company, Inc, Electronic edition produced by Infobases, Onc., Provo, Urdu.

اسلام میں دین وسیاست کا باہمی رابطہ

مولف: مہدی زحمتکش، علی جعفری
مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی

اجتماعی اور سیاسی فکری حلقہ میں دین وسیاست کا رابطہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اسلامی دنیا میں مسلمان مفکرین کے درمیان اس رابطہ کی نوعیت پر بڑی بحث موجود ہے۔ بعض افراد نے دین وسیاست میں ہر طرح کے رابطہ کا انکار کیا ہے اور ایک دوسرے کے امور میں کسی طرح کی دخالت کو طرف مقابل کے ناکارہ ہونے کا سبب گردانا ہے لہٰذا وہ ان دونوں کے درمیان مکمل جدائی کے قائل ہیں۔

دوسرا گروہ اپنے استدلالی بیان کے ذریعہ دونوں کے درمیان بڑے گہرے رابطہ کا قائل ہے ہر چند کہ اس گروہ میں دین وسیاست کے درمیان رابطہ کی نوعیت وکیفیت میں اختلاف نظر ہے لیکن اصل رابطہ اور عمل ورد عمل میں وہ متفق القول ہے۔ اس تحقیق میں اصل سوال یہ ہے کہ دونوں گروہ، کن دلیلوں کی بنیاد پر دین وسیاست کے رابطہ اور عمل ورد عمل کے بارے میں باتیں کرتے ہیں؟ مکتب اسلام میں دین وسیاست میں نظری رابطہ بھی ہے اور یہ دونوں روابط آپس میں ہم آہنگ اور مرتبط بھی ہیں۔ مختلف نظریات کے ذریعہ دین وسیاست کے رابطہ کے بارے میں دونوں گروہوں کے نظریات کی تحقیق اس تحریر کا مقصد ہے۔

حکومتی اور سیاسی نظریہ کے اعتبار سے مسلمانوں کے درمیان ایک بڑا اختلاف یہ ہے کہ سیاست اور انسانوں کے دنیوی امور کیا دین کا جزء ہیں یا دین انسانوں کے صرف اخروی اور معنوی امور کا ذمہ دار ہے اور حکومتی امور عوام کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی سوال ہے۔ مختلف ادیان وشرائع کے پیروکاروں کے درمیان یہ سوال موجود تھا۔ مثلاً فاضل مقداد عالم دین کی حیثیت سے فرماتے ہیں:

"دین اور حکومت دو ہمزاد ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر فائدہ مند نہیں ہیں۔"[۱]

رہبر دینی ہونے کے اعتبار سے امام خمینی بھی اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ خدا کی قسم اسلام مکمل طور پر سیاست ہے اسلام کا غلط تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسری شریعتوں مثلاً مسیحیت میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے لیکن مسیحیت کی تاریخ کی ابتداء اور جدید دور میں لوگوں نے سیاست کے حلقہ میں دین کی دخالت کو روکنے کی کوشش کی اور دوسری طرف دین میں سیاست کے نفوذ کو روکا گیا۔ در حقیقت وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ دین ہر کسی کا انفرادی مسئلہ ہے، اس کا رابطہ خدا سے ہے لہٰذا اسے عام زندگی اور ملکی مسائل میں سرایت نہیں کرنا چاہئے۔ کلیسا نے ہزاروں سال تک مغربی عوام پر حکومت کی لیکن کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کے نتیجہ میں بعض مغربی سیاسی مفکرین دین اور حیات اجتماعی میں فرق و دوری و علیحدگی کے نظریہ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے مغربی انسان کی زندگی میں دین کی دخالت کے چیلنج کو منظوری دی۔ اس نظریہ کے ظاہر ہونے کے بعد مغربی دنیا میں حکومتوں کی تشکیل ہوئی جنہوں نے داخلی اور خارجی امور میں دینی قوانین کی رعایت کے التزام کو ٹھکرا دیا۔ مغربی ممالک میں اس نظریہ کے پھیلنے کے بعد بہت سے اسلامی ممالک میں بھی یہ بات پھیل گئی اور آج کے دور میں بہت سے اسلامی ممالک میں غیر دینی حکومت ہے[۲]۔

مزید واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ وہ دین اور سیاست میں کسی طرح کے رابطہ کے قائل نہیں ہیں۔ مذکورہ نظریہ مغرب خصوصاً عیسائیت کے ہمنواؤں کی طرف سے پیش ہوا۔ اس کے مد مقابل بہت سے اسلامی مفکرین مکتب اسلام میں دین اور سیاست کے شدید اور مضبوط رابطہ کے قائل ہیں۔ یہ لوگ اپنے نظریات ثابت کرنے کے لئے عقلی اور نقلی (قرآن وسنت پیغمبرؐ) دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں۔ اس گروہ میں فارابی، ابن سینا، خواجہ نصر، مسکویہ مادھوی[۳]، ابن خلدون، فخر رازی، سید جمال الدین اسد آبادی، محمد عبدہ، اقبال لاہوری[۴]، امام خمینی وغیرہ شامل ہیں۔

۱۔ فاضل، مقداد بن عبداللہ (۱۳۹۶ ق)، اللوامع الالہیہ فی مباحث الکلامیہ، ص ۲۶۲

۲۔ خواجہ سروری غلام رضا، وحدت دین وسیاست در اندیشۂ امام خمینی، مجلّہ علوم سیاسی، شمارہ ۱۶، ص ۹۲

۳۔ ماوردی، علی (۱۳۹۳ ق / ۱۹۷۳ م)، الاحکام السلطانیہ، ص ۵

۴۔ مطہری، مرتضٰی، نہضت ھای اسلامی در صد سالہ اخیر، ص ۴ و ۵

اسلامی دنیا میں خصوصاً دور حاضر میں مفکرین کاایک گروہ ایسا ہے جو دین وسیاست میں جدائی کا قائل ہے، اس کا کہنا ہے کہ دین وسیاست کی بحث میں جدائی کا قائل ہونا دینی اور سیاسی ریاست کافریضہ ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہاجائے کہ سیاست کا دنیوی اور زمینی پہلو ہے اور دین کاخدائی اور اخروی چہرہ ہے۔ ان دونوں میں فاصلہ ہے۔ عبد الرزاق اور مہدی بازرگان جیسے افراد اس گروہ میں شامل ہیں ۔ مثال کے طور پر عبد الرزاق مصری پیغمبر اکرمؐ کی حکومت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے پاس اگرچہ ریاست تھی لیکن یہ ریاست شان رسالت کے مطابق تھی اور ایک معنوی اور دینی حکومت تھی نہ کہ سیاسی حکومت[1]۔

اس جماعت نے مختلف آیتوں، روایتوں اور عقل سے اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ گروہ کون سی سند پیش کرتا ہے اور حقیقت اسلام سے کون زیادہ نزدیک ہے؟ البتہ ہر چیز سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام جیسے ایک ہی دین کے ماننے والوں میں دو طرح کے نظریات کیوں ہیں۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم دین وسیاست کی مختلف تعریفیں پیش کرتے ہیں۔

اس مقالہ میں عالم اسلام میں دین وسیاست کے رابطہ کے سلسلے میں مخالفین وموافقین کے مختلف نظریات کو پرکھا جائے گا، اس کے علاوہ دینی تعالیم سے ان کے تعلق کو بیان کیا جائے گا۔ابتداء میں دین وسیاست کی مفہومی بحث کی طرف اشارہ ہوگا پھر اسلام میں دین وسیاست کے آپسی تعلق کے سلسلہ میں موافقین کے کچھ دلائل اور نظریات پیش کئے جائیں گے پھر مخالفین کی دلیلیں پیش کی جائیں گی اور آخر میں نتیجہ اور اپنا نظریہ پیش کروں گا۔

مفہومی بحث

جیساکے پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے دین وسیاست کے آپسی تعلق کے سلسلہ میں اختلاف نظر کی ایک وجہ دین وسیاست کے رابطہ کی نوعیت، ان کی تعریفیں اور دین وسیاست کے بارے میں مفکرین کی مختلف فکریں ہیں۔ یہ بحث اس کی ماہیت اور مفہوم سے متعلق ہے۔ دین وسیاست کے بارے میں مفکرین نے مختلف تعریفیں پیش کی ہیں اور ہر ایک نے کسی معین زاویہ سے اسے دیکھا ہے۔ یہاں تمام تعریفیں تو نہیں سمیٹی جائیں گی البتہ کچھ نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

۱۔ عبد الرزاق، علی، اسلام ومبانی قدرت، ترجمہ امیر رضائی، ص ۱۷۱

الف: دین کی تعریف

محققین نے فلسفیانہ، کلامی، فقہی، قانونی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں سے دین کی تعریف پیش کی ہے۔ ہم یہاں پر مغربی ثقافت اور اسلامی ثقافت کے تناظر میں چند تعریفوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱۔ **مغربی ثقافت**: مغربی ثقافت میں دین کو کبھی معنوی اور کبھی ذاتی عنوان سے پرکھا گیا ہے لہٰذا اسلامی ثقافت میں بیان ہونے والی تعریف سے الگ ہے۔ مغربی مفکرین نے دین کی تعریف سے اجتماعی، سیاسی، دنیوی اور مادی پہلوؤں کو الگ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ بعض تعریفوں میں وحی اور آسمانی باتوں کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ مثلاً نیل اسلر، فلورانس، کلاکون، اور فرداسٹر دیٹ بک نے دین کو پیچیدہ اصولوں کا مجموعہ بتایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے مکمل منظّم اور مرتب شمار کیا ہے اور انسانی مشترک مسائل کے حل کے لئے اسے عمل وفکر انسانی کو جہت عطا کرنے والا مجموعہ گردانا ہے[۱]۔ لابڑسوں نے دین کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ کچھ یقینی امور پر دین کا اطلاق ہوتا ہے جو تجرباتی اور غیر تجرباتی امور کو تمیز دینے والا ہوتا ہے۔ یہاں تجرباتی امور کو غیر تجرباتی امور سے کم اہمیت حاصل ہے۔

مارکس اور انگلش کا خیال ہے کہ جس نے ابھی اپنے آپ کا انکشاف نہیں کیا ہے یا اپنے آپ کو گم کر رکھا ہے اس انسان کی خود آگاہی اور اپنے احساس کا نام دین ہے۔ دین بشر کا خیال تحقق ہے کیوں کہ ذات بشر کی کوئی واقعیت نہیں ہے[۲]۔

رایناخ کا کہنا ہے کہ دین ایسے اوامر ونواہی کا مجموعہ ہے جو انسان کی صلاحیت کے آزاد عمل کو روک دیتا ہے۔ ماٹیو آرنولڈ کا کہنا ہے کہ دین اس اخلاق کا نام ہے جو احساس اور عاطفہ کو بلندی، گرمی اور روشنی عطا کرتا ہے[۳]۔

۲۔ **اسلامی ثقافت**: اسلامی دنیا میں کلامی، فقہی اور فلسفی نکتہ نگاہ سے دین کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں دین کی بنیاد اور اس کا مقصد، اس کا لائحہ عمل اور انسان کا دین سے رابطہ بیان ہوتا ہے۔ ہم یہاں چند تعریفوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

۱۔ عمید زنجانی، عباس علی، نسبت دین وسیاست، مجلّہ فلسفہ، کلام وعرفان، ص ۲۹

۲۔ شجاعی زند، علی رضا، تعریف دین ومعضل تعدد، مجلّہ نقد ونظر، سال پنجم شمارہ سوم وچہارم (۱۳۸۵)، ص ۳۵

۳۔ سہرابی فر، محمد تقی، گذر از تعریف دین بہ شمول گرائی، مجلّہ رواق اندیشہ ۳۱ (۱۳۸۵)، ص ۵

استاد جعفر سبحانی فرماتے ہیں کہ معرفت اور ترقی کی طرف تحریک کا نام دین ہے جس کے چار پہلو ہیں اصلاح فکر و عقیدہ، اعلیٰ انسانی اصول کی پرورش، سماج کے افراد سے حسن رابطہ اور ہر طرح کی تفریق وتعصب کا خاتمہ۔

آیت اللہ مصباح یزدی کا خیال ہے کہ کائنات اور انسان کو پیدا کرنے والے پر عقیدہ رکھنا اور اس عقیدہ کے مطابق احکام پر عمل کرنا دین ہے[۱]۔

عمید زنجانی دین کی تعریف میں کہتے ہیں کہ دنیا، انسان، معاشرہ اور موت کے بعد کی دنیا کے سلسلہ میں وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل شدہ عقاید کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ یہ تعریف ایمان کے سلسلہ منقول بعض روایتوں اور کلامی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ بعض ماہرین سماجیات نے دین کی جو سماجیاتی تعریف پیش کی ہے وہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہوسکتی ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بہترین روش حیات اور کامل بننے کی طرف لے جانا ہے[۲]۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے تفسیر المیزان میں دین کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں منجملہ ایک تعریف یہ ہے کہ بشر کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعہ لائے ہوئے عقائد اور دستور العمل کا نام دین ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قرآنی نقطہ نظر کے مطابق معاشرہ میں جاری اجتماعی سنت کا نام دین ہے، یہ اجتماعی سنت یا فطری دین اور حق ہے یا تعریف شدہ دین اور غیر فطری[۳]۔

امام خمینی کی نظر میں اجتماعی حیات اور ذاتی حیات میں تمام انسانوں کے لئے دنیا وآخرت کی سعادت کے لئے ایک جامع لائحہ عمل کا نام دین ہے[۴]۔ متعدد جملوں میں آپ نے یہ تعریف بیان کی ہے جس میں سے مندرجہ ذیل تعبیر سب سے واضح ہے:

"غیر توحیدی مکاتب فکر کے برخلاف اسلام ایسا مکتب فکر ہے جو تمام انفرادی، اجتماعی، مادی، معنوی، ثقافتی، سیاسی، فوجی اور اقتصادی شعبوں میں لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اس میں تربیت انسان، معاشرہ اور اس

۱۔ گذر از تعریف دین بہ شمول گرائی، ص ۵

۲۔ نسبت دین وسیاست، ص ۷۳

۳۔ محمدی، سید مرتضیٰ، رابطۂ دین وسیاست درسہ حوزہ نبوت، امامت و فقاہت، مجلّۂ فلسفہ، کلام وعرفان، ص ۲۳

۴۔ وحدت دین وسیاست در اندیشۂ امام خمینی، ص ۹۴

کی مادی و معنوی ترقی کے لئے کسی بھی نکتہ کو فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ اجتماع اور فرد کی ترقی کی راہ میں حائل تمام مشکلات و موانع بیان کردیئے گئے ہیں اور انہیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے[۱]۔

دین کے سلسلہ میں علامہ محمد تقی جعفری فرماتے ہیں: دین کے دو رکن ہیں، عقیدہ اور احکام۔ دوسرے رکن کے دو حصے ہیں اخلاقیات اور فقہی احکام۔ دوسری طرف فقہی احکام کے بھی دو حصے ہیں۔ احکام اولیہ اور احکام ثانویہ[۲]۔ ان ساری تعریفوں میں دین کو ایک جامع لائحہ عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کے اندر انسانی وجود کے تمام پہلو موجود ہیں۔ یہ وحی الٰہی پر مبنی ہے اور پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں تک پہونچتا ہے۔ سید محمد باقر الصدر دین کی تعریف پیش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ[۳]۔ دین انسان کی سرشت اور فطرت الٰہی ہے، اللہ نے اسی پر لوگوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت کبھی نہیں بدل سکتی، جس طرح انسان کے کسی حصہ کو اس سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے اسی طرح اس کے دین کو بھی اس سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے[۴]۔ اس تعریف کی بناپر دین انسان کی فطرت اور ذات میں داخل ہے اور اس کے وجود سے جدا نہ ہونے والا حصہ ہے۔ دوسرے بیان میں انہوں نے دین کو انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بتایا ہے جو اس کی ذات سے ہم آہنگ ہے لہٰذا دین، وجود انسان کے ساتھ تکوینی طور پر موجود ہے۔

انہوں نے آیت لَكُم شَرَعَ مِّنَ ٱلدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ[۵] کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس جگہ دین تشریع قانون کے عنوان سے موجود ہے جو خدا کی جانب سے آیا ہے[۶]۔ دین قوانین الٰہی و آسمانی کا مجموعہ ہے

۱۔ امام خمینی، فرہنگ نامہ سیاسی، الٰہی، ص ۸

۲۔ رابطۂ دین وسیاست درسہ حوزہ نبوت، امامت و فقاہت، ص ۲۴

۳۔ سورہ روم، آیت ۳۰

۴۔ صدر، سید محمد باقر، سنت ہائے تاریخ در قرآن، ص ۲۰۱

۵۔ سورہ شوریٰ، آیت ۱۳

۶۔ سنت ہائے تاریخ در قرآن، ص ۱۱۶ و ۲۰۰

جو وحی الٰہی کے ذریعہ اور پیغمبر کے وسیلہ سے انسانوں کی ہدایت کے لئے ان تک پہونچا ہے اور ان کی فطری وذاتی ساخت سے ہم آہنگ ہے۔

دین انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے۔اب انسانوں کے وجودی پہلو اور دین کے لئے اس کی موضوعیت کے پیش نظر دین حقائق سے ہم آہنگ اور انسانی ذات پر منطبق ہے جو کمال عطا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے آیا ہے۔ جو ہے اور نہیں اور ہونا چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے کی صورت میں اور وحی کے ذریعہ بشر کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور انسان کے مختلف پہلوؤں اور اس کی ضرورتوں پر اثرانداز ہوتا ہے، چاہے وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، جسمانی ہوں یا روحانی، مادی ہوں یا معنوی ،دنیوی ہوں یا اخروی، ان تمام باتوں میں انسان کے لئے ہدایت موجود ہے۔اس تعریف سے مندرجہ ذیل نکات نتیجہ کے طور پر سامنے آتے ہیں:

۱. دین معرفت کا مجموعہ ہے

۲. دین کا موضوع انسان ہے کوئی دوسری چیز نہیں

۳. اس کی جڑیں انسان کے وجود میں پیوست ہیں۔ یہ فطری اور ذات کے اندر پایا جانے والا امر ہے ۔

۴. دین کے ذریعہ انسان سعادت اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوتا ہے۔انسان کی سعادت فردی، سماجی اور دوسرے پہلوؤں سے مرتبط ہے لہٰذا انسان کے مختلف پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے دین کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ہر دین کے دو بنیادی حصے ہوتے ہیں (الف) عقائد جو دین کی بنیاد اور جڑیں ہیں (ب) عملی اور اخلاقی قوانین جن کی بنیاد اعتقادی تعلیمات ہیں۔ قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ دینی متون میں موجود عقائد اور اقدار اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں لہٰذا حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا ضروری ہے۔

ب: سیاست کی تعریف

سیاست کی جامع و مانع تعریف مشکل ہے اس وجہ سے صاحبان نظر نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ جس طرح دین کی تعریف بہت وسیع ،اختلافی اور پر تحقیق ہے اسی طرح سیاست کی تعریف بھی ہے۔ مغربی اور مشرقی ثقافت میں سیاست کی دو الگ الگ تعریفیں بیان کی گئیں ہیں جس کی وجہ مغرب کی دنیاوی نگاہ اور مشرق (اسلام) کی الٰہی طرز نگاہ ہے۔

اسلامی دانشوروں نے سیاست کی تعریف بیان کرنے میں اس کے لغوی معنی پر توجہ دی ہے۔ لغت میں سیاست کا مطلب ہے پاس اور لحاظ رکھنا، محفوظ رکھنا، تدبیر، ہدایت، راستہ نکالنا، تہذیب، کسی نظام کو چلانا، تدبیر کرنا، ہدایت اور انتظام کرنا [۱]۔ سیاست کی تعریف میں امام خمینی فرماتے ہیں کہ سیاست کا مطلب ہے کہ معاشرہ کی تمام مصلحتوں کو پیش نظر رکھیں، اس چیز کی طرف ہدایت کریں جس میں اس کی بھلائی ہے اور یہ کام انبیاء واولیاء سے مخصوص ہے۔ دوسرے لوگ اس طرح کی سیاست نہیں کر سکتے، یہ سیاست پیغمبروں سے مخصوص ہے اور ان کے اتباع میں علماء یہ کام کرتے ہیں [۲]۔

دوسری جگہ آپ نے سیاست کی وہ تعریف کی ہے جو سادہ، رواں اور سب کے فہم سے نزدیک ہے، اس میں کوئی کلاسیکی یا علمی بات نہیں کہی گئی ہے۔ آپ نے ایک واقعہ کے ذیل میں بیان فرمایا کہ وہ شخص (ایران کے کسی ذمہ دار شخص کا ذکر ہے) قید خانہ میں میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ بدذاتی اور جھوٹ کا نام سیاست ہے آپ اسے ہمارے لئے چھوڑ دیں، اس نے ٹھیک ہی کہا اگر اس کو سیاست کہتے ہیں تو یہ انہیں لوگوں سے مخصوص ہے اور جو اسلام کی سیاست ہے، جو مسلمانوں میں ہونی چاہئے، جس معنی میں ائمہ کرام علیہم السلام "ساسۃ العباد" ہیں، وہ معنی اس سے الگ ہے [۳]۔ اسلام کی نظر میں بھی انسان کو مادی، معنوی اور ملکوتی حیات کی طرف لیجانا سیاست ہے۔ اس طرح انفرادی اور اجتماعی حالت میں مادی اور معنوی اعلیٰ مقاصد کے لئے حیات انسانی کی مدیریت کا نام سیاست ہے [۴]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو طرح کی سیاست ہوتی ہے، ایک وہ سیاست جو موجودہ دنیا میں عام طور پر پائی جاتی ہے اور جس کا نقشہ غیر مذہبی افراد نے بنایا ہے اور وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ شہید صدر کی تعبیر کے مطابق اس میں التواء، افتراء وغیرہ ہے۔ دوسری سیاست وہ ہے جو دین کے بطن سے ہے اور صورت و معنی دونوں میں دنیا کے اندر موجود سیاست سے بالکل مختلف ہے اور آقائے صدر کی تعبیر کے مطابق افتراء، خفیہ سازش اور عوام فریبی سے کوسوں دور ہے۔ مسلمان مفکرین کی تحقیقات سے استفادہ

۱۔ دھخدا، علی اکبر، لغت نامہ، ج ۶، ۱۲۲۲۵؛ جمشیدی، محمد حسین، رخ اندیشہ، ص ۵۶

۲۔ امام خمینی، ولایت فقیہ، ص ۱۱۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔۱۶۸

۴۔ جعفری، محمد، سکولاریسم از دیدگاہ شہید مطہری، مجلّہ فلسفہ، کلام و عرفان، شمارہ ۱۴ (۱۳۸۱)، ص ۶۴

کرتے ہوئے ہم سیاست کی پہلی قسم کو گمراہ کن سیاست اور امام خمینی کی تعبیر کے مطابق شیطانی سیاست کہہ سکتے ہیں ، اور دوسری قسم کی سیاست کو سیاست فاضلہ ، عادلہ اور انسانی والٰہی سیاست کا نام دیا جاسکتا ہے اور اس کے توسط سے حقیقی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے[۱] لیکن یہی نیک اور سیاست عادلہ جو عالم اسلام میں ایک حد تک دونوں گروہوں کے مد نظر ہے، ایک گروہ کی نظر میں اس کا مقصد اور پیغام اس دنیا کے لئے ہے لہٰذا وہ دین سے جدا ہے حالانکہ دوسرے گروہ کی نظر میں سیاست، دنیاوآخرت دونوں کے لئے ہے لہٰذ دین سے ہم آہنگ ہے اور دین کا جزء ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین، انسان کی دنیا کو بھی سنوارنے کے لئے آیا ہے۔

امام خمینی کے بیان میں بھی اس طرح کے اشارے موجود ہیں کہ اسلام عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے آیا ہے[۲]۔ امام خمینی کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ دین ایسی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد قیام عدالت کے لئے سیاست کی تدوین اور اس سے کام لینا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ انسانی معاشرہ اور نفس انسان میں سیاست عادلہ ایجاد کرنا دین کا مقصد ہے۔ عمید زنجانی بھی دین کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ حکومتی سطح پر انتظامی امور کی دیکھ بھال اور عوام کی بھلائی کے لئے مختلف امور کی انجام دہی اور اجتماعی مصلحت کی خاطر عمومی امور کی رہنمائی اور ملک کے مختلف شعبوں کے بہترین نظم ونسق کا نام سیاست ہے۔ ایک معاشرہ کو چلانے کا علم یا حکومت کے ذریعہ سے عوام کے امور کو انجام دینے کا علم سیاست ہے[۳]۔

مغرب کی نظر میں اجتماعی اور عمومی امور کو انجام دینا سیاست ہے۔ اس کا محور طاقت یا سیاسی طاقت[۴] یا اقدار کی آمرانہ تخصیص کے مقصد کے ساتھ حکومت ہے۔ اگران کو جمع کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ عمومی امور کی تدبیر یا عمومی امور میں شرکت یا انسان کے مناسب مصالح کی حفاظت کا نام سیاست ہے جس میں انسان کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلو موجود ہوں[۵]۔

۱۔ فارابی، ابونصر، تحصیل السعادۃ، ص ۴۶

۲۔ امام خمینی ، شؤون واختیارات ولی فقیہ، ترجمہ ولایت فقیہ از کتاب البیع، ص ۲۰

۳۔ نسبت دین وسیاست، ص ۷۵

۴۔ دورژہ، موریس، اصول علم سیاست، ص ۱۴

۵۔ رخ اندیشہ، ص ۸۰

دین وسیاست کے آپسی تعلق کے موافقین کا نظریہ

دین وسیاست کے آپسی تعلق کو ماننے والے افراد اگرچہ اس تعلق کی نوعیت اور اس ضمن میں پیش کئے گئے دلائل کے سلسلہ میں متفق نہیں ہیں لیکن اصل تعلق کو سبھی قبول کرتے ہیں۔ در حقیقت دین وسیاست کے لازم وملزوم ہونے سے اگر صرف نظر بھی کرلیں تو تعلیمات اسلام کے تین اصولی شعبے یعنی آئیڈیالوجی، شریعت اور اخلاق خود دین وسیاست کے عمیق رابطہ کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان میں جدائی نہیں ہوسکتی یا اگر مضامین دین اور حقیقی مسائل کو دیکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ دین وسیاست میں ایک منطقی اور حقیقی ربط ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں[۱]۔ اس رابطہ کو ماننے والے کتاب، سنت اور عقل سے اپنی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن نے دنیا وآخرت کے اٹوٹ رابطہ کو " آخرت میں انسان کا چہرہ " ، " تجسم اعمال " اور "آخرت کی جزا اور سزا کی دنیاوی بنیاد" کے طور پر بیان کیا ہے۔ دنیا میں انسان جو طریقہ بھی اپنائے گا اس کا اثر آخرت میں نظر آئے گا۔ آخرت کی سعادت دنیا کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس وجہ سے کوئی عمل ایسا نہیں ہوسکتا جس میں صرف دنیوی پہلو ہو اور آخرت میں اس کا کوئی اثر نہ ہو یا کوئی ایسا عمل نہیں ہوسکتا جس کا آخرت میں تو اثر ہو لیکن دنیا میں وہ بے تاثیر ہو۔ دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ معاشرہ کے افراد کا کردار، عادت اور ثقافت حکومتوں کے اہداف اور نوعیت سے کتنی متاثر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آج کے معاشرہ میں جب بظاہر لوگوں کی بنائی ہوئی حکومت ہے اس میں ذرائع ابلاغ، اطلاعات، ثروت وغیرہ پر حکومت کے ایک خاص طبقہ کا ہمیشہ قبضہ رہتا ہے اور وہی افراد لوگوں کی خواہشوں کو مہمیز کرتے ہیں[۲]۔

عوام کی ثقافت پر خاندانی تربیت سے زیادہ حکومت کا اثر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مثل بھی مشہور ہے کہ النّاس علیٰ دین ملوکھم، عوام اپنے حاکموں کی دینی روش پر چلا کرتے ہیں۔ النّاس بامرائھم اشبہ منھم بآبائھم، لوگ اپنے باپ سے زیادہ حکام سے مشابہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے بھی گمراہوں کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو بیان کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: ربنا اطعنا ساداتنا وکبرائنا فاضلّونا

۱۔ نسبت دین وسیاست، ص ۷۵

۲۔ اکبریان، علی، دین وسیاست، مجلّہ فلسفہ، کلام وعرفان شمارہ ۲ و ۳ (۱۳۷۶)، ص ۳۲۹

السبیلا، پالنے والے! ہم نے اپنے رئیسوں اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ لہٰذا اگر دین صرف انسان کی اخروی سعادت کے لئے ذمہ دار ہوتا تو پھر بھی اس کی دنیا خصوصاً حکومت کے بارے میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا کیوں کہ انسان کی اخروی سعادت بھی اسی دنیا کا نتیجہ ہے[1]۔ لہٰذا دین اور سیاست کا رابطہ اتنا عمیق ہے کہ ان دونوں کے درمیان جدائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس خیال سے اتفاق رکھنے والے افراد چند دلیلیں پیش کرتے ہیں:

اول: میدان سیاست اور قلمرو دین میں بہت سی باتیں مشترک ہیں جو مقصد اور اجتماعی زندگی کے بہت سارے مسائل میں دونوں کو ایک دوسرے سے ملادیتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دونوں میں کچھ خصوصیتں اور فرق پیدا کر دینے والی باتیں بھی ہیں اسی وجہ سے خاص حالات میں ان کا ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ناگزیر ہے۔

دوم: مسائل دین کا بہت بڑا حصہ سیاست کے حلقہ میں آتا ہے اور اسی طرح سیاست کے بہت سارے مسائل دین کے زیر نگین ہیں لہٰذا نظری یا نفاذ کے نقطہ نظر سے دونوں کا ایک دوسرے کے حلقہ میں کھینچ آنا لازمی ہے۔ اسی وجہ سے سیاست دین کا طالب ہے اور دین سیاست کا طلبگار ہے۔

سوم: بعض افراد دین وسیاست کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک دینی معاشرہ میں خواہ نخواہ اس کی ہر شئے منجملہ اس کی سیاست بھی دینی ہوگی۔ یہ ایک جبری تلازم ہے جب کسی سیاسی معاشرہ کے عوام دیندار ہوں گے تو سیاست بھی دینی ہوگی اور جب تک وہ دیندار رہیں گے ان میں یہ خصوصیت باقی رہے گی۔ سیاست کو دین سے جدا کرنے کے لئے لوگوں کو دین سے جدا کرنا پڑے گا۔ جب معاشرہ بے دین ہوگا تو سیاست بھی غیر دینی ہو جائے گی[2]۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ دین وسیاست دونوں کا موضوع انسان ہے اور انسان ایک ایسا موجود ہے جس کے دو پہلو ہیں، ایک دین سے جڑا ہے تو دوسرے پہلو سے سیاست مربوط ہے۔ اب ہم یہاں چند نظریات کی کلی طور پر تحقیق کریں گے۔

۱۔ دین وسیاست، ص ۳۳۰

۲۔ نسبت دین وسیاست، ص ۷۶

دین وسیاست قرآن کریم کی نگاہ میں

قرآن کریم کی جامعیت سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں مختلف موضوعات پر بحثیں موجود ہیں جو اس کے وسیع و عمیق معارف کی دلیل ہیں۔ قرآن مجید میں سیاست کی بحث کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ دین وسیاست کے مابین تعلق جیسے اہم مسئلہ کو قرآن کریم میں بڑی وضاحت کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ حکومت کی تشکیل کی ضرورت، بین الاقوامی رابطہ، شوریٰ اور مشورہ، نظام سیاسی اور مختلف سیاسی مفاہیم قرآن کریم میں موجود ہیں۔ قرآن کریم کے نقطہ نظر سے حکومت دین کے اندر پوشیدہ ہے اور انسانوں کو اس کی بہت ضرورت ہے:

۱. بنی اسرائیل کی داستان میں ہمیں نظر آتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس کوئی قوی اور لائق حاکمیت نہیں تھی لہٰذا وہ داخلی خلفشار کا شکار رہے۔ آخر میں کمزوری اور پھر شکست کا شکار ہوگئے اور دشمن ان پر فتحیاب ہوگیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر صاحب اقتدار حکومت نہیں ہوگی جو سرکشوں کی سرکوبی کرسکے تو زمین پر فساد پھیل جاتا ہے۔

۲. بنی اسرائیل کے مقابلہ میں لشکر جالوت کی شکست ایک مناسب رہبر کی وجہ سے ہے۔

۳. لائق اور صالح حکومت کا نقشہ قرآن کی بہت سی آیتوں میں موجود ہے، منجملہ سورۂ یوسف کی آیت ۲۱ و ۵۶، سورۂ کہف کی آیت ۸۴، سورۂ نور کی آیت ۵۵، سورۂ ص کی آیت ۲۶ اور سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

۴. قرآن کریم نے غیر الٰہی اور طاغوتی حکومت پر سخت تنقید کی ہے۔

۵. قرآن مجید میں دین وسیاست کے باہمی رابطہ پر بہت سی آیتیں موجود ہیں۔ اس آسمانی کتاب میں جو تاریخی شواہد موجود ہیں اس مقام پر ان کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

کتاب الٰہی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے پیغمبروں کو منصب نبوت کے ساتھ ساتھ فرمان روائی کا منصب بھی عطا کیا گیا تھا۔ وہ باضابطہ طور پر معاشرہ کے امور کے ذمہ دار تھے اور لوگوں کو امر و نہی کرتے تھے اور انہیں زندگی کا سلیقہ سکھاتے تھے۔ مثلاً قرآن مجید نے آل ابراہیم کی حاکمیت اور فرمان روائی کی جو خبر دی ہے اس میں " مُلکاً عَظیماً" کے ذریعہ اس حاکمیت کی توصیف و تعظیم کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فقد آتینا آل ابراهیم الکتاب والحکمة وآتیناهم مُلکاً عَظیماً، ہم نے آل ابراہیم

کو کتاب وحکمت دی ہے اور انہیں ایک بہت بڑی سلطنت عطا کی ہے۔ مصنفین اور صاحبان نظر نے ملک عظیم کا مطلب یہ بتایا ہے کہ آل ابراہیم ایک معاشرہ کے نگراں اور مدار المہام تھے اور یہ امر دین وسیاست کی ہم آہنگی پر ایک دلیل ہے جو قرآن نے پیش کی ہے[۱]۔

طالوت وجالوت کا واقعہ دوسری دلیل ہے جو متن قرآن سے پیش کی جاسکتی ہے۔ قرآن نے دین وسیاست کے ہمزاد ہونے پر اسے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ خدا کی نظر میں دونوں مل کر سعادت اور ہدایت کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ سیاست کے بغیر دین اور دین کے بغیر سیاست کبھی بھی معاشرہ کے نجات کی ذمہ داری نہیں لے سکتی، ان دونوں کے بغیر سماج انحراف اور کجروی سے نہیں بچ سکتا۔ خدا نے دین اور سیاست دونوں کو ساتھ ساتھ اپنے پیغمبر پر نازل کیا ہے[۲]۔

۶. خداوند عالم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو طرز حکومت کی خبر دی اور فرمایا: اے داؤد میں نے تمہیں روئے زمین پر خلیفہ بنایا ہے تاکہ خلق خدا کے درمیان حق فیصلہ کرو اور ہوائے نفس کی پیروی ہرگز نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے راستہ سے گمراہ کردے، جو لوگ راہ خدا سے بھٹک جاتے ہیں چونکہ انہوں نے حساب اور روز قیامت کو فراموش کردیا ہے اس وجہ سے وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے[۳]۔

اس آیت میں حضرت داؤد کا خدا کی طرف سے بعنوان حاکم اور خلیفہ تعارف اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نبوت کے علاوہ سیاست اور حاکمیت کی شان بھی رکھتے تھے، اس سے دین وسیاست کا باہمی ارتباط اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔

۸۔ مختلف معاشروں کے ساتھ روابط کے سلسلہ میں قرآن کریم کا بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ دین وحکومت (سیاست) کا آپس میں رابطہ ہے کیوں کہ قرآن کی بعض آیتوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ اگر اسلامی معاشرہ اور حکومت کسی دوسرے معاشرہ سے کوئی بین الاقوامی معاہدہ کرے تو چاہے وہ دار الکفر ہی کیوں نہ ہو اس کی پابندی ضروری ہے اور معاہدہ کا توڑنا اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک کہ طرف مخالف معاہدہ نہ توڑ دے۔ سورۂ توبہ میں برأت مشرکین کے بارے میں لکھا ہے کہ مشرکین

۱۔ محمدی، سید مرتضی، رابطہ دین وسیاست در سہ حوزہ نبوت، امامت وفقاہت، ص ۲۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۷

۳۔ سورہ ص، آیت ۲۶

سے برأت ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جنہوں نے تمہارے دشمن کی مدد نہیں کی ہے لہٰذا آخری وقت تک عہد نامہ پر عمل کرو کہ خدا متقین کو دوست رکھتا ہے۔ اس بناپر سیاست خارجہ اور بین الاقوامی روابط میں اسلامی ملک عوام اور دوسرے ملکوں کے لئے ذمہ دار ہے یعنی اگر اسلامی حکومت نے اپنی صلاح کے مطابق جبر و اکراہ کے بغیر کسی حکومت یا شخص یا کسی غیر ملکی کمپنی سے کوئی معاہدہ کیا ہے تو اسے اپنے عہدہ و پیمان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۹۔ قرآن کریم نے شوریٰ کے بارے میں گفتگو کی ہے جو حکومتوں اور سیاسی نظاموں کے لئے بڑی اہم اور نمایاں چیز ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا قدیم ترین نظام شوریٰ تھا۔ یہاں تک کہ ظالم حکومتیں بھی شوریٰ سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کو قانع کرتی تھیں اور دوسری طرف اپنی ذات سے خود غرضی اور ڈکٹیٹر شپ کے الزام کو دور کرتی تھیں۔ قرآن مجید میں بھی حکومت اسلامی کے نظم و نسق کے لئے شوریٰ کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اسے اسلام کے سیاسی نظام کی ریڑھ کی ہڈی شمار کیا جاتا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی ۳۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ وامرھم شوریٰ بینھم، ان کے درمیان ان کے امور مشورے سے حل ہوتے ہیں۔ مکتب اسلام میں حکومت اور سیاست ایک دوسرے سے مربوط ہے جو شخص بھی قرآن، سنت پیغمبرؐ، طریقہ معصومینؑ اور تاریخ سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ حکومت و سیاست کو اسلام اور دین سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا جدا کرنے کی کوشش خود اسلام کو اسلام سے جدا کرنے کی کوشش ہوگی لہٰذا قرآن کی نظر میں دین اور سیاست میں جدائی قابل تصور نہیں ہے۔

امام خمینی کی نظر میں دین وسیاست کا رابطہ

عصر حاضر میں دین وسیاست کی طرفداری کرنے والوں میں اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی امام خمینی کا نام سب سے اہم ہے۔ بہت سے صاحبان نظر نے دین وسیاست کے مسئلہ کو بیان کیا ہے لیکن عملی طور پر وہ دینی حکومت کی تشکیل نہیں کرسکے لیکن امام خمینیؒ نے ولایت فقیہ کے نظریہ پر مبنی دینی حکومت قائم کرکے عملی طور پر یہ ثابت کردیا کہ دین وسیاست اور دنیا وآخرت کے درمیان رابطہ ہے اور ان کی تکمیل ایک دوسرے کے ذریعہ ہوتی ہے۔ امام خمینی نے اپنی کتاب کشف الاسرار کے ذریعہ دین وسیاست کے رابطہ کے سلسلہ میں پہلا قدم اٹھایا اور اس فکر کی اشاعت میں کامیاب ہوئے۔

آپ کا خیال تھا کہ دین وسیاست میں جدائی استعماری نعرہ ہے جس کی داغ بیل بنی امیہ اور بنی عباس نے ڈالی تھی اور اس صدی میں استعماری طاقتوں نے اس کا نقشہ پیش کیا اور اس خیال کے وہی مبلغ بھی ہیں۔ اس طرح آپ نے اسلام اور عیسائیت کی شباہت سے بھی انکار فرمایا۔ آپ نے علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ اسلام کی حقیقت اور ماہیت کو پوشیدہ نہ رہنے دیں، کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ اسلام بھی عیسائیت کی طرح صرف ایک نام کی چیز ہے جس میں حق وخلق کے درمیان ربط کی چند باتیں ہیں اور بس اور مسجد وکلیسا میں کوئی فرق نہیں ہے۔"[۱]

ہر چند کہ سیاسی تعلق کے سلسلہ میں حقیقی مسیحیت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن موجودہ کلیسا کے دور میں بڑا فرق ہے۔ آج کی مسیحیت نے کلیسا کو غیر سیاسی دینی تجلی کا مرکز بنا کر پیش کیا ہے اور اسلام نے مسجد کو دینی ماہیت کے ظہور کا مرکز بتایا ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ آج کے مغربی تمدن پر مبنی دنیا کی روش اسی بات کا کنایہ ہے کہ اسلامی دنیا سے اس کا رخ الگ ہے اور مسلمانوں کو اپنی حقیقت اپنے تمدن میں تلاش کرنی چاہئے[۲]۔

اگر دین وسیاست کے باہمی ربط کو امام خمینی کے نظریات میں ہم تلاش کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس سلسلہ میں آپ کے اقوال کی وضاحت ضروری ہے۔ امامت اور ولایت امام خمینی کے اقوال کا نمایاں اور اہم حصہ ہے اور عبدالرزاق کے نظریہ خلافت معنوی سے بہت بلند ہے جسے ہم آئندہ تحقیق کا موضوع قرار دیں گے۔ اقوال امام خمینی میں توحید سے نبوت تک پھر امامت وولایت تک اور پھر تشکیل حکومت اسلامی تک بات پہونچتی ہے۔ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم لوگ جو ولایت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اس بات کو مانتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اپنا فرض نبھایا اور خدا نے آپ کو خلیفہ معین کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے ولی امر مسلمین کا تعین فرمایا، ہمارے لئے تشکیل حکومت اسلامی کا نظریہ بہت ضروری ہے۔

امام خمینی کی نظر میں حکومت اسلامی کی تشکیل کے لئے مبارزہ، ولایت پر اعتقاد کا لازمہ ہے اور شرع وعقل کی بنا پر جس طرح حیات رسولؐ اور علیؑ میں حکومتی شعبوں کی ضرورت تھی ، اس طرح

۱۔ امام خمینی، ولایت فقیہ، ص ۱۰

۲۔ وحدت دین وسیاست در اندیشہ امام خمینی، ص ۹۶

ہمارے زمانے میں بھی ان کی ضرورت ہے[1]۔امام خمینی کے اقوال کا دوسرا نمایاں پہلو دین وسیاست کا اتحاد ہے۔عبدالرزاق کا نظریہ دین وسیاست کی جدائی پر مبنی ہے اور انہوں نے دینی نصوص کے ذریعہ اسے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔اس کے بر خلاف امام خمینی نے دین وسیاست کے اتحاد پر زور دیا ہے۔آپ کے قول کے مطابق دین، یعنی اسلام اور تشیع جامع اور کامل ہے، نہ اس میں کمی ہے اور نہ زیادتی، یہ بڑی جامعیت کا حامل ہے۔جمہوریہ اسلامیہ کے بانی کی نظر میں یہ حکم یقینی ہے۔غیر توحیدی مکاتب فکر کے بر خلاف اسلام ، انفرادی، اجتماعی، مادی، معنوی، ثقافتی ، سیاسی ، فوجی، اقتصادی غرض کہ زندگی کے تمام شعبوں میں دخیل ہے۔اس نے انسان اور معاشرہ کی تربیت اور مادی ومعنوی ترقی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔[2]

لفظ سیاست کے بارے میں امام خمینی فرماتے ہیں کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ لفظ بھی لفظ استعمار کی طرح دھوکہ اور فریب کے معنی میں تبدیل کردیا گیا ہے۔اس تبدیلی اور تحریف کی بناپر بعض افراد کے نزدیک دین اور سیاست کی جدائی قابل قبول قرار پائی۔ظاہر سی بات ہے کہ فریب کے معنی میں استعمال ہونے والی سیاست کا نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی رابطہ نہیں ہے بلکہ اس سے تضاد ہے۔مقدس دین اور دیندار افراد اس سے مبرا ہیں۔دین سے سیاست کی جدائی کا باعث سیاست اسلامی اور سیاست شیطانی کا باہم اختلاط ہے۔اس سلسلہ میں محمد عبدہ لکھتے ہیں کہ میں سیاست ، لفظ سیاست، معنائے سیاست اور اس میں استعمال ہونے والے ہر حرف سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔

اسلامی سیاست وہ سیاست ہے جسے انبیائے الٰہی نے قوانین الٰہی کے نفاذ، عدالت کے قیام، حاکمیت خدا اور احقاق حق کے لئے استعمال کیا ہے۔اس سے امام خمینیؒ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس طرح کی سیاست وہ ہے جو دین سے کبھی جدا نہیں تھی بلکہ ہمیشہ دین کے ساتھ ساتھ رہی اور آئندہ بھی اس کے ہمراہ رہے گی۔اسی وجہ سے آپ نے اس بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تمام اسلامی احکام سیاسی ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے۔ امام خمینی کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں واضح سیاسی احکام کے علاوہ

۱۔ مظفری، آیت، چرایی نگاہ متضاد بہ رابطہ دین و سیاست نزد عبدالرزاق مصری وامام خمینی، ص ۱۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۶

عبادی احکام بھی سیاسی ہیں اور اس کا سیاسی پہلو ناقابل تفکیک ہے۔ دنیوی اصلاح کے لئے صرف قانونی، سیاسی، اجتماعی، اقتصادی احکام ہی سیاسی پہلو کے حامل نہیں ہیں بلکہ عبادی احکام جو بندوں کے خصوصی فرائض ہیں وہ بھی عنصر سیاست سے جدا نہیں ہیں[۱]۔

امام خمینی کی جامع نگاہ میں دین زندگی کے تمام چھوٹے بڑے مسائل کا احاطہ کرتا ہے اور سیکولرزم کی سختی سے نفی کرتا ہے۔ آپ کا یہاں تک کہنا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اسلام کا زندگی سے کیا کام تو وہ اسلام سے جنگ کرنے والا ہے اور اس کی معرفت سے عاری ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اسلام کا سیاست سے کیا لینا دینا ہے تو وہ بھی اسلام سے جنگ کرنے والا ہے[۲]۔ ان عقائد اور احکام پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین فقط معنوی امور اور آخرت سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا وآخرت اور مادی و معنوی زندگی کا ہر پہلو دین کے حلقہ میں داخل ہے۔ امام خمینی کی تعبیر یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سوچے کہ اسلام مسیحیت کی طرح ایک ایسا دین ہے جس میں انسان اور خدا کے درمیان ایک معنوی رابطہ ہوتا ہے اور بس بلکہ اسلام کے پاس زندگی اور حکومت کا لائحہ عمل موجود ہے[۳]۔

دین وسیاست کے اتحاد اور رابطہ کے سلسلہ میں امام خمینی عقل اور قرآن وحدیث سے استفادہ کرنے کے علاوہ "ماہیت دین اسلام" کو بھی دلیل کے طور پر پیش فرماتے ہیں اور وہ اس طرح کہ سیاست کے بغیر دین اسلام کی جامعیت کا تصور ناممکن ہے۔ آپ کی نظر میں اسلام دین سیاست ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کے حکومتی، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی احکام پر نظر ڈالے تو اس پر بڑی آسانی سے یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ لہٰذا جس کا یہ خیال ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے تو وہ نہ تو دین کو پہچانتا ہے اور نہ سیاست کو[۴]۔ دوسری جگہ آپ بیان فرماتے ہیں کہ رسول خداؐ نے دین پر سیاست کی بنیاد رکھی ہے اس طرح اسلام کے اخلاقی احکام بھی سیاسی ہیں۔ قرآن کا یہ کہنا کہ "مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں" یہ ایک اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی حکم بھی ہے۔

۱۔ امام خمینی، ولایت فقیہ، ص ۱۹

۲۔ امام خمینی، صحیفہ امام، ص ۱۹

۳۔ چرایی نگاہ متضاد بہ رابطہ دین و سیاست نزد عبدالرزاق مصری و امام خمینی، ص ۱۶

۴۔ ایضاً، ص ۱۸

امام خمینی کی نظر میں دین، سیاست کی بنیاد ہے اور سیاست کو دین سے غذا ملتی ہے اور یہ سیاست، انسانی علمی تجربات اور بشری کارکردگی پر مبنی سیاست کی نفی کرتی ہے۔ دین اور سیاست میں اس قدر قوی امتزاج ہے کہ مفہوم کے لحاظ سے اسے بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے جدا کیا جاسکتا ہے عملی طور پر حکومت کو ایسے دیندار کے اختیار میں ہونا چاہئے جس میں مطلوبہ شرائط موجود ہوں اور اگر اس کے خلاف ہو تو ایسی حکومت کو امام خمینی اسلامی حکومت نہیں سمجھتے۔

شہید مطہری کی نظر میں دین سیاست کا ربط

دین اور سیاست کے باہمی تعلق کے حامیوں میں شہید مرتضٰی مطہری بھی شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس سلسلہ میں بہت کچھ بیان کیا ہے اور حکومت کا نمونہ بھی پیش کیا۔ آپ کے نکتہ نظر سے دین اسلام ایک تجزیہ ناپذیر مجموعہ ہے جس کا ہر پہلو اپنی جگہ اہم ہے اور دین وسیاست باہم متحد ہیں، چونکہ سیاست اور دین ایک ہی شئے ہے اس وجہ سے انہیں الگ کرنا ناممکن ہے۔ جس حکومت کا نمونہ آپ پیش کرتے ہیں اس میں اسلام شناس حاکم کی حکومت ہوتی ہے۔ آپ دین و سیاست کو روح و جسم یا مغز و پوست کی طرح سمجھتے ہیں۔ اسلام کی ترقی کے خواہاں افراد کی سب سے بڑی آرزو یہ ہونی ہے کہ دین وسیاست ایک ہو جائے۔ اسلام اگر سیاست وحکومت اور جہاد کا حکم دیتا ہے تو یہ معنوی میراث یعنی توحید، معارف اسلامی، اخلاق، اجتماعی عدالت، مساوات اور عواطف انسانی کی حفاظت کی خاطر ہے[1]۔ آپ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

> "بنیادی کام یہ ہے کہ لوگوں میں یہ ایمان پیدا ہو کہ سیاسی مبارزہ ایک دینی اور مذہبی فریضہ ہے، لوگ غافل ہیں انہیں نہیں معلوم کہ اسلام کی نظر میں سیاست دین سے اور دین، سیاست سے جدا نہیں ہے لہٰذا دین وسیاست کے باہمی روابط کے بارے میں لوگوں کو سمجھانا چاہئے[2]۔"

استاد مطہری سیاست و دین کے تعلق پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> " سید جمال جیسے لوگوں نے دین وسیاست کی ہم بستگی کے بارے میں جو بتایا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ بقول کوابکی کہ سیاسی استبداد، دینی تقدس کا لبادہ زیب

۱۔ مطہری، مرتضٰی، امامت و رہبری، ص ۳۲

۲۔ مطہری، مرتضٰی، نہضت ہای اسلامی در صد سال اخیر، ص ۲۱

تن کرلے بلکہ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنی سیاسی سرنوشت کو دینی فریضہ اور ذمہ داری شمار کرے۔ دین وسیاست کی ہم بستگی کا مطلب دین کا سیاست سے وابستہ ہونا نہیں ہے بلکہ سیاست کا دین سے وابستہ ہونا ہے۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ دین کا سیاست سے وابستہ ہونا یعنی حکام کو مقدس مقام کا حامل سمجھنا، اہل سنت کی دنیا سے مخصوص ہے، شیعوں میں ایسا کوئی مفہوم نہیں پایاجاتا۔ اولو الامر کی مندرجہ بالا تفسیر شیعوں کے یہاں نہیں پائی جاتی ہے۔"[۱]

استاد مطہری ایک عالم دین کی حیثیت سے آج کے معاشرتی مشکلات کے حل کے لئے دین اسلام کو پیش کرتے ہیں، آپ نے دنیاپر مسلط آج کی سیاست کو رد کرتے ہوئے سیاست اور دین میں ہم آہنگی کا نظریہ پیش کیا ہے۔

دین وسیاست کے باہمی ربط کے مخالفین کا نظریہ

اسلامی نظریہ پردازوں کا ایک گروہ دین وسیاست میں گہرے اور مکمل رابطہ کا قائل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مفہوم اور ساخت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں اور ان دونوں کو جدا نہیں کیاجاسکتا۔ اس نظریہ کے اصلی حامی جمہوری اسلامیہ ایران کے بانی امام خمینی تھے جن کے نظریات کو ہم نے پیش کیا ۔اب دین وسیاست کے باہمی رابطہ کے مخالفین کا نظریہ پیش کریں گے۔ نظریہ اتحاد کے پرچم دار اگر امام خمینی ہیں تو مخالفین میں سب سے بڑا نام علی عبد الرزاق مصری کا آتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں قرآن اور روایات سے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ اسلام میں دین وسیاست کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔

دین وسیاست میں جدائی کا نظریہ رکھنے والے چند باتوں میں مشترک ہیں۔ پہلا اشتراک تو اس بات میں ہے کہ اس گروہ کی نظر میں دینی تعلیمات کا تعلق آخرت اور بعد از مرگ کی باتوں سے ہے اور علم سیاست یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں کیسے زندگی گذاری جائے گی لہٰذا دونوں نظریوں اور نتائج کا حلقہ الگ الگ ہے، دین اور سیاست کی حاکمیت کا میدان جدا ہے لہٰذا دونوں مختلف ہیں۔

۱۔ نہضت ہای اسلامی در صد سال اخیر، ص ۲۶

دوسرا اشتراک یہ ہے کہ دین اسلام کے تمام اصول اور اس کی تمام باتیں مقدس، آسمانی، پائیدار، ناقابل تنقید اور ناقابل تبدیلی ہیں حالانکہ سیاست ان بشری مسائل کا مجموعہ ہے جو بیشتر غیر اخلاقی، فساد اور آلودگی سے پُر ہے، اس میں ثبات نہیں ہے، حالات کے مطابق ہمیشہ قابل تنقید، اعتراض اور تبدیلی ہے لہٰذا دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں[۱]۔

تیسرا محور اشتراک یہ ہے کہ دین کے حدود کو کتاب وسنت سے دریافت نہیں کر سکتے کیوں کہ قلمرو دین، اصول دین میں شامل ہے اور اصول دین کو تعبدی طور پر نہیں مانا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں نقلی دلیل سے تمسک (قرآن وسنت سے تمسک) سے دور لازم آتا ہے جو باطل ہے، اس طرح انسان دین کے کسی مسئلہ کو پانے کے لئے پہلے متکلمانہ دلیلوں سے قبول کرتا ہے کہ دین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے تاکہ فقیہانہ طور پر اس چیز کی تلاش شروع کرے[۲]۔

اس بحث کا چوتھا محور اشتراک یہ ہے کہ اگرچہ دین کا کچھ حصہ دنیاوی زندگی کے مسائل سے متعلق ہے لیکن اس کا مقصد، سیاسی مقاصد سے میل نہیں کھاتا۔ ہوش مند، صاحب علم اور نیک لوگوں کی تربیت دین کا مقصد ہے جو اس طرح کی تربیت پاکر مادی مسائل سے بلند ہو کر معنوی کمال حاصل کریں اور موجودہ حالت سے معنوی اور اخلاقی مطلوبہ حالت کی طرف بڑھتے جائیں لیکن سیاست کا مقصد معنوی اور اخلاقی مسائل پر توجہ دئے بغیر صرف مادی حالت کو درست کرنا ہے[۳]۔

دین وسیاست کے اتحاد کے مخالفین کے درمیان پانچویں مشترک بات جس پر سب متفق ہیں وہ یہ ہے کہ احکام وقوانین اسلامی کے پہچان کا سب سے معتبر اور پہلا مدرک قرآن کریم ہے، اس میں سیاست اور حکومت کی بات نہیں ہے حالانکہ دین وسیاست کے اتحاد کے حامی اسی قرآن سے سیاست وحکومت کو ثابت کرتے ہیں۔

چھٹا موضوع اشتراک وہی باتیں ہیں جو مولا علی کے زمانہ میں خوارج کیا کرتے تھے اور وہ یہ کہ خدا کے ارادہ کے علاوہ کسی کا ارادہ انسان پر حاکم نہیں ہو سکتا، عوام پر بلاشریک صرف خدا کی حاکمیت اور اطاعت ضروری

۱۔ نسبت دین وسیاست، ص ۲۷

۲۔ دین وسیاست، ص ۸۶

۳۔ ایضاً

ہے۔ وہ صرف دنیاکے پیدا کرنے والے کے فرماں بردار ہیں۔ کسی انسان کو خدا نے حاکمیت کا حق نہیں دیا ہے۔ علیؑ سے مخالفت کے موقع پر ان کا مشہور نعرہ الحکم للہ لا لک یا علی اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا[۱]۔

دین وسیاست کے متعلق علی عبد الرزاق کا نظریہ

دین وسیاست کے سلسلہ میں علی عبد الرزاق مصری کا نظریہ بہت اہم مانا جاتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ میں "الاسلام والحکم" نامی کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سیکولرزم پر بحث پیش کی ہے۔ وہ دین وسیاست کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا تصور کرتے ہیں اور شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سیکولر نظریہ رکھنے والوں نے عبد الرزاق سے زیادہ کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی چار دہائیوں میں اسلام سے انحراف کے طور پر ان کی فکری پہچان کی جاتی ہے۔ لوگوں نے شدت سے ان کی مخالفت کی ہے لیکن رفتہ رفتہ دنیائے اسلام کے روشن فکر سیکولر افراد نے اسے قبول کرلیا۔ وہ سیکولرزم کو مشروع قرار دینے والوں میں شامل تھے[۲]۔ انہوں نے اپنی کتاب اور نظریہ کو اس استدلال پر تحریر کیا ہے کہ قرآن نے سیاست اور حکومت کے موضوع پر کچھ نہیں کہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ بس احکام خدا کا نفاذ ہو جائے یہی بات شریعت میں ثابت اور واجب ہے۔ اگر امت نے احکام الٰہی کے نفاذ کو مان لیا تو پھر کسی امام، خلیفہ یا ایسے انسان کا نصب کرنا ضروری نہیں ہے جو سیاست اور حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ امامت و خلافت کے مسئلہ میں متکلمین کا اختلاف اور یہ کہ وجوب نصب امام وخلیفہ عقلی ہے یا شرعی، اسی طرح ان لوگوں کا استدلال میں صرف اجماع پر اکتفاء کرنا اس بات کی علامت ہے کہ حکومت وسیاست کی بنیاد دین ہے۔[۳]

عبد الرزاق نے اپنے نظریہ کی توجیہ اور توضیح کی بڑی کوشش کی اور مختلف انداز سے استدلال پیش کرتے رہے۔ قرآن کریم کی آیات، روایات اور حکم عقلی کے ذریعہ انہوں نے اپنے نظریہ کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ اپنے استدلال میں قرآن سے فرائض پیغمبر بیان کرنے والی بہت سی آیتیں پیش کیں۔ ان کا خیال ہے کہ قرآنی آیات میں غور وفکر کرنے کے بعد ہم رسول خدا کے بلند مقام کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے

۱۔ دین وسیاست، ص ۷۳

۲۔ چرایی نگاہ متضاد بہ رابطہ دین و سیاست نزد عبدالرزاق مصری وامام خمینی، ص ۴

۳۔ نسبت دین وسیاست، ص ۷۲

ہیں۔ آیتوں میں جو باتیں صراحت سے نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ کا تعارف حفیظ، بشیر، نذیر، خاتم النبین جیسے صفات سے کرایا گیا ہے۔ معاشرہ میں پیغمبر کے کام کو جن آیتوں میں بیان کیا گیا ہے ان کی نظر میں ان میں سب سے بہترین آیت "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا "[۱] ہے۔ اس بناپر اگر رسالت کے سوا پیغمبر کا کوئی دوسرا حق بھی ہوتا تو وہ بیان ہوتا۔ مثلاً اگر آپ بادشاہ اور سلطان ہوتے تو کم سے کم قرآن میں کسی ایک مقام پر "حق الرسالہ" کے ساتھ "حق الملک" کا ذکر ہوتا اور رسول و بادشاہ کا مقام بہت واضح ہے[۲]۔ قرآن مجید کی آیات مثلاً سورہ نساء ۸۰، سورۂ انعام ۶۷، ۶۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۸، سورہ یونس ۶۸، سورہ شوریٰ ۲۱، ۲۲، سورہ غاشیہ ۵۴، سورہ نور ۵۶ اور سورہ فرقان سے عبد الرزاق نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن مجید نے پیغمبر کے نگہبان، وکیل، جبار یا طاقت کا استعمال کرنے والا ہونے کی شدید نفی کی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لوگوں کو مومن بنانے میں پیغمبرؐ نے طاقت کا استعمال نہیں کیا، اب جو شخص نگہبان اور تسلط والا نہیں ہے وہ ملک (دنیوی رئیس وحاکم) بھی نہیں ہے کیوں کہ ہر دنیوی قدرت (ملک) کا لازمہ تسلط اور لامحدود اقتدار ہے[۳]۔

عبد الرزاق کے نظریہ کے مطابق اسلام خدا کی طرف سے ایک دعوت ہے۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جس کا رجحان اصلاح نوع بشر ہے۔ یہ خدا سے قریب کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا مجموعہ ہے جس سے کل بشریت کو مرتبط کرنے کا خدا نے ارادہ کیا ہے۔ وہ زمین کے تمام انسانوں کو اسی حلقہ میں لانا چاہتا ہے، یہ مقدس دعوت تمام انسانوں کے لئے ہے، انہیں چاہئے کہ وہ خدا کی رسی سے وابستہ ہو جائیں ایک امت ہوں، ایک خدا کی عبادت کریں[۴]۔

عبد الرزاق کا خیال ہے کہ امامت، خلافت، بیعت، اولی الامر، امت اور جماعت کے جو الفاظ اور اصطلاحات آیات و روایات میں ملتی ہیں وہ آج استعمال ہونے والی حکومت اور سیاست کے معنی میں نہیں ہیں۔ اس وقت ان کے یہ معنی نہیں تھے۔ ان شرعی الفاظ کے جو معنی آج بیان ہو رہے ہیں یعنی امام وخلیفہ،

۱۔ سورہ احزاب، آیت ۴۰

۲۔ قاسمی، محمد علی، نقد و بررسی تفکر جدایی دین از سیاست، مجلّہ فلسفہ، کلام و عرفان، شمارہ ۲۱، ص ۴۹

۳۔ عبد الرزاق، علی، الاسلام واصول الحکم، ص ۱۴۶

۴۔ ایضاً، ۱۵۲

رئیس حکومت اور اولی الامر بمعنی زمامدار و حکام، بیعت بمعنی انتخاب اور امت وجماعت بمعنی حکومت وممالک اسلامی، یہ تمام معانی جدید ہیں۔ ان الفاظ کا ان معانی کے لئے استعمال اس وقت صحیح ہوگا جب زمان نزول آیات اور روایات کے صدور کے موقع پر ان سے ایسے ہی معنی مراد لئے جاتے ہوں، حالانکہ ایسی بات کا اثبات ممکن نہیں ہے۔[1]

سیاست کے اسلام سے جدا ہونے کے سلسلہ میں عبد الرزاق نے بہت سی روایتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ان میں سے احمد بن زینی دحلان کی کتاب السیر النبویہ سے بھی ایک روایت نقل کی کہ پیغمبرؐ کے پاس ایک شخص اپنی حاجت لیکر حاضر ہوا جب وہ آپ کے قریب آیا تو لرزنے لگا۔ پیغمبر نے اس سے فرمایا گھبراؤ نہیں نہ میں ملک ہو نہ جبار، میں تو فقط قریش کی اس عورت کا بیٹا ہوں جو گوشت اور پسا ہوا نمک کھاتی تھی۔ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جب جناب اسرافیل کی طرف سے رسول اکرمؐ کو پیغمبر شاہ اور پیغمبر بندہ کے درمیان انتخاب کی دعوت دی گئی تو آپ نے جناب جبرئیل سے معلومات کی تو جبرئیل نے انکساری کی نشانی کے طور پر زمین کی طرف نظر ڈالی (ایک دوسری روایت میں ہے کہ جناب جبرئیل نے آپ کو متواضع رہنے کا مشورہ دیا) تو پیغمبر نے فرمایا کہ میں پیغمبر بندہ ہوں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر بادشاہ نہیں تھے اور بادشاہ بننا بھی نہیں چاہتے تھے، ان کا مزاج بھی ایسا نہیں تھا[2]۔

عبدالرزاق اس بات کے بھی قائل ہیں کہ پیغمبر کا اقتدار دینی اقتدار تھا اور وہ رسالت کی دین تھا جو آپ کی وفات کے بعد ختم ہو گئی تو پھر اقتدار بھی ختم ہوگیا۔ اقتدار میں آپ کا کوئی جانشین نہیں تھا، امر رسالت میں بھی ایسا ہی تھا۔اگر آپ کی وفات کے بعد آپ کے پیروکاروں میں اقتدار ضروری تھا تو یہ اقتدار بالکل جدید تھا آپ کو جو اقتدار حاصل تھا اس کا اس سے کوئی ربط نہیں تھا[3]۔اس طرح آپ نے پوری زندگی میں حکومت اسلام یا حکومت عربی جیسے کسی نام کی طرف اشارہ بھی نہیں فرمایا۔ عبدالرزاق کے خیال سے

۱۔ نسبت دین وسیاست، ص ۴۷

۲۔ الاسلام واصول الحکم، ص ۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۶۸

اسی بنیاد پر پیغمبر نے کسی کو اپنا جانشین بھی نہیں بنایا کیونکہ جانشین بنانا آپ کی ماموریت کا حصہ نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عبدالرزاق علی کی جانشینی پر مبنی شیعہ نظریہ کو بھی علمی اعتبار سے بہت معمولی سمجھتے ہیں[۱]۔

خلاصہ یہ کہ عبد الرزاق اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن ، سنت، عقل اور اجماع کسی ذریعہ سے بھی رسالت پیغمبرؐ کے سیاسی ہونے پر دلیل قائم نہیں ہوتی ۔ خلافت یا قضاوت یا حکومت کا کوئی بھی فریضہ دینی امر شمار نہیں کیاجاتا۔ یہ سب باتیں سیاسی ہیں جس پر دین کوئی توجہ نہیں دیتا، نہ اس کی شناخت کرنا چاہتاہے اور نہ انکار، نہ اس کا حکم دیتاہے نہ اس سے منع کرتاہے۔ عبد الرزاق کی کتاب میں اسلام کے اندر دین اور سیاست بالکل الگ الگ ہیں ۔انکے خیال میں یہ دونوں چیزیں نہ کبھی ایک دوسرے سے مرتبط تھیں اور نہ آئندہ ہوں گی۔

نتیجہ

جو کچھ اس تحریر میں بیان ہوا اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتاہے کہ مختلف تعریفوں اور گوناگوں نتائج کے باوجود اسلام میں دین وسیاست کے موضوع پر دو نظریات موجود ہیں، ایک دونوں کی جدائی کا نظریہ ہے اور دوسرا، دونوں میں ہم آہنگی اور اتحاد کا نظریہ ہے۔

دین وسیاست میں جدائی کا نظریہ رکھنے والے کم ہیں۔ وہ دونوں میں ہر طرح کے ارتباط اور عمل دخل کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں سے کسی کی بھی دوسرے میں مداخلت دونوں کے اضمحلال، ضعف اور ناتوانی کا باعث ہے۔ اس گروہ کے سرخیل کا رواں عبد الرزاق مصری ہیں جو قرآن و احادیث کے مختلف اسناد سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ دین وسیاست میں کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس نظریہ کے حامل افراد کے مطابق دین کی ذمہ داری اور مقصد سے سیاست کی ذمہ داری الگ ہے، ایک کا تعلق دنیا سے ہے اور دوسرے کا تعلق آخرت سے۔

اس کے مد مقابل دخالت اور ہم بستگی کا نظریہ ہے۔ یہ گروہ ان کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے کہتاہے کہ وہ لوگ آیات قرآنی کی اچھی طرح تفسیر وتعبیر اور ادراک سے قاصر ہیں اور روایات و سنت سے بھی صحیح نتیجہ نہیں نکالتے اسی وجہ سے اسلام میں دین وسیاست کے رابطہ کو اچھی طرح

۱۔ چرایی نگاہ متضاد بہ رابطہ دین وسیاست نزد عبدالرزاق مصری وامام خمینی، ص ۱۰

نہیں سمجھتے ۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے دین اسلام کے عقلی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے اس بناپر عقل کے عمل اور عقلی دلائل پر انہوں نے بہت کم توجہ دی ہے یا اس کی کنہ تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔

یہ گروہ قرآنی آیات، روایات اور عقلی دلیلوں سے دین وسیاست کے گہرے اور مضبوط رابطہ کو ثابت کرتاہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ لوگ انسانوں کے سلسلہ میں دین وسیاست کی ذمہ داریوں اور مقاصد کو ایک سمجھتے ہیں۔ انسانوں کی دنیا کو بہتر بنانے کی ذمہ داریاں اسلام بہتر طریقے سے نبھاتا ہے اور انسانوں کی تربیت وپرورش اور انتظام دنیاکے ساتھ ساتھ آخرت کی حقیقی سعادت کی طرف سیاست بھی متوجہ ہے لہٰذا دونوں میں جدائی ممکن نہیں ہے۔ دنیائے اسلام کے اکثر مفکرین، حکماء اور فقہاء کا یہی نظریہ ہے۔ مثلاًمعلم دوم ابو نصر فارابی ، ابن سینا، خواجہ نصیر، ملّا صدرا، شیخ اشراق، شیخ مفید، شیخ طوسی، علّامہ حلی، علامہ مجلسی، ملا احمد نراقی، ماوردی، غزالی ، فخرالدین رازی وغیرہ اسی گروہ میں شامل ہیں۔

عصر حاضر میں سیّد جمال الدین اسد آبادی، محمد عبدہ، نائینی ، امام خمینی، محمد باقر صدر، مرتضٰی مطہری علامہ طباطبائی ، سید قطب ، مودودی وغیرہ بھی اسی جماعت میں داخل ہیں۔ ایران اور عصر حاضر کے عالم تشیع میں اس گروہ کے سر خیل کاروان امام خمینی ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ دین وسیاست کے درمیان رابطہ کو جو شخص نہ پہچانے یا انکار کرے اس نے اسلام ہی کو نہیں پہچانا کیوں کہ ان دونوں کے عمیق اور مضبوط رابطہ پر بہت سے عقلی اور نقلی دلائل قائم ہیں۔ آیات قرآنی روایات اور حکم عقل وخرد کا اگر ایک تحقیقی جائزہ لیاجائے تو نتیجہ کے طورپر مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

ا۔ دین وسیاست دونوں ہی کا اصل موضوع انسان ہے ، مختلف پہلوؤں کے باوجود کوئی بھی پہلو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے یعنی نہ تو انسان کا جسم اس کی روح سے جدا ہے اور نہ اس کی دنیا ، آخرت سے الگ ہے لہٰذا انسان کے وجودی پہلو میں تفکیک ممکن نہیں ہے تو پھر اسے دو متقابل رہبری کے سپرد کیسے کیاجاسکتا ہے۔ انسان جیسے ایک وجود کے لئے ایسا کام ممکن ہی نہیں ہے۔

۲۔ دین وسیاست میں جدائی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دو مقاصد ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں یعنی دنیا آخرت کے مد مقابل ، جسم ، روح کے مد مقابل اور مادہ معنویت کے مد مقابل قرار پائے گا۔ ایسا تعارض، انسانی زندگی اور کرامت کے لئے نقصان دہ ہے مثلاً اگر یہ بات فرض کی جائے کہ سیاست اسے بد اخلاقی کی طرف کھینچتی ہے اور دین اسے اخلاق ومعنویت کی طرف بلاتا ہے تو ایسے میں انسان تعارض کا شکار ہو کر زندگی میں حیران وپریشان رہے گا اور پھر اس کے آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔

۳۔ دین وسیاست میں جدائی کا نظریہ نہ تو تاریخی نظریہ ہے اور نہ انسانی، یہ دو ثقافتی زمانہ یعنی وسطی اور جدید دور کی پیداوار ہے۔ جب دنیائے اسلام میں دین وسیاست میں جدائی کی بحث ہی نہ تھی تب یہ بحث پیدا کی گئی بلکہ اسے ایک تاریخی امر کے عنوان سے عصر حاضر میں مغربی ثقافت کے زیر اثر ایجاد کیا گیا لہٰذا صدر اسلام یا اس کے بعد کے ادوار میں اس مسئلہ کا وجود ہی نہیں تھا۔

۴۔ جدید دور میں تیسری دنیا خصوصاً اسلامی معاشرہ میں اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر دین و سیاست کی جدائی کے نظریہ کو استعماری طاقتوں نے ہتھیار کے طورپر استعمال کیا ہے۔ انہوں نے لوگوں کے درمیان اس نظریہ کی ترغیب دلائی اور انہیں پھنسانے کی بھرپور کوشش کی لہٰذا جدائی کا نظریہ اسلام کے دشمنوں کو نفع پہونچانے کا نظریہ ہے جو انہیں کی طرف سے اٹھایاگیا ہے اور یہ ایک استعماری حربہ ہے لہٰذا اس کو ہوا دینا اسلام اور اس کے پیروکاروں کے لئے نقصان کا باعث ہے، اصل بقائے حیات اور کاروبار حیات سے تعارض کا باعث ہے تو اب کوئی مکتب ایسے فکر کی پابندی کیسے کرسکتا ہے جو اس کے اور اس کے پیروکاروں کے لئے ضرررساں ہو۔

۵۔ قرآنی آیتوں سے ان دونوں کی جدائی کے جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ مضبوط نہیں ہیں بلکہ بہت ہی شاذونادر ہیں اور مسلمان دانشوروں اور مفسرین کے نظریہ سے ٹکراتے ہیں۔

۶۔ جن روایتوں میں پیغمبر اکرمؐ کو بادشاہی کے بجائے نبوت کے لئے منتخب کرنے کا ذکر ہے وہ روایتیں بھی دین وسیاست کی جدائی پر دلالت نہیں کرتیں کیوں کہ ان میں دو طرح کی چیزوں کو ایک ساتھ رکھ دیا گیا ہے مثلاً بادشاہی کو پیغمبری کے ساتھ رکھا گیا ہے حالانکہ یہ دو قسم کی چیزیں

دین وسیاست کے برابر نہیں ہیں۔ بادشاہی ایک خاص طرح کا نظام ہے جبکہ نبوت کے اندر سیاسی اور الٰہی دونوں نظام ہو سکتے ہیں یعنی اس میں ایسی سیاست ہو سکتی ہے جو آسمانی اور خدائی سیاست ہو۔

۷۔ شریعت اور حکومت کے رابطہ والی بحث بھی دین وسیاست کے رابطہ والی بحث کے مترادف نہیں ہے کیوں کہ نہ تو شریعت وشرع دین کے مترادف ہے اور نہ حکومت، سیاست کے مترادف ہے۔

۸۔ پیغمبر اسلام کی دس سال کی مدنی سیرت، حضرت علیؑ کی حکومت کے چار سال اور چھ مہینہ کی سیرت ، چھ مہینہ تک امام حسنؑ کی حکومت کی سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ دین وسیاست میں کوئی جدائی نہیں ہے۔

۹۔ گذشتہ بیانات کے مطابق دین وسیاست کے رابطہ کے طرفدار گروہ کی دلیلیں زیادہ منطقی ، معقول اور قابل استفادہ ہیں۔ وہ قرآنی آیتوں سے اپنا استدلال پیش کرتے ہیں۔ مخالفین جن کے ذریعہ رابطہ کی نفی کرتے نظر آتے ہیں وہ دین وسیاست کی ساخت اور مفہوم ، قرآنی آیتوں کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مخالفین جن آیتوں سے اس رابطہ کو رد کرنا چاہتے ہیں ان میں سے بہت سی آتیں مکی ہیں جو اس زمانہ سے متعلق ہیں جب رسول اکرم لوگوں کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے ۔ اس کے علاوہ مخالفین نے ان تمام آیتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے روایتوں کے بارے میں بھی ان کی یہی حالت ہے۔

غرض کہ دین وسیاست کا موضوع انسان اور اس کی پرورش ہے اور انسان ایک ایسا موجود ہے جس کی ساخت اور فطرت ایک ہے، نتیجہ میں تدبیر ہدایت اور اس کی پرورش کرنے والے دین وسیاست کو بھی متحد ہونا چاہئے تاکہ وہ انسان کی پرورش ، ہدایت اور امور کی تدبیر کا لائحہ عمل پیش کرکے دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔

منابع ومآخذ:

- قرآن کریم
- ابن خلدون ، ترجمہ محمد پروین گنا بادی، شرکت انتشارات علمی وفرہنگی ، تہران،۱۳۶۶
- اکبریان، علی، دین وسیاست، مجلّہ فلسفہ، کلام وعرفان شمارہ ۲، ۳، ۱۳۷۶

- امام خمینی، شؤون واختیارات ولی فقیہ، ترجمہ ولایت فقیہ از کتاب البیع، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۶۹
- امام خمینی، فرہنگ نامہ سیاسی، الٰہی، انتشارات وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۷۱
- امام خمینی، صحیفۂ نور، جلد ۸، سازمان مدارک فرہنگی انقلاب اسلامی وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، تہران ۱۳۷۳
- امام خمینی، صحیفۂ امام، ج ۲۲، موسسۂ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۸۷
- امام خمینی، ولایت فقیہ، انتشارات آزادی، قم
- بہادروند، محمد مہدی، در آمدی بر رابطۂ دین وسیاست، مجلّہ فقہ واصول حکومت اسلامی، شمارہ ۲۴، تابستان ۱۳۸۱
- جعفری، محمد، سکولاریزم از دیدگاہ شہید مطہری، مجلّہ فلسفہ کلام و عرفان رواق اندیشہ، شمارہ ۱۴، ۱۳۸۱
- جمشیدی محمد حسین، رخ اندیشہ، کتاب اول، کلبہ معرفت، تہران، ۱۳۸۵
- خواجہ سروری، غلامرضا، رابطۂ دین وسیاست در اندیشۂ مہندس بازرگان، مجلّہ پانزدہ خرداد، دورہ اول، شمارہ ۲۳، ۱۳۷۵
- خواجہ سروری، غلام رضا، وحدت دین وسیاست در اندیشۂ امام خمینی، مجلّہ علوم سیاسی، شمارہ ۱۶، ۱۳۸۰
- دہخدا، علی اکبر، لغت نامہ، ، انتشارات دانشگاہ تہران، تہران، ۱۳۸۳
- دو ورژہ، موریس، اصول علم سیاست، ترجمہ ابو الفضل قاضی، داد گستر، تہران، ۱۳۷۶
- سہرابی فر، محمد تقی، گذر از تعریف دین بہ شمول گرائی، مجلّہ رواق اندیشہ، شمارہ ۳۱، ۱۳۸۵
- شجاعی زند، علی رضا، تعریف دین و معضل تعدد، مجلّہ نقد ونظر، سال پنجم، شمارہ سوم وچہارم، ۱۳۸۵
- صدر، سید محمد باقر، سنت ہائے تاریخ در قرآن، ترجمہ سید جمال موسوی اصفہانی، دفتر انتشارات اسلامی وابستہ بہ جامعۂ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، ۱۳۸۸
- عبد الرزاق، علی، اسلام ومبانی قدرت، ترجمہ امیر رضائی، انتشارات قصیدہ سرا، ۱۳۸۰
- عبد الرزاق، علی، الاسلام واصول الحکم، دراسات ووثائق محمد عمارہ، الموسۃ العربیہ للدراسات والنشر، بیروت، ۲۰۰۰
- عمید زنجانی، عباس علی، نسبت دین وسیاست، مجلّہ فلسفہ، کلام وعرفان، ۱۳۷۵
- فارابی، ابو نصر، تحصیل السعادہ، دار المکتبہ الہلال، بیروت، ۱۹۹۵

❖ فاضل، مقداد بن عبداللہ، اللوامع الالٰہیہ فی مباحث الکلامیہ، مطبوعہ محمد علی قاضی طباطبائی، تبریز،۱۳۹٦ق

❖ قاسمی، محمد علی، نقد وبررسی تفکر جدائی دین از سیاست، مجلّہ ،فلسفہ، کلام وعرفان(رواق اندیشہ)،شمارہ ۲۱، ۱۳۸۲

❖ لاریجانی، جواد ، نقد دینداری ومدرنیسم ، انتشارات اطلاعات، تہران ،۱۳۷۲

❖ ماوردی ، علی (۱۳۹۳ق / ۱۹۷۳م)، الاحکام السلطانیہ ، قاھرہ

❖ محمدی، سید مرتضٰی ، رابطۂ دین وسیاست در سہ حوزہ نبوت، امامت و فقاہت، مجلّۂ فلسفہ، کلام وعرفان ، سفیر، پیش شمارہ ۲ ،۱۳۸۵

❖ مصباح یزدی ، محمد تقی ،آموزش عقائد

❖ مطہری، مرتضٰی ، نہضت ھای اسلامی در صد سالہ اخیر، انتشارات صدرا، تہران،۱۳۷۱

❖ مطہری ، مرتضٰی ، امام ورہبری، انتشارات صدرا ، تہران،۱۳۷۴

❖ مظفری، آیت ، چرایی نگاہ متضاد بہ رابطہ دین وسیاست نزد عبدالرزاق مصری وامام خمینی، فصلنامہ مطالعات انقلاب اسلامی، سال چہارم شمارہ ۱۵ ، ۱۳۸۷

❖ Robertson, Roland , The Sociological Interpretation of Religion , Oxford , Basil Balackwell. 1970

❖ Tansey. Stephen D, Polities. London: Routledae, 2000.

ولایت فقیہ پر مبنی حکومت
امام خمینی (رہ) کی نظر میں

مؤلف: محمد مہدی رشادی
مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی

اس مضمون کا بیشتر حصہ نظریہ انتصاب سے متعلق ہے جس کی تشریح کی سب سے زیادہ کوشش امام خمینیؒ نے کی ہے۔ ولائی حکومت میں ولایت، مجلس خبرگان رہبری، نظام کی عوامی حمایت اور حاکم اسلامی کے حدود اختیارات جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم سب سے پہلے فقیہ کی ولایت مطلقہ کے بارے میں گفتگو کریں گے جس کا ذکر اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین میں موجود ہے۔ اس کے بعد ہم ائمہ معصومینؑ کی ولایت مطلقہ اور فقیہ کی ولایت مطلقہ کے بنیادی فرق کو بیان کریں گے۔ اس نقطہ نظر سے معاشرے کے نظم و نسق اور قانون کے نفاذ کے سلسلے میں معصومؑ کی ولایت اور زمانہ غیبت میں ولی فقیہ کی ولایت میں چار بنیادی فرق پایا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلامی حکومت کی بنیادوں کے سلسلے میں کچھ سوالات پوچھے جاتے ہیں، مثلاً حاکم اسلامی کی مشروعیت الٰہی ہے یا عوامی؟ یا الٰہی اور عوامی دونوں ہے؟ حاکم کی طاقت اور اختیارات مطلق ہے یا محدود؟ حاکمیت میں عوام کا کس حدتک دخل ہے؟ شیعہ مفکرین نے اس طرح کے سوالات کے بہت سارے جوابات دیئے ہیں جن میں سے نظریہ انتصاب، نظریہ انتخاب، نظریہ وکالت اور نظریہ تکلیف بہت اہم ہے۔[1] اس مضمون میں آخری تینوں نظریات کا اجمالی تذکرہ ہوگا، پھر نظریہ انتصاب کے بارے میں امام خمینی جیسے بڑے فقہا کی رائے پیش کی جائے گی۔

۱۔ معرفت، محمد ہادی، ولایت فقیہ، ص ۵۰

نظریہ انتخاب

غیبت معصوم (ع) کے دور میں دینی حکومت کی مشروعیت اور حاکم کی حاکمیت کے جواز کے سلسلے میں نظریہ انتخاب کے نقطہ نظر سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارادۂ ملّت اور عوام کی اکثریت سے اس میں مشروعیت اور استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ جب معصوم علیہ السلام موجود ہوں تو اس جگہ اور اس زمانہ میں انہیں کی حکمرانی ہوتی ہے لیکن غیبت کے زمانہ میں صرف صالح افراد کے صفات اور شرائط (فقہائے جامع الشرائط) ائمہ معصومین (ع) نے بیان کئے ہیں۔[1] اکثریت کی رائے سے باصلاحیت افراد میں سے کسی ایک کے انتخاب کا طریقہ موجود ہے۔ صاحب صلاحیت رہبری کا مستحق شخص عوام کے ذریعہ منتخب ہوتا ہے۔ یہ نظریہ عوامی انتخاب کے نظریہ کے نام سے مشہور ہے[2]۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ شرعی نقطہ نظر سے غیبت کے زمانہ میں حکومت کی مشروعیت عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ عوام اور حاکم کے درمیان معاہدہ کو حکومت کہا جاتا ہے جسے شارع نے درست قرار دیا ہے۔ امت اور ان کے ذریعہ سے منتخب حاکم کے درمیان شرعی معاہدہ کا نام اسلامی حکومت ہے اور انتخاب، وکالت عام کے معنی میں ہے یعنی عوام کسی شخص یا گروہ کو حق حکومت دیتے ہیں جسے وہ شخص یا گروہ قبول کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں وکالت عقد لازم ہے کیوں کہ آیۃ أَوۡفُواْ بِٱلۡعُقُودِ [3] کا مطلق ہونا اس کے لزوم کو بیان کرتا ہے[4]۔ اس نظریہ کی بنیاد پر انتصاب کے نظریہ کے برخلاف، تمام فقہاء کا بالفعل ولایت پر فائز ہونا امر محال ہے[5] یعنی تمام فقہاء بالقوۃ مقام ولایت کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن انتخاب کے ذریعہ ایک فقیہ کی ولایت متحقق ہوگی[6]۔ عوامی انتخاب (بیعت وکالت) سے پہلے تمام فقہاء میں ولایت کی صلاحیت پائی جاتی ہے لیکن کسی کی ولایت نہیں ہوتی اور جب عوام کسی کو منتخب کریں گے تو وہی ایک شخص ولی

۱۔ منتظری، حسین علی، دراسات فی ولایۃ الفقیہ و فقہ الدولہ الاسلامیہ، جلد۱، ص۴۰۵

۲۔ رشاد، علی اکبر، دموکرسی قدسی، ص۹۹-۱۰۰

۳۔ سورہ مائدہ، آیت نمبر ۱

۴۔ دراسات فی ولایۃ الفقیہ و فقہ الدولہ الاسلامیہ، ج۱، ص۵۷۶، ۵۷۵؛ ولایت فقیہ، ص۵۵

۵۔ ایضاً، ص ۴۰۹، ۴۰۸

۶۔ ایضاً، ص۵۲۶، ۵۳۳

قرار پائے گا[1]۔ اس نظریہ کو شیخ حسین علی منتظری اور شیخ نعمت اللہ صالحہ نجف آبادی نے قبول کیا ہے البتہ اس نظریہ پر صاحبان نظر کی تنقیدیں سامنے آئی ہیں۔

نظریہ وکالت

اس نظریہ کا یہ ماننا ہے کہ سیاست یا ملک کو چلانے والے قوانین تبدیل ہوتے رہتے ہیں لہٰذا انہیں تبدیل نہ ہونے والے الٰہی احکام کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا ہے جس کی بناپر معصوم کی حکومت کا بھی انکار کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کے اعتبار سے کسی ملک یا شہر کے عوام کسی خاص شخص یا گروہ کو اپنی نمائندگی کے لئے وکیل بنالیتے ہیں اور اسے اجرت دیتے ہیں تاکہ وہ ملک کا نظم و نسق سنبھالے لہٰذا اس طرح کا حکومتی نظام ایک جائز وکالت کی طرح ہوتا ہے جو عوام کی طرف سے دی جاتی ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ حکومت صرف لوگوں کی نمائندہ ہے اور بس۔

اس نظریہ کی رو سے ایک معاہدہ کے مطابق حاکم، عوام کا وکیل بنایا جاتا ہے اور اس کے حدود طئے کئے جاتے ہیں جن سے حاکم روگردانی نہیں کرسکتا ہے، لہٰذا اس کے اختیارات عوام کی چاہت کے مطابق محدود ہوتے ہیں، لوگ جب چاہیں اسے معزول کرسکتے ہیں۔

اس سیاسی نظریہ کے اعتبار سے اسلامی معاشرہ کا حاکم عوام کا وکیل ہوتا ہے نہ کہ ولی اور اس کا جواز بھی عوامی جواز ہے، الٰہی مشروعیت نہیں ہے اور نہ الٰہی اور عوامی مشروعیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اصلی حاکم عوام ہیں نہ کہ ان کا وکیل۔ڈاکٹر مہدی حائری یزدی نے اسلامی انقلاب کے بعد اس نظریہ کو پیش کیا[2]۔

نظریہ تکلیف

جن فقہاء کے نزدیک نظریہ انتصاب کے لئے کافی دلیلیں نہیں تھیں انہوں نے امور حسبیہ (وہ امور جن کے معطل ہونے پر شریعت راضی نہیں ہے) میں فقیہ کے اقدام کو ایک واجب فریضہ اور تکلیف

۱۔ دراسات فی ولایۃ الفقیہ و فقہ الدولہ الاسلامیہ، ج۱، ص ۵۷۶، ۵۷۵

۲۔ کدیور، محسن، نظریہ ہای دولت در فقہ شیعہ، ص ۱۷۵-۱۸۶

شمار کیا ہے۔ آیات عظام سید محسن حکیم، سید احمد خونساری اور سید ابوالقاسم خوئی ان فقہاء میں شامل ہیں جو فقیہ کے جواز تصرف کے قائل ہیں۔

آیت اللہ خوئی کی نظر میں ولایت پیغمبرؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے مخصوص ہے اور غیبت کے زمانہ میں اسے ثابت کرنے کا امکان نہیں ہے[۱]۔ فقیہ کے لئے روایت سے جو ثابت ہے وہ قضاوت اور فتوے کی حجیت ہے۔ امور حسبیہ میں تصرف کا جواز فقیہ کی ولایت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ ایسے امور کو قائم کرنے کے لئے اس کے تیقن کی بنا پر ہے لہٰذا یہ کام فقیہ کے لئے ایک فریضہ اور تکلیف شرعی (واجب کفائی) ہے[۲]۔ اگرچہ آقائے خوئی نے اس مقام پر اسے ولایت سے تعبیر نہیں کیا ہے لیکن ولایت فقیہ کے سلسلہ میں جب ان سے استفتاء کیا گیا تو انہوں نے فقیہ کے لئے امور حسبیہ اور موقوفات وغیرہ میں اسے ثابت جانا ہے[۳]۔

نظریہ انتصاب اور اس کے محور امام خمینیؒ کی نظر میں

۱. حکومت ولائی اور مفہوم ولایت

امام خمینیؒ سلطنتی، وکالتی، بادشاہی، آمریت، جمہوریت وغیرہ جیسے مختلف حکومتوں سے ہٹ کر ولائی حکومت کے معتقد ہیں، یعنی وہ حکومت جو اپنا مقام و منصب خداوند عالم اور اس کے خاص نمائندوں کے ذریعہ حاصل کرتی ہے[۴]۔ اس نظریہ سے مکمل واقفیت کے لئے اس کے بنیادی مفاہیم سے آشنائی ضروری ہے:

۱. لفظ ولایت کا مادہ ولی ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کا کسی چیز سے اس طرح قریب ہونا کہ دونوں کے درمیان فاصلہ نہ رہ جائے۔ مثلاً جلس زید و یلیہ عمرو، زید بیٹھا اور عمرو بھی بلا فاصلہ

۱۔ جوان آراستہ، حسین، مبانی حکومت اسلامی، ص ۲۴۷

۲۔ معرفت، محمد ہادی، ولایت فقیہ، ص ۵۴

۳۔ مبانی حکومت اسلامی، ص ۲۴۸

۴۔ جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، ص ۲۱۰؛ ہادی تہرانی، مہدی، ولایت فقیہ، ص ۴۳

اس کے قریب بیٹھ گیا۔ دو چیز کا ایک دوسرے کے پہلو میں ہونے کا لازمہ قربت اور نزدیکی ہے۔قرآن کریم میں لفظ ولایت اور اس کے مشتقات تقریباً ۲۳۶ بار آئے ہیں[۱]۔

۲. اصطلاح میں لفظ ولایت مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن سبھی قربت، نزدیکی اور اتصال کے معنی میں مشترک ہیں۔ مثلاً محبت و دوستی، دنیا میں تکوینی اور معنوی تصرف و تسلط، نصرت ومدد، سرپرستی اور زعامت ۔

۳. جب لفظ فقیہ کے ساتھ لفظ ولایت کا استعمال ہوگا تو اس وقت ولایت فقیہ کا ایک ہی معنی ہوگا اور وہ سرپرستی، زعامت اور رہبری ہے۔

امام خمینیؒ کے آثار میں ولایت فقیہ کی اصطلاح مختلف صورتوں میں مذکورہ بالا معنی ہی میں استعمال ہوئی ہے مثلاً خلافت وجانشینی، مجریہ کی ذمہ داری، معاشرہ کے نظم ونسق کے لئے حکومت کی تشکیل، اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے جد وجہد، خلیفہ کا تعین، حکومت، ملک کا نظام چلانے کے فرائض، امارت، سرپرستی، وصایت، وراثت، حاکمیت، سلطنت، رہبر، حق تصرف، قیم، ملت، حکومتی اختیار وطاقت، ملکی انتظام کے لئے منصب الٰہی، ماموریت اور فرائض کی انجام دہی، تشکیل حکومت نبوت کی شان وشوکت کا ایک مظاہرہ وغیرہ[۲]۔

۴. نظریۂ انتصاب کے مطابق ولایت، معاشرہ کی سرپرستی ہے اور یہ مقام خدا سے مخصوص ہے۔ اس بنیاد پر کسی بھی انسان کو کسی دوسرے انسان پر ولایت اور حاکمیت کا حق نہیں ہے لیکن اگر موجودات کے اصلی مالک یعنی خدا کی طرف سے کسی کو مقام ولایت تفویض ہو تو صرف اس صورت میں اس کی ولایت اور حاکمیت درست (مشروع) ہوگی۔ جو حاکمیت خدا کی طرف سے نہ ہو اسے طاغوتیت کہا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حاکم اور عوام (ولی اور مولیٰ علیہم) کا رابطہ اور تعلق الٰہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ طاغوتی ہے[۳]۔

۱۔ مطہری، مرتضی، ولاء ہا و ولایت ہا، ص ۱۳
۲۔ خمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ
۳۔ خمینی، روح اللہ، شؤون واختیارات ولی فقیہ

۲. ولایت اعتباری اور ولایت تکوینی

ولایت فقیہ ایک عقلی اور اعتباری امر ہے۔ اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ کسی کی طرف سے وضع کردہ منصب ہے، جس طرح کسی چھوٹے بچے کے لئے کوئی سرپرست اور ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ قوم کی ذمہ داری اور بچہ کی ذمہ داری میں فریضہ اور حالات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

ولایت اعتباری[۱] کے مد مقابل ولایت تکوینی ہے جو ایک معنوی مقام ہے اور فریضۂ حکومت سے الگ شئے ہے۔ ولایت تکوینی مکمل الٰہی خلافت ہے اور ولی امر کے لئے عالم کا ذرہ ذرہ سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یہ معنوی رتبہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے مخصوص ہے، یہاں تک کہ بہت سے بڑے انبیاء اور جبرئیل بھی اس مرتبہ تک نہیں پہونچ سکتے۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہے حالانکہ نہ تو آپ حاکم ہیں نہ قاضی اور نہ ہی خلیفہ لہٰذا اگر یہ کہا جاتا ہے کہ فقیہ صاحب ولایت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رئیس، قاضی اور صاحب فتوی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ائمہ علیہم السلام کی طرح معنوی کمالات اور تکوینی ولایت کا حامل ہے[۲]۔

۳۔ سلسلہ مراتب ولایت

اس نظریہ کے مطابق خداوند عالم نے ولایت اور رہبری پہلے انبیاء پھر معصومینؑ اور غیبت کے زمانہ میں فقہائے عادل کو عطا کی ہے[۳]۔ اس نظریہ میں دین اسلام کو ولایت عطا کرنے والا، فقیہ کو منصب ولایت پر فائز ہونے والا اور عوام کو مولی علیہم کہتے ہیں۔

۱۔ اعتباری امور ان امور کو کہتے ہیں جو فرض اور معاہدہ کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں اور اسے وضع کرنے والے کی طرف دی نسبت دیتے ہیں، اگر وضع کرنے والا دین اور شارع ہو تو اسے اعتبار شرعی کہا جاتا ہے اور اگر وضع کرنے والے عوام ہیں تو اسے اعتبار عقلائی کہا جاتا ہے۔

۲۔ طباطبائی، سید محمد حسین، شیعہ در اسلام، ص ۱۷۷

۳۔ ایضاً، ص ۸۲

۴۔ اسلامی حکومت کی ضرورت

اس نظریہ کے مطابق ایک فقیہ عادل کے لئے حکومت کا قائم کرنا اور اسلامی حکومت کی تشکیل اگر ممکن ہو تو واجب عینی ہے ورنہ تمام فقہاء پر واجب کفائی ہے۔ یہاں تک کہ فقہاء کے لئے اگر یہ ممکن نہ ہو تو عادل مومنین پر یہ فریضہ عائد ہوگا کہ وہ جہاں سے دین حاصل کرتے ہیں وہیں سے ملک چلانے کا طریقہ بھی سیکھیں اور چنانچہ تشکیل حکومت ان کے بس میں نہ ہو تو ایسی صورت میں فقہاء اور مومنین امکانی حد تک سیاست اور حکومت سے مربوط امور میں حصہ لیں[۱]۔

۵۔ حصول ولایت

علم دین حاصل نہ کرنے والا شخص کبھی بھی ولایت کے مرتبہ پر فائز نہیں ہوسکتا ہے لیکن علم دین کی تحصیل کے بعد جب اس میں مجتہد کامل کے شرائط اور صفات پیدا ہو جائیں تو وہ خواہ نخواہ مقام ولایت پر پہونچ جائے گا، ایسی صورت میں انتخاب یا اختیار کی کوئی گنجایش نہیں ہوگی۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہاجائے کہ مجتہد جامع الشرائط خود بخود شارع مقدس کی طرف سے مقام ولایت پر فائز ہو جائے گا یعنی دینی معاشرہ پر ولایت وحکومت ایک فریضہ ہے کوئی امتیاز نہیں ہے اور واجب عینی یا واجب کفائی کے عنوان سے یہ فریضہ شرائط پائے جانے والوں پر عائد ہوچکا ہے[۲]۔

۶۔ انتصاب ولایت کی عمومیت

تمام جامع الشرائط فقہاء، شارع کی طرف سے مقام ولایت پر منصوب ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہاجائے کہ فقہاء کا انتصاب خاص نہیں بلکہ عام ہے یعنی اگر متعدد فقہاء ہیں تو سب کے سب مقام ولایت پر فائز ہوں گے۔

مقام ومنصب کے لئے صاحب عنوان کو معین کرنا نصب ہے اور یہ شرائط ولایت کے اعلان سے مختلف ہے۔ لفظوں کو بدل کر یوں کہاجائے کہ غیبت کے زمانہ میں علمی اور عملی شرائط کا حامل فقیہ امام معصوم (ع) کی طرف سے منصب افتاء، قضاوت اور معاشرہ کی حکومت پر فائز ہوچکا ہے اور تینوں شعبوں یعنی

---

۱ ۔ شیعہ در اسلام، ص ۵۳ و ۸۸؛ شؤون واختیارات ولی فقیہ، ص ۳۳؛ جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، ص ۱۳۶ و ۳۶۴ و ۳۹۱

۲ ۔ شؤون واختیارات ولی فقیہ، ص ۵۳؛ جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، ص ۲۵۲ و ۳۹۱

احکام شرعی (مقام فتویٰ)، عوام کے درمیان فیصلہ (مقام قضاوت) اور عوام کی ریاست وحکومت (مقام زعامت سیاسی) کے لئے وہ معصوم کا نائب ہے[۱]۔

۷۔ولایت بالفعل

اسلامی معاشرہ کی سرپرستی اور ولایت کے لئے فقیہ کا منصوب ہونا بالفعل ہوتا ہے نہ کہ بالقوہ یعنی اگر دسیوں فقیہ ہوں تو سب کے سب صاحب مقام ولایت ہوں گے اور جہاں تک انہیں طاقت حاصل ہو گی وہاں تک ان کے لئے اپنی ولایت کا استعمال کرنا ضروری ہوگا۔

یہ نظریہ، نظریہ انتخاب کے مد مقابل ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انتخاب سے پہلے تمام فقہاء میں ولایت کی صرف قابلیت اور صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ولی نہیں ہوتا ہے اور جب وہ عوام کی طرف سے رہبری کے لئے منتخب کر لئے جائیں گے، تب ان کی ولایت کا مظاہرہ ہوگا۔

اس بنا پر اگر کسی فرد میں مثلاً الف، ب اور ج شرائط اور خصوصیات موجود ہوں تو اس پر ولی کا عنوان صادق آئے گا، اب اگر متعدد افراد میں یہ خصوصیات پائے جائیں تو سب منصب ولایت کے حامل ہوں گے اور جب تک یہ شرائط باقی رہیں گے ان اشخاص کا یہ مقام ومنصب باقی رہے گا چاہے لوگ ان کی طرف رجوع کریں یا نہ کریں۔

ایسے منصب کو بالفعل کہتے ہیں اور اگر لوگ اسے قبول کرلیں تو صاحب مقام ولایت اپنی ولایت کو نافذ کرسکتا ہے۔ اگر لوگ کسی فقیہ کی ولایت کو قبول کرتے ہیں تو یہ معاشرہ میں ولایت کے خارجی تحقق کی شرط ہے نہ کہ مقام ولایت کے تحقق کی شرط جیسا کہ حضرت علیؑ ۲۵ سال تک خانہ نشین رہے لیکن اس کے باوجود اپنے زمانہ کے حاکم اور ولی بھی تھے مگر چوں کے لوگوں نے حمایت نہیں کی تھی اس وجہ سے آپ اپنی ولایت کے نفاذ پر قادر نہیں تھے۔ امام خمینی فرماتے ہیں:

> "اجتماعی یا انفرادی طور پر فقہاء پر لازم ہے کہ حدود کو جاری کریں اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے شرعی نظام حکومت قائم کریں۔ اگر کسی کے لئے یہ بات ممکن ہو تو اس پر

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، ص ۴۵-۵۱؛ شئون واختیارات ولی فقیہ، ص ۶۱ و ۱۰۹-۱۱۴؛

واجب عینی ہے اور اگر ممکن نہ ہو تو واجب کفائی ہے۔ اگر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی ولایت ساقط نہیں ہوگی کیوں کہ وہ لوگ خدا کی طرف سے منصوب ہیں، اگر ہوسکے تو ٹیکس، زکوۃ، خمس اور خراج حاصل کریں اور اسے مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کریں اور حدود جاری کریں۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر ہم حکومت تشکیل نہیں دے سکتے تو بیٹھے رہیں بلکہ ان تمام امور جن کی مسلمانوں کی ضرورت ہے اور اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہیں، اسے جتنا ہوسکے انجام دینا چاہئے"[۱]۔

۸۔ فقہاء کی دوسرے فقہاء پر ولایت

فقہاء ایک دوسرے پر ولایت نہیں رکھتے کیوں کہ تمام کے تمام فقہاء مقام ولایت پر فائز ہیں۔ امام خمینیؒ تحریر فرماتے ہیں:

" فقہاء ولی مطلق نہیں ہیں یعنی وہ اپنے زمانہ کے دوسرے تمام فقہاء پر ولایت رکھتے ہوں اور انہیں منصوب یا معزول کرسکیں۔ اس لحاظ سے ان میں مراتب ودرجات نہیں ہیں کہ ایک کا مرتبہ بلند ہو اور دوسرے کا کمتر، ایک ولی ہو تو دوسرا اس سے بڑا ولی ہو"[۲]۔

چونکہ فقہاء ایک دوسرے پر ولایت نہیں رکھتے اس بناپر وہ ایک دوسرے کے حلقہ حاکمیت میں دخل اندازی نہیں کرسکتے کیوں کہ تمام فقہاء نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ اولاً اگر ایک ولی نے کسی جگہ کوئی حکم صادر کردیا ہے تو اس علاقہ کے ان تمام فقہاء پر جو خود بھی مقام ولایت کے حامل ہیں اس حکم کی اطاعت واجب ہے۔

ثانیاً اگر کسی فقیہ نے ولائی امور کے کسی ایک حصہ کو اپنے ذمہ لے لیا ہے تو دوسرے فقہا کی اس میں دخل اندازی جائز نہیں ہے اور اس طرح بے نظمی اور ایک دوسرے کے امور میں تداخل کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا[۳]۔

آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای فرماتے ہیں:

۱۔ خمینی، روح اللہ، صحیفۂ نور، ج۱۹، ص ۴۰۳

۲۔ خمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ، ص ۵۳

۳۔ شؤون واختیارات ولی فقیہ، ص ۱۱۔۱۱۴؛ ہادوی تہرانی، مہدی، ولایت فقیہ، ص ۱۱۷

"شیعہ مذہب کے نقطہ نظر سے تمام مسلمانوں کو ولی فقیہ کے ولائی امر کی اطاعت کرنی چاہئے اور اس کے امر ونہی کو تسلیم کرنا چاہئے، یہ حکم فقہائے عظام کے لئے بھی ہے چہ جائیکہ ان کے مقلدین۔ میری نظر میں ولایت فقیہ کا التزام، اسلام اور ولایت معصومینؑ کے التزام سے جدا نہیں ہے"[1]۔

۹۔ تعین حکام کا طریقہ

قیادت اور ملک کے نظم ونسق کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں سے حاکم کا انتخاب کیا جاسکتا ہے البتہ اس کا مطلب کسی کو مقام ولایت پر نصب کرنا نہیں ہے:

اِ. ایک فقیہ حکومت حاصل کرنے اور رہبری کے فرائض ادا کرنے کے لئے دوسرے فقہا پر سبقت لے جائے اور اس سلسلہ میں عملی اقدام کرے، جیسے امام خمینی نے انقلاب کی رہبری کی اور ایران میں اسلامی حکومت قائم کی۔

ب. عوام کی اکثریت کے درمیان کوئی فقیہ علم، تدبیر اور رہبری کی دیگر خصوصیت کے لحاظ سے مقبول ہو جائے (ایک شخص کو عمومی مقبولیت حاصل ہو) (آئین، دفعہ ۱۰۷)

ج. مجلس خبرگان رہبری کسی فقیہ کو انتخاب کرکے عوام کے سامنے پیش کرے، جس طرح امام خمینی کی وفات کے بعد مجلس خبرگان نے آیت اللہ العظمی خامنہ ای کا تعارف کرایا۔

۱۰۔ مجلس خبرگان رہبری کا کردار

غیبت کبریٰ کے زمانہ میں عوام کے سامنے حاکم اسلامی اور محافظ دین کو پیش کرنے میں مجلس خبرگان رہبری کا اہم کردار ہے۔ اسی وجہ سے اس مجلس کی رکنیت کے لئے فقاہت اور اسلام شناسی میں ماہر ہونا ضروری ہے۔

آئین میں مجلس خبرگان کی ساخت اور اس کا کام معین ہے تاکہ مختلف ادوار میں وہ قابل قبول ہو۔ یہ غیر مستقیم شیوہ انتخاب ہے یعنی مجلس خبرگان رہبری میں عوام کے ذریعہ منتخب فقہا ایک دوسرے سے صلاح ومشورہ کے بعد دسیوں ولی فقیہ میں سے ایک ولی فقیہ کی شناخت کرکے اسے عوام سے متعارف

۱۔ خامنہ ای، سید علی، رسالہ اجوبۃ الاستفتائات، ص ۱۳

کراتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خبرگان رہبری منتخب ولی فقیہ کو منصب ولایت پر فائز کررہا ہے کیونکہ خبرگان رہبری کے ذریعہ قیادت کے لئے منتخب ہونے سے قبل بھی وہ فقیہ ولایت کے منصب پر فائز تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ رہبر کی مشروعیت اور جواز، عوامی نہیں بلکہ الٰہی ہے[1]۔

۱۱۔ آزادی ولایت

امور کو انجام دینے اور طاقت کے استعمال کے لئے ولی کو کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اسے معصومؑ کی طرف سے اجازت حاصل ہے اور وہ معصومؑ ہی کی طرف سے منصوب ہے لیکن یہ بات بھی واضح رہے کہ مذکورہ بالا بنیاد پر مشورہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ ماہرین سے رجوع اور مشورہ کے بعد آخری فیصلہ کا حق ولی فقیہ کو حاصل ہے[2]۔ " وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ "[3]

۱۲۔ استمرار ولایت

ولایت وحکومت کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ دائمی ہے اور جب تک ولی فقیہ میں لازمی شرطیں موجود ہیں وہ اپنے منصب پر باقی رہے گا۔ اس سلسلہ میں امام خمینیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> " حکومت اور قضاوت کے لئے علمائے اسلام امام علیہ السلام کی طرف سے منصوب ہیں اور یہ منصب ان کے لئے ہمیشہ محفوظ ہے[4]۔"

۱۳۔ ولایت کے شرائط اور صفات

ولی فقیہ کے لئے ضروری شرطیں:

۱. فقاہت: قوانین اسلام سے اجتہادی واقفیت

۲. عدالت: واجبات کے انجام، محرمات کے ترک اور دینی موازین کی رعایت کا ملکہ اور تقویٰ

۳. تدبیر: مدبرانہ صلاحیت وقابلیت، کام کا سلیقہ، شجاعت، دنیا کے حالات سے واقفیت اور سیاسی

۱۔ فرامرز، قراملکی، احد، چھار گفتار در مبانی فقھی وکلامی ولایت فقیہ، ص ۲۲؛ ہادوی تہرانی، مہدی، ولایت فقیہ، ص ۱۱۷

۲۔ جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، ص ۱۳۶

۳۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹

۴۔ خمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ، ص ۵۳-۹۴

واجتماعی بصیرت [۱]۔

پہلی دو شرطیں (علم وعدالت) مقام ولایت کے ثبوت کے لئے کافی ہیں لیکن معاشرہ کے امور کی دیکھ بھال کے لئے تیسری شرط بھی ضروری ہے۔

۱۴۔ ولایت فقیہ اور خطا سے اجتناب

اگر ایک فقیہ جھوٹ بولے یا نا محرم پر نگاہ ڈالے یا کسی جگہ ڈکٹیٹر بن جائے تو امام خمینیؒ کی نظر میں یہ باتیں اس سے منصب ولایت چھین لیتی ہیں [۲]۔ اس سلسلہ میں دو نکتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے:

۱. امام خمینیؒ کے مذکورہ بالا بیان میں خطا سے مراد گناہ ہے ورنہ صرف غلطی سے مقام ولایت سلب نہیں ہو سکتا ہے کیوں کہ ولایت فقہاء کے لئے عصمت شرط نہیں ہے۔

۲. امام خمینی کی نظر میں رہبری کی یہ صفت بڑی اہمیت کی حامل ہے چونکہ رہبری انسان کی سرنوشت اور عوام کی جان ومال سے متعلق ہے اس وجہ سے معظم لہ اسے معصوم کے نقش قدم پر چلنے کا پابند سمجھتے ہیں۔

۱۵۔ حکومت ولائی میں عوام کا کردار

ولایت کی ایک اہم بنیاد (چاہے وہ پیغمبرؐ کی ولایت ہو یا آپ کے معصوم جانشینوں کی) عوام کی جانب سے اس کی مقبولیت ہے۔ حکومت ولائی میں بھی دوسری حکومتوں کی طرح تین ارکان (قانون، قانون کو نافذ کرنے والے اور عوام کی حمایت) پائے جاتے ہیں۔ حکومت اسلامی کا تحقق اور استمرار، انتخاب اور مسلمانوں کی اکثریت کی پشت پناہی پر مبنی ہے۔ اس حکومت کے دوسرے دو رکن خدا کی طرف سے معین ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ حکومت ولائی کی مشروعیت خدا کی جانب سے اور مقبولیت عوام کی طرف سے ہوا کرتی ہے۔

رہبر کے ذریعہ ولایت الٰہی کے تحقق کی شرط عوامی مقبولیت ہے۔ یہ اصل ولایت کی تعریف کا جزء نہیں ہے بلکہ ولایت کے وجود اور حصول کی شرط ہے۔ کچھ علماء نے امام خمینیؒ سے پوچھا کہ معاشرہ پر فقیہ کی

۱۔ خمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ، ص ۴۷

۲۔ خمینی، روح اللہ، صحیفۂ نور، ج۱۰، ص ۲۷ ــ ۱۱۴ و ج۱۱، ص ۴۶۵

ولایت کس صورت میں ہوتی ہے ؟ آپ نے جواب دیا کہ ہر صورت میں اس کی ولایت ہوتی ہے لیکن مسلمانوں کے امور کی ذمہ داری اور حکومت کی تشکیل اکثریت کی رائے سے متعلق ہے اور یہ بات ایران کے آئین میں بھی مذکور ہے۔ صدر اسلام میں بھی ولی مسلمین کی بیعت موجود تھی۔

ولایت کا ایک جزء امور میں تصرف ہے اور شیعہ ترقی یافتہ نظریہ کے مطابق یہ زبردستی کی چیز نہیں ہے لہٰذا ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے۔ شیعوں کی قابل فخر تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کسی امام معصوم نے عوامی مقبولیت کے بغیر اپنی ولایت کو کسی کے اوپر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔

امام خمینیؒ نے عوامی مقبولیت کے مسئلہ پر تاکید کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی حقیقت پر آپ کی بڑی گہری نظر تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کسی فقیہ نے کسی وقت ڈکٹیٹر والا رویہ اختیار کیا تو اس کی ولایت ختم ہو جائے گی۔ آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"سلطنتی حکومت کے ختم ہونے کے بعد اس وقت میری رائے کے مطابق جمہوری اسلامی حکومت ہے لیکن اس حکومت کی تشکیل عوام کی رائے سے ہونی چاہئے۔ ایسی حکومت کی تشکیل کے لئے ہم لوگوں کی رائے معلوم کریں گے۔ اب وہ جمہوری اسلامی کو چاہیں یا شہنشاہی حکومت، یہ ان کے اختیار میں ہے[۱]۔"

نظام کے مؤثر طریقہ سے نافذ ہونے میں عوام کا اہم کردار ہے۔ اجتماعی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی میدانوں میں عوام جتنا کام کریں گے، ولائی حکومت اتنی ہی بہتر اور کامیاب ہوگی۔ عوام اسلامی نظام کے مضبوط بازو اور محرک طاقت ہیں۔ اگر مسلمان عوام عملی طور پر حمایت نہیں کریں گے تو اسلامی حکومت کی تشکیل نہیں ہو سکے گی۔ معصومینؑ کے زمانہ میں عام طور پر ان کی حکومت نہیں تھی۔

۱۶۔ ارکان حکومت کی مشروعیت

حکومت کے تمام اجزاء اور ارکان کی مشروعیت ولی فقیہ کی بنا پر ہے۔ امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

"اگر فقیہ نہ ہو تو طاغوت ہے، یا خدا ہے یا طاغوت ہے۔ اگر خدا کے حکم سے نہ ہو، صدر مملکت اگر فقیہ کے ذریعہ منصوب نہ ہو تو وہ نامشروع ہے۔ نامشروع ہے تو وہ طاغوت ہے، اس

۱۔ صحیفۂ نور، ج ۶، ص ۱۵۳

کی اطاعت طاغوت کی اطاعت ہوگی۔ طاغوت اس وقت ختم ہوگا جب خدا کے حکم سے کوئی شخص نصب کر دیا جائے۔ ولایت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے مجلس خبرگان رہبری نے ایجاد کی ہو، اسے خدا نے بنایا ہے"۔

امام خمینیؒ نے صدر مملکت کو ہمیشہ منصوب کیا تھا۔ مثلاً بنی صدر کی صدارت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ فقیہ جامع الشرائط کے منصوب کرنے سے اس عہدہ کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اس وجہ سے میں اس حکم کے بموجب ملت کی رائے کو نافذ کرتے ہوئے انہیں اس عہدہ پر معین کرتا ہوں[۱]۔

۱۷۔ حاکم اسلامی کے اختیارات

رہبر کو اختیار "مطلق" حاصل ہے۔ آئین کی دفعہ نمبر ۵۷ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ مطلق کا مطلب اختیارات کی وسعت ہے، عمل کی کیفیت اور طریقہ مراد نہیں ہے یعنی احکام اسلامی کے نفاذ اور معاشرہ اور حکومت کے نظم و نسق کے لئے ائمہ اور دوسرے رہنماؤں کی طرح اس کے اختیارات وسیع ہیں لیکن ظالمانہ حکومت کی طرح نہیں کہ حاکم کا جو دل چاہتا ہے وہ وہی کرتا ہے اور اپنے اختیارات کو اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرتا ہے۔

تقریباً تمام شیعہ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دو چیزوں میں ولی فقیہ کو ولایت حاصل ہے ایک افتاء اور دوسرے قضاوت ۔ عوام کے امور میں حق تصرف کے معنی میں جو ولایت ہے اس کے تین حصے ہیں:

۱. امور حسبیہ میں ولایت: امور حسبیہ وہ امور ہیں جن کا تعطل شارع مقدس کسی بھی صورت میں نہیں چاہتا ہے بلکہ بغیر کسی قید کے اسے جلد سے جلد انجام دینے پر تاکید کرتا ہے۔ اگر ان امور میں کوئی خاص ذمہ دار موجود ہے تو یہ امور اسی کے ذریعہ انجام پائیں گے، مثلاً باپ اور دادا اپنی اولاد کے ولی ہیں تو وہ ان کے مسائل کی دیکھ بھال کریں اور اگر کوئی مخصوص ذمہ دار نہیں ہے تو ایسی صورت میں ولی فقیہ ان امور کو انجام دے۔

امور حسبیہ زکوۃ و خمس کی وصولی ، عملی طور پر نہی عن المنکر، حدود و تعزیرات کا جاری کرنا ، قضاوت، دیوانہ اور صغیر کی سرپرستی (صغیر ایسا بچہ ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو)، کم عقل اور سفیہ کی

۱۔ صحیفۂ نور ج ۱۰، ص ۲۲۱- ۳۰۸؛ نیکنام و ہلالی، احمد و محمد رضا، دولت عدالت، ص ۱۷۸

سرپرستی، بیت المال، یتیموں کے مال، میت سے متعلق امور، نان ونفقہ نہ دینے والے شوہر کی طرف سے طلاق جاری کرنا، غائب افراد کے مال کو ضائع ہونے سے بچانا وغیرہ تک محدود ہے۔

۲. مسلمانوں کے تمام عام امور میں ولایت: اس کا مطلب حکومت کی تشکیل اور عوام کے سیاسی اور اجتماعی امور کی نظم و نسق اور اس سے بڑھ کر عوام کے جان ومال پر ولایت ہے البتہ اس صورت میں جب ان پر حکومت کرنے کا تقاضا یہ ہو کہ ان کے نفوس اور اموال میں تصرف کیا جائے۔ جن امور کو انجام دینے کے لئے میں عرفاً اور عقلاً حاکم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، ان تمام امور میں ولی فقیہ کو ولایت حاصل ہے۔

یعنی ولی فقیہ معاشرہ کے عام مسائل کے علاوہ عوام کے جان ومال پر بھی ولایت رکھتا ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ معاشرہ کی کلی اور عام مصلحت اسی میں ہو۔

۳. معاشرہ کے عام امور پر ولایت کے علاوہ جان ومال پر بھی بغیر کسی قید و شرط کے اور مطلق ولایت حاصل ہو۔شیعہ فقہا کی نظر میں اس طرح کی ولایت صرف پیغمبر اسلام(ص) اور ائمہ معصومین(ع) کو حاصل ہے۔

تمام فقہاء کا اتفاق نظر ہے کہ فقیہ کو امور حسبیہ میں ولایت حاصل ہے۔ بحث اور اختلاف نظر ولایت کے دوسرے قسم کے سلسلہ میں ہے۔ شیخ مرتضیٰ انصاری کا خیال ہے کہ فقیہ کے لئے ولایت کے پہلے قسم میں مقید و محدود اختیارات واضح اور ثابت ہیں لیکن اس سے وسیع تر اختیارات یعنی ولایت کے دوسرے قسم کا اثبات مشکل ہے۔

لیکن فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور نظریہ ولایت کے دوسرے قسم کو ثابت کرتا ہے۔ (یعنی مطلق اور وسیع اختیارات) امام خمینیؒ نے سب سے زیادہ اس نظریہ کی تشریح کی ہے اور ولایت کی دوسری قسم (ولایت مطلقہ) کے لئے حاکم کے اختیارات کی حدیں بڑے یقینی انداز سے ثابت کی ہیں۔ آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے اپنی صدارت کے دور میں (تاریخ ۱۶/ ۱۰/ ۱۳۶۶) اختیارات ولایت فقیہ کے سلسلہ میں امام خمینیؒ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

"اگر حکومت کے اختیارات احکام فرعیہ کے دائرہ میں ہوں تو الٰہی حکومت اور نبی اکرم(ص) کو دی جانے والی ولایت مطلقہ ایک بے معنی اور بے مفہوم شئے ہوگی۔ حکومت رسول اکرم(ص) کی

ولایت مطلقہ کا ایک حصہ ہے جو اسلام کے احکام اولیہ میں شامل ہے اور تمام فرعی احکام حتی کہ نماز، روزہ اور حج پر مقدم ہے۔ اگر کوئی مسجد یا گھر راستہ میں آرہا ہو تو حاکم اسے توڑ کر اس کی قیمت اس کے مالک کو دے سکتا ہے، اگر ضروری ہو تو حاکم مسجد کو بند کر سکتا ہے اور اگر کوئی مسجد، مسجد ضرار بن جائے اور اسے توڑے بغیر چارہ نہ ہو تو حاکم اسے توڑ سکتا ہے[۱]۔"

خلاصہ یہ کہ ولایت مطلقہ کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کے نظم ونسق کے لئے رہبر، معصومین(ع) والے اختیارات کا مالک ہے اور جو مطلقہ کی قید لگائی جاتی ہے وہ ان نظریات کے مقابل میں ہے جس میں حاکم کے اختیارات کو امور حسبیہ، آئین اور فروعی احکام میں محدود کر دیا گیا ہے لہٰذا ولی فقیہ کے اختیارات امور حسبیہ، آئین اور احکام فرعیہ سے بالاتر ہے[۲]۔

مطلقہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے۔ ولایت کے اختیارات کا استعمال دین کے ضوابط اور مقاصد کے لئے ہے۔ ولایت کے اختیارات کو رہبر جب استعمال کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

۱. پہلی صورت: مباح امور کی ہے، یہاں واجب اور حرام کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مستحب اور مکروہ جیسے مسائل ہیں اور اس کا معیار "مصلحت" ہوگا یعنی اگر اس میں عام لوگوں کے لئے کوئی فائدہ ہے تو فقیہ معاشرہ کی مصلحت کی خاطر حکم صادر کرے گا چاہے وہ ذاتی امور میں کیوں نہ ہو۔

۲. دوسری صورت: اس میں واجب یا حرام امور شامل ہیں۔ ایسی صورت میں ولی فقیہ قاعدۂ تزاحم کی بنیاد پر اپنی ولایت کا استعمال کرتا ہے۔ تزاحم یعنی جب دو شرعی حکم ایسے ہوں کہ ایک ساتھ ان دونوں پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو ولی فقیہ ان دونوں میں سے زیادہ اہم حکم کا انتخاب کرے گا اور دوسرے حکم کو اس پر قربان کردے گا۔

۳. تیسری صورت: اس میں دینی مقاصد آتے ہیں، مثلاً اسلام اقتصادی، سیاسی، تربیتی، اجتماعی وغیرہ میدانوں میں اپنا لائحۂ عمل پیش کرتا ہے اور رہبر کا فریضہ ہے کہ وہ ان تعلیمات کو معاشرہ میں نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رہبر کوئی حکم صادر کرتا ہے تو اس میں

۱۔ صحیفۂ نور، ج ۲۰، ص ۴۵۱

۲۔ مصباحی مقدم، غلام رضا، چہار گفتار در مبانی فقہی وکلامی ولایت فقیہ، ص ۲۷

عام مصلحت، تزاحم احکام اور دینی مقاصد کو عملی شکل دینے جیسی کوئی نہ کوئی صورت موجود رہتی ہے اور ولایت فقیہ کے مطلقہ ہونے کا مطلب ہر گز بے ضابطگی نہیں ہے[۱]۔

امام خمینیؒ کے نظریہ کے مطابق مندرجہ ذیل امور ولایت مطلقہ کے دائرہ کار سے باہر ہیں:

جہاد ابتدائی، لوگوں کے ذاتی امور (جب تک عام مصلحت سے ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو) ، امام معصومؑ کی غیبت میں واجب عینی کی شکل میں عید قربان اور عید فطر کی نماز باجماعت کا قیام اور دوسرے فقہاء پر ولایت[۲]۔

البتہ جہاد ابتدائی کے سلسلہ میں آیت اللہ العظمی سید علی خامنہ ای کا الگ نظریہ ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ مصلحت کی بنا پر ولایت امر مسلمین کی ذمہ داری سنبھالنے والے فقیہ جامع الشرائط سے جہاد ابتدائی کے حکم کے صدور کا جواز بعید نہیں ہے بلکہ یہ اقوی ہے[۳]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی جہاد ابتدائی کو مطلقاً نہیں بلکہ مصلحت کی صورت میں جائز سمجھتے ہیں۔

خاتمہ میں یہ کہنا مفید ہے کہ اگرچہ نظریہ انتصاب کی پیروی کرنے والے فقہاء مسئلہ "ولایت" اور مسئلہ "نصب" کے سلسلہ میں متفق ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاکم اسلامی کے اختیارات کے سلسلہ میں دوسرے علماء امام خمینیؒ جیسے نظریہ کے حامل نہیں ہیں۔

منابع وماخذ

- قرآن کریم
- نہج البلاغہ
- امام خمینی، روح اللہ، ولایت فقیہ، موسسۂ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۹
- شؤون واختیارات ولی فقیہ، وزارت ارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۶۵
- صحیفۂ نور، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۹

---

۱. معرفت، محمد ہادی، ولایت فقیہ، ص ۱۲۸

۲. ولایت فقیہ، ص ۵۳؛ تحریر الوسیلہ ج۱، ص ۴۴۳، ۲۱۸؛ شؤون واختیارات ولی فقیہ، ص ۲۶، جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، ص ۲۵۰۔۴۶۴

۳. خامنہ ای، سید علی، رسالہ اجوبۃ الاستفتائات، ص ۲۲۷

- تحریر الوسیلہ، مؤسسہ نشر اسلامی، قم، ۱۳۶۳
- خامنہ ای، سید علی، رسالہ اجوبۃ الاستفتاءات، مؤسسہ فرہنگی ثقلین، تہران، ۱۳۷۶
- مطہری، مرتضیٰ، ولاء ھا و ولایت ھا، انتشارات صدرا، تہران ،۱۳۷۷
- طباطبائی، سید محمد حسین، شیعہ در اسلام، انتشارات رسالت، قم
- جوادی آملی، عبداللہ، ولایت فقیہ، مرکز نشر اسراء، قم، ۱۳۸۱
- مصباحی مقدم، غلام رضا، چہار گفتار در مبانی فقہی وکلامی ولایت فقیہ، مرکز اسلامی امور مساجد، تہران، ۱۳۷۷
- فرامزر ،قرا ملکی، احد، چھار گفتار در مبانی فقہی وکلامی ولایت فقیہ ، مرکز رسیدگی بہ امور مساجد، تہران، ۱۳۷۷
- صدر حسینی، سید علی رضا، مجلّہ علوم سیاسی، شمارہ ۲۵۵، سال ہفتم، مؤسسہ آموزش عالی باقر العلوم، بھار ۱۳۸۳
- نیکنام وہلامی، احمد و محمد رضا، دولت عدالت
- قانون اساسی جمہوری اسلامی ایران ، وزارت ارشاد اسلامی، ۱۳۶۸
- منتظری، حسین علی، دراسات فی ولایۃ الفقیہ وفقہ الدولہ الاسلامیہ، المرکز العالمی للدراسات اسلامیہ، قم، ۱۴۰۸
- جوان آراستہ، حسین، مبانی حکومت اسلامی، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۲
- کدیور، محسن، نظریہ ہای دولت در فقہ شیعہ، نشرنی، تہران، ۱۳۷۸
- رشاد، علی اکبر، دموکراسی قدسی، مؤسسہ فرہنگی دانش واندیشہ معاصر، تہران، ۱۳۸۲

روحانیت و معنویت، دور حاضر کی مشترکہ ضرورت

مؤلف: ڈاکٹر محسن قمی
مترجم: مولانا احمد رضا رضوی زرارہ

قدیم الایام سے ایران اور ہندوستان دنیا کے دو متمدن مرکز رہے ہیں اور دونوں ملکوں نے معماری اور ثقافت کے میدان میں پوری دنیا پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ ہماری آج کی گفتگو بھی شاید اسی گذشتہ سنت سے مرتبط ہے۔ جو چیز اس کوشش کو دوبرابر کر دیتی ہے وہ دونوں ملکوں کی ثقافت کی تخلیقی صلاحیت ہے۔ اپنی تمام تر قوی اور ثقافتی خوبیوں کے ساتھ ہندوستان اور اسلام کی عالمی ثقافت کی نمائندگی کرنے والا ملک ایران ہمارا خاص موضوع ہے۔

کسی بھی مسئلہ پر گفتگو کا پہلا زینہ ان اشیاء کی تلاش ہے جو مشترک ہوتی ہیں اور تمام ادیان کے درمیان واضح ترین وجہ مشترک معنویت ہے۔ معنویت انسان کی گمشدہ میراث ہے جو کسی خاص زمان یا مکان تک محدود نہیں ہے۔ معنویت اور اس کی طرف رغبت اگرچہ انسان کی فطری ضرورت ہے مگر دور حاضر کا انسان آج ان حالات میں زندگی گذار رہا ہے کہ ہر دور سے زیادہ اس وقت اسے اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ:

۱۔ مادہ پرست افکار نے اپنے غلط احساسات کی بناء پر کیسے اور کس طرح زندگی گذاری جائے کے مسئلے کے لئے آج ایک بڑا چیلنج کھڑا کر دیا ہے۔ انہیں میں سے ایک خود کشی کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ بالخصوص جوانوں اور دانشوروں کے درمیان جو جسمانی اعتبار سے بالکل صحیح و سالم تھے اور مالی اعتبار سے خوشحال اور اپنے تعلیمی عمل میں کامیاب تھے مگر خود کشی کے اپنے اقدام کو وہ ایک جملے میں خلاصۃً اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہمارے لئے زندگی یعنی کچھ بھی نہیں۔

اسی بناء پر ۲۰۰۰ میں عالمی تنظیم یونیسف نے بچوں کی تربیت کے لئے عالمی اعتبار سے عقل و جذبات کے علاوہ معنوی تربیت کو بھی شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر کی کلینک اور نفسیاتی ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ

معنوی کلینک یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں قائم کیا ہے تاکہ وہ بیمار جو جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے تو ٹھیک ہیں مگر ایک سوال جو ان کے ذہن کو خراب کر رہا ہے کہ کس طرح زندگی گذاری جائے اس کا علاج کر سکیں۔

۲۔ اس دور کے انسان کے احساس تنہائی نے اسے اور بھی تنہا کر دیا ہے اور فیملی کے ساتھ نیز دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ زندگی گذارنے کے معنی اور مفہوم کو بھی اس احساس تنہائی نے ختم کر دیا ہے اس لئے کہ نہ تو دوسرے اسے پہچانتے ہیں، نہ اس کے درد و غم کو درک کرتے ہیں اگر درد و غم کو سمجھتے بھی ہیں تو اس کا مداوا نہیں کر سکتے، اگر مدد کر بھی سکتے تو اس مدد کے ذریعہ وہ خود اپنی مدد کرتے ہیں نہ کہ دوسروں کی۔ جدید ٹیکنالوجی کی ترقی اور پیشرفت نے اگرچہ زمان و مکان کے فاصلوں کو ختم کر دیا ہے مگر دلوں کی دوری میں حیرت انگیز طریقہ سے اضافہ ہوا ہے۔

۳۔ اضطراب اور ناامنی کی بناء پر اور بالخصوص پر تشدد اقدامات اور دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے قدم نیز کمیت و کیفیت کے اعتبار سے ان اسلحوں کی افزائش جو بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کے موجب ہوتے ہیں عموماً یہ مہلک اسلحے ان افراد اور ظالم و جابر حکمرانوں کے پاس ہیں جن کی نگاہ میں انسانی اقدار کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

بہر حال بشریت موجودہ حالات اور مختلف مسائل جیسے متعدی بیماریاں، آب و ہوا کی تبدیلی، خوراک کی قلّت، غیر متوقع حادثات وغیرہ سے دوچار ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود ان سب سے زیادہ جو دردناک چیز ہے وہ ہے معنویت کا نہ ہونا۔

اسی بناء پر بعض سماجی علوم کے ماہرین جیسے ماکس وبر نے صراحت کے ساتھ اس بات کو لکھا ہے کہ معنویت سرے سے غفلت کا شکار ہو چکی ہے اور جدیدیت نے تمام اسرار کو کھول دیا ہے لیکن یہ ناقابل انکار حقائق اور دور حاضر کے انسان کی غیب و معنویت میں یقین میں افزائش اس بات کا سبب ہوئی کہ مفکرین معنویت کی کمی اور دنیا پرستی اور سیکولرزم کے بجائے اس طرح بات کریں اگرچہ عوامی رائے یہ تھی کہ سیاست، ثقافت و معاشرہ دھیرے دھیرے معنویت سے خالی ہو جائے گا یہاں تک کہ انسان کی انفرادی زندگی بھی ان تعلیمات کو خدا حافظ کہہ دے گی لیکن بیسویں صدی ہجری کی آخری دہائیوں میں مذہب کی ترقی سبب ہوئی کہ عالم غیب پر یقین کو انسانی دنیا کی ضرورت کے طور پر جانا جائے۔ اس چیز نے اتنی زیادہ

ترقی کی کہ معنویت پر ایمان کے ساتھ ساتھ جعلی اور کاذب عرفان نے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کردیئے۔
معنویت عالم باطن اور حقیقت وجود کی مختلف اقسام و اجزاء کے معنی میں بھی ہے۔ ہم یہاں چند قسم اور اجزاء کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

جزو اول: عالم ہستی عالم مادہ سے آگے ہے اور ماوراء طبیعت (آخرت) اور اس دنیا کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع ہے۔ البتہ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فاصلہ ہے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کی ہر مخلوق کے دو چہرے ہیں، ایک ظاہری اور دوسرا معنوی (باطنی) اور اسلامی لٹریچر کے اعتبار سے تمام آسمان و زمین غیبی پہلو اور اسرار آمیز ہیں۔ (ولله غيب السموات والارض) اور اپنے ظاہر کے علاوہ کی حکایت کررہے ہیں اور یہ تمام عالم الفاظ و کلمات کی طرح ہیں کہ ظاہر کو دیکھ کر باطن تک پہنچیں۔ اسی وجہ سے اسلامی تعبیر کے اعتبار سے اس دنیا کو نشانی اور علامت کا نام دیا گیا ہے اور اسلام تمام موجودات عالم کے لئے دین رحمت ہے۔ (وما ارسلناك الا رحمة للعالمين)۔

جزو دوم: حقیقت عالم تمام تر نظم و انضباط کے باوجود اپنے اندر لچک رکھتا ہے اور اس کا اس دنیائے مادی سے کسی قسم کا کوئی تضاد بھی نہیں ہے اور ہر وجود اپنے اصل مرکز کی طرف گامزن ہے تو پھر انسان کو چاہئے کہ حقیقت وجود اور مادی زندگی سے پردہ اٹھائے اور حقیقی زندگی کے راستوں کو تلاش کرے اور اپنے اعمال کے ذریعہ حقیقی زندگی کو اپنالے اور ان راہوں کو صرف اپنے لئے نہیں بلکہ کل وجود کے لئے کشف کرے اس لئے کہ معنویت کشف کرنے کا نام ہے ایجاد کرنے کا نہیں۔

جزو سوم: انسان دو پہلو کا حامل ہے۔ ایک بدن اور دوسرے روح اور حقیقت وجود انسان روح ہے لہٰذا معنویت یہ ہے کہ انسان کا بدن روح سے وابستہ ہو کر خود کو حقیقی جامہ سے آراستہ کرے یعنی روح و بدن ایک ہوجائے۔

جزو چہارم: وجود انسان کا اصل حصہ یعنی روح باطنی طور پر اور درحقیقت اس جہان سے وابستہ ہے اسی لئے ذاتی تقدس کے ساتھ ساتھ اسے فنا نہیں ہے اور انسان درست عقائد اور صحیح رجحانات کے ذریعہ اس مادی دنیا سے اٹھ کر حقیقی دنیا کی طرف کوچ کرسکتا ہے۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ ویدائی مذہب اور اسلام اپنے بعض اصولی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بناء پر معنویت سے سرشار ہیں اور مناسب بات چیت کے ذریعہ نسل انسانی کے لئے بہت سی مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔

قرآنی تعلیمات اصل وجود کو ایک مقدس امر مانتی ہے جس کا سایہ تمام موجودات پر پھیلا ہوا ہے (هو الاول والآخر والظاهر والباطن)اور تمام موجودات عالم تسبیح و تحلیل میں مشغول ہیں (يسبح لله ما في السموات والارض)اور ہر چیز ایک راستہ پر ایک ساتھ ایک بنائے ہوئے نظام کی طرف گامزن ہے، اسی بناء پر ہم معاشرہ میں جو ماحولیاتی تحفظ یا حیوانات کے حقوق کی رعایت دیکھتے ہیں وہ صرف بقائے حیات کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک وظیفہ دینی ہے مخلوقات کے لئے کہ جس کی تجلی ذات خدا ہے۔

انسان اس راہ میں خصوصی صلاحیت کا مالک ہے اور خدا نے اسے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے (خلقته بيدى)۔وہ روح الٰہی کا حامل زمین پر اس کا جانشین اور اس عالم کا امین ہےاور آخر میں زمین پر خدا کا وارث قرار پائے گا۔

انسان کو چاہئے کہ اپنے کردار و عمل واخلاق کے ذریعہ اپنی دنیاوآخرت کو سنوارے۔ تعالیم قرآن اور اوپانیشاد کے درمیان کافی قربت پائی جاتی ہے جیساکہ شیعہ بزرگ مفکر و عالم علامہ طباطبائی کے نظریہ کے مطابق دونوں کتابوں میں بہت سے موارد قرآنی توحید کے ہم خیال ہیں۔ اور اس ہم خیالی اور باہمی تعاون میں ہم پہلے سے زیادہ اضافہ کر سکتے ہیں۔

روحانیت و معنویت عصر حاضر کے گمشدہ عنصر

مؤلف: ڈاکٹر شمس اللہ مریجی
مترجم: مولانا منہال حسین خیرآبادی

انسانی سماج خصوصاً آج کا ترقی یافتہ سماج ایسا ہے جس میں انسان نے ٹکنالوجی کی دنیا میں ترقی کرنے اور اپنی مادی کائنات کو سجانے اور چمتکار دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تاکہ وہ اپنی مادی ترقی کے زینوں سے ہوتے ہوئے روحانی و جسمانی چین و سکون اور معنویت کی انمول نعمت کو حاصل کرسکے، جب کہ اگر سطحی طورپر دیکھا جائے اور انسانوں کی مادی سعی و کوشش کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت بالکل عیاں دکھائی دے گی کہ مادی ترقی اور ٹکنالوجی انسان کی بے قرار روح کو اطمینان عطا کرنے اور اس کے باطن میں متلاطم سمندر کو سکون بخشنے میں بالکل ناکام رہی ہے اور آج تک اس کی حقیقت اور معنویت لاپتہ ہے۔یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ معنویت آج کے ترقی یافتہ دور کی گمشدہ نعمت ہے جس کے فقدان نے انسانوں میں کھلبلی مچارکھی ہے اور اسے در در ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا ہے۔ معنویت اور حقیقت کے شیدائی اس کے فراق و فقدان میں مادی نظام کے ہاتھوں کروٹیں بدل رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس سے آج کسی کو انکار نہیں ہے اور آج تک جس سے جو بنا اس نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اپنے تئیں اقدامات انجام دیئے ہیں اور انسانوں کو اس مشکل سے رہائی دلانے کے لئے کوشش کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معنویت اور معنویت کی چاہت ایک ایسی شفابخش دوا ہے جس کی حیرت انگیز تاثیر کا انکار کوئی نہیں کرسکتا بلکہ اس مسئلہ میں اتفاق رائے پائی جاتی ہے۔دنیا کے مشہور و معروف سماجی ماہرین جیسے ماکس وبر نے نظریہ "جدیدیت" کو تمام مشکلات کے لئے بہترین راہ حل کے عنوان سے پیش کیا تھا جس میں معنویت کو بالکل بھلادیا گیا تھا اور ترقی یافتہ سماج کو لوہے کے پنجرہ سے تعبیر کیا گیا تھا جس میں معنویت اور آزادی کا کوئی مقام نہیں تھا۔ اس کے برعکس عصر حاضر کے دانشور مذکورہ نظریہ کے بالکل مدمقابل کھڑے ہوئے ہیں جن میں سرفہرست اشیش نندی ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ اس

دور میں دین سے وابستہ معنویت سماجیات میں بہتری اور انسانی اقدار کی حفاظت کے لئے تنہا ذریعہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کی اہمیت لوگوں کے لئے واضح ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں معنویت کے متعدد معنی بیان کئے گئے ہیں ؛ جن میں قابل مشاہدہ ہیں؛ انسانی روابط و تعلقات کے اعلیٰ نمونے، معنائے وجودی کی تلاش، انسان کے ملکوتی و الٰہی ابعاد ، ذاتی نظریے اور تجربیات جو ایک انسان کو عالم ماورا سے جوڑتے ہیں۔

بعض دانشوروں نے معنویت کے لئے حیاتی اور جینیاتی بنیادیں بھی قرار دی ہیں اور بعض نے اسے ایک فردی احساس کا نام دیا ہے جو مصیبت و بلا میں گرفتار ہونے اور زندگی کے پیچ و خم میں الجھنے کے بعد آشکار ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ انسان کی محدودیت واضح و روشن ہوتی ہے۔

بعض مادہ پرست دانشوروں نے معنویت کو بظاہر فرضی اور محسوسات کی حد تک قرار دیا ہے ، اسی لئے جب وہ معنویت کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں تو ان کے فہم و شعور میں معنویت کے نام پر اگر کوئی چیز آتی ہے تو وہ امید، اطمینان اور نشاط ہے۔اسی وجہ سے وہ لوگ جب کسی کو معنویت اور سلامتی کی سفارش کرتے ہیں تو اسے فنکاری، ورزش اور یوگا وغیرہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ اگر دین کی باتیں بھی کرتے ہیں تو اسے انسانی چین و سکون کا ایک ذریعہ اور وسیلہ قرار دیتے ہیں اور اگر کبھی اقرار کیا تو بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ عقائد، اقدار اور دینی اعمال و مناسک صرف اس لئے مفید ہیں کہ ان کے ذریعہ جسمانی اور روحانی مشکلات کا حل بآسانی ہو جاتا ہے اور ان کی مدد سے بہت سی مصیبتوں سے نجات مل جاتی ہے اگرچہ زیادہ تر وہ بے بنیاد یا من گھڑت ہوتے ہیں۔

وہ لوگ ایسی باتیں اصل حقیقت سے ناآشنائی اور معنویت سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر کرتے ہیں۔ ان کی باتیں شاید زندگی کی بعض مشکلات کو بظاہر حل کردیں اور ان کے دل میں اپنی باتیں بٹھا کر وقتی طور پر اس کے وجدان و ضمیر کو سکون عطا کردیں لیکن انسانی مقصد اور اس کی پیدائش کے معنی و مقصد کو سمجھنے کی عطش کو بجھا نہیں سکتے اس لئے کہ باطل اہداف اور ظن و گمان پر قائم مقاصد ہرگز انسان کے لئے مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ایسی باتوں میں آنا اور انہیں قبول کرنا بے معنی اور موہوم زندگی کی وحشتناک تاریکیوں اور طوفان سے بچنے کے لئے بہت ہی برا اقدام ہے اور ایسی باتوں پر اعتماد اور بھروسہ کرنے والے انسانوں کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کردیا ہے ، یہ باتیں بہت ہی کم مدت کے لئے انسان کو خوش بین بناتی ہیں

اور جیسے ہی اس کی تاثیر کمزور ہونے لگتی ہے، انسان کے وجود میں سستی، مہمل ہونے کے تخیلات اور دھوکا کھانے کا احساس دوبارہ بیدار ہو جاتا ہے، بلکہ یہاں پر یہ بات کہنا بالکل مناسب ہے کہ ایسی باتوں پر بھروسہ کرنا حقیقت میں پستیوں میں گرفتار ہونے اور دوران جاہلی کی بے بنیاد رسومات جیسے جادو اور ٹونے وغیرہ میں پھنسنے کا باعث ہے اور یہ وہ چیز ہے جو عمل گرانی محض سے وجود میں آتی ہے[1]۔

معنویت کیا ہے؟

معنویت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کے لغوی اور اصطلاحی اور دیگر زبانوں میں اس کے بدلے استعمال کئے جانے والے کلمات کو دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کلمہ سب سے پہلے یورپ میں عیسائیت کے مفاہیم کے درمیان spirituality کی شکل میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ لاتینی لفظ spiritus جس کے معنی نفس کے ہیں اور spirare سے مشتق ہے جس کے معنی دم کرنا یا سانس لینا ہے۔ عہد جدید میں اس کا لاتینی ترجمہ spiritualist یا معنوی شخص کی صورت میں ہوا۔ معنوی شخص اس انسان کو کہا جانے لگا جس کی زندگی امر یا روح القدس یا خدا کے ماتحت ہو۔ یہ اصطلاح عیسائیوں کے خیال کے مطابق الہام کے پرتو میں کتاب مقدس کے اصلی اور لغوی معنی میں پوشیدہ تھی۔ کچھ مدتوں کے بعد مشہور عقیدہ کہ ہر ظاہر میں ایک باطن پوشیدہ ہے، تمام معنوی وقائع کو جیسے کہ عشاء ربانی اور عظمت الٰہی کی تجلی طبیعت کے لئے بولا جانے لگا[2]۔

البتہ عصر حاضر میں معنویت کے ایک دو نہیں بلکہ متعدد معنی بیان کئے جاتے ہیں جس میں انسانی روابط کے عالی ترین درجات، معنائے وجودی کی کھوج، انسان کے متعالی ابعاد یا ایک عالی اور انسانوں سے مافوق موجود سے متعلق انسانوں کے احساسات وغیرہ شامل ہیں۔ لفظ معنویت حقیقت میں مصدر عنی سے ماخوذ ہے اور ماہرین لغت نے معنوی اصطلاح کو ان تمام امور کے لئے استعمال کیا ہے جو مادی، صوری اور ظاہری کے مقابلہ میں ہوں، یا وہ امور اور معانی جنہیں دل کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے اور انہیں زبان سے ہرگز بیان نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ دہخدا نے اپنی لغت میں معنوی مقامات میں سیر باطنی، حق کی جانب سلوک کے درجات اور عرفانی مقامات کو شمار کیا ہے۔

۱۔ مصباح، علی، واکاوی مفہومی معنویت و مسالہ معنا، فصلنامہ اخلاق پزشکی، سال ۴، شمارہ ۱۴، ص ۲۴، ۲۵

۲۔ مرزبند رحمت اللہ، زکوی علی اصغر، شاخص ہای سلامت معنوی از منظر آموزہ ھای وحیانی، فصلنامہ اخلاق پزشکی، سال ۶، شمارہ ۲۰، ص ۴۷

حقیقت یہ ہے کہ معنویت اور مادیت کے درمیان کوئی تضاد اور تناقض نہیں پایا جاتا بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم شمار ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان جہاں مادی ہے وہیں پر معنوی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اسی لئے معنویت کو ہر گز عقل اور علم کے خلاف نہیں کہا جاسکتا بلکہ بر عکس معنویت عقل اور علم سے سازگار بلکہ تینوں ایک دوسرے کے بہترین مددگار ہیں۔

انسانی شخصیت کے ابعاد اور مختلف پہلو آپس میں اس طرح پیوستہ ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا، بلکہ انسانی حقیقت معنویت اور مادیت کے درمیان قائم ہے اور دونوں انسانی وجود میں بطور مساوی پائے جاتے ہیں، جیسا کہ اس مدعا کی گواہی خداوند عالم قرآن مجید میں دیتا ہے: وَ نَفسٍ وَ مَا سَوَّاهَا فَألهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقوَاهَا، قَد اَفلَحَ مَن زَكَّاهَا[1]؛ اور نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا، پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی، بتحقیق جس نے اسے پاک رکھا کامیاب ہوا۔

انسانی وجود کی حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری طاقتوں سے مل کر متوازن اور متعادل ہوا ہے جو آپس میں متضاد نظر آتی ہیں اسی لئے ہر گز معنویت کی اصطلاح کو مادیت کے مقابلہ میں استعمال نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اس زمین پر اس کی دنیوی زندگی کی لوازمات میں سے ہیں، جیسا کہ یہ مشہور ہے بلکہ حقیقت ہے کہ یہ مادی کائنات عالم آخرت کے لئے ایک مقدمہ، ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

معنویت اور اس کے مشتقات اسلامی منابع جیسے قرآن، سنت اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول روایتوں میں وارد نہیں ہوئے ہیں لیکن مسلمانوں کی ادبیات میں خواہ وہ عربی زبان ہو یا فارسی زبان، فراوان دکھائی دیتے ہیں۔ کلمہ معنویت کا مصدر معنوی ہے۔ کلمہ معنوی بھی یائے نسبتی سے ملحق ہے جو حقیقت میں معنی تھا اور ذاتی طور پر وہ خود مصدر میمی ہے جس کا مطلب مقصود اور مراد ہوتا ہے، پس معلوم ہونا چاہئے کہ کلمہ معنوی حقیقت میں معنی سے منسوب ہے اور کلمہ لفظی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی ایک ایسی چیز ہے جو الفاظ اور عبارتوں کے پس پردہ مخفی ہوتا ہے جسے الفاظ اور عبارتیں اپنے طور طریقے سے بیان کرتی ہیں اسی لئے جب معنی فعلیت کی منزل میں آتا ہے تو اس کے دو روخ ہوتے

۱۔ سورہ شمس، آیت نمبر ۷ تا ۱۰

ہیں۔ ایک رخ اس کا ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا رخ وہ مطلب ہوتا ہے جسے وہ بیان کرنا چاہتا ہے جسے محکی کہتے ہیں۔ بعنوان مثال؛ جب ہم کسی اہم متن کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہیں تو کلمات اور عبارتوں کے ذریعہ ایک ایسے معنی کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو عالم عینی اور خارجی میں یا متکلم کے مافی الضمیر میں موجود ہیں، اگر کوئی متن اس رسالت اور ذمہ داری کو بخوبی پوری نہ کرسکے تو اسے مہمل کہا جائے گا اس لئے کہ ہر بات حقیقت میں ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے کسی حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے جسے مدلول کہا جاتا ہے۔ یہی رابطہ ایک عمل اور اس کے معنی میں بھی پایا جاتا ہے۔ اجتماعی علوم میں معنادار اعمال و کردار کے سلسلہ میں بحث ہوتی ہے جو ایک فاعل سے اسی وقت سرزد ہوتا ہے جب وہ کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر کوئی فاعل کسی ہدف کے بغیر کوئی کام کرنا چاہے تو وہ جو بھی عمل انجام دے گا وہ بے سود ہوگا اور اسے حماقت کا نام دیا جائے گا[1]۔

قرآن میں معنویت کی جڑیں

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے یہ بات بیان کردی ہے کہ کلمہ معنویت کا استعمال اسلامی منابع میں کہیں بھی نہیں ملتا لیکن اس کے دامن میں ایسے مفاہیم اور اصطلاحیں ضرور ہیں جو اس حقیقت کو بخوبی بیان کرتی ہیں اور اس کے متعدد شواہد خود قرآن مجید میں قابل دید ہیں۔ قرآن مجید نے معنویت کو وسیع پیمانہ پر مورد توجہ قرار دیا ہے اور اس کی نظر میں معنویت کا دائرہ اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس کے اندر احوال، اقوال، افعال، مقاصد، نیات اور انسانی افکار شامل ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کی نظر میں معنویت کی جان خداپرستی پر استوار ہے اور اسی لئے جو کام، حرکت اور فکر بھی خدا کی مرضی، اس کی خوشی اور اس کی راہ میں انجام دے وہ معنویت کے دائرے میں داخل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ [2]۔ اس آیت کے مطابق خلوص کو تمام عبادی، تجاری، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کی جان اور اصل و اساس کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح تمام عبادات جیسے کہ ذکر، تفکر، تعلیم، تعلم، حکومت، حکمت، سیاست اور سلوک و معنویت کو الٰہی و توحیدی آئینہ میں قابل قبول

۱۔ فرہنگستان علوم پزشکی، جستاری در سلامت معنوی، مجموعہ مقالات، ص ۴۳

۲۔ سورہ سبا، آیت ۴۶

گردانتا ہے وگرنہ اس کی نظر میں غیر الٰہی سرگرمیاں عبث ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں ہے: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِین[1]۔ اس مقالہ کا اصلی مقصد اسلامی معارف کے سب سے اہم منبع اور انسانوں کی ہدایت کا بے نظیر نسخہ قرآن مجید کی نظر میں معنویت کے مبانی کو تلاش کرنا ہے:

اصالت روح

قرآن مجید کی نظر میں انسان حقیقۃ الحقائق کی ایک جھلک اور خدا کے جلالی و جمالی اسماء کا بے نظیر جلوہ ہے جس کی حقیقت متالہانہ ہے۔ انسان کے وجود کی پہچان، اس کی معرفتی، انسانی اور سماجی و تاریخی حد و حدود کی شناخت اس کی روح کی اصالت کی شرح و تفسیر میں نہفتہ ہے: فَاِذَا سَوَّیتُہ وَ نَفَختُ فِیہِ مِن رُوحی[2]۔ اس آیہ شریفہ میں، من روحی کی یاء ابتدائے تکوین پر دلالت کرتی ہے اور فَادخُلِی فِی عِبَادِی وَادخُلِی جَنَّتِی[3] سے ظاہر ہوتا ہے کہ سعادت و کمال کی راہ میں انسان کی کمال خواہی عقل و ارادہ اور عشق و ایمان کی بنیادوں پر قائم ہے تاکہ وہ کدحاً فَمُلاقیہ[4] اس سیر و سلوک کی نہائی منزل پر فائز ہونے کے بعد بارگاہ الٰہی میں سرافرازی سے سرخرو ہوسکے اور معنویت کا شیدا انسان عقل اور وحی، شجرہ طیبہ اور شریعت مقدسہ اور انسان کامل کی مکمل حمایت حاصل کرتے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن رہے۔ پس جب انسان معرفت کی اس منزل پر فائز ہوتا ہے تب اس کے وجود میں خدا کو تلاش کرنے اور خدا سے انسیت کی تڑپ جو عبد اللہ ہونے کی شان اور تقرب کا وسیلہ اور پھر رنگ الٰہی میں رنگین ہونے کا باعث ہے، پیدا ہوتی ہے[5]۔

فطرت کی اصالت

قرآن مجید کی گواہی کے مطابق انسان کی فطرت خدائی اور الٰہی ہے اسی لئے اس کے وجود کی چاہتیں خواہ وہ معرفت کی عطش ہو، یا حقیقت پسندی ہو، یا خیر خواہی ہو یا عشق و محبت ہو، عدل و انصاف کی جانبداری

۱۔ سورہ مائدہ، آیت ۲۷
۲۔ سورہ حجر، آیت ۲۹
۳۔ سورہ فجر، آیت ۲۹و۳۰
۴۔ سورہ انشقاق، آیت ۶
۵۔ رودگر محمد جواد، معنویت گرایی در قرآن، فصلنامہ علوم اسلامی، سال چہارم، شمارہ ۱۴

ہواور عبودیت وغیرہ ہوایسے تمام مفاہیم اور چاہتیں سب کی سب انسانی فطرت سے ماخوذ ہیں اور ان کی جڑیں انسانی فطرت میں پائی جاتی ہیں جس کی بنا پر اس کی فطرت جو اپنے نفس کی معرفت سے عجین ہے، اصل کی جانب بازگشت سے بارور ہوتی ہے اور اس طرح فطرت میں معنویت کی اصل اصیل اور رکن رکین بیٹھ جاتی ہے۔ اسی لئے خداوند عالم نفس الٰہی اور فطرت الٰہی کی بنیاد پر سلوک کی تعلیم دیتا ہے اور فرماتا ہے: یاایّھا الّذینَ آمنوا عَلَیکُم اَنفُسکُم لاَ یضرّکُم مَن ضَلّ اذَا اھْتَدَیتم[۱]، اسی لئے نبوت و رسالت کا مقصد فطرت انسانی کو تعلیم دینا تھا کہ وہ معرفت کے ساتھ اپنی وجودی حقیقت کی جانب رجوع کرے جیسا کہ حضرت ابراہیم اور نمرودیوں کے درمیان مجادلہ میں بیان ہوا ہے: فرجعوا الی انفسھم[۲] اور اسی طرح قرآن مجید نے اپنے رسول کو "مذکر" یعنی یاد دلانے والا کہہ کر خطاب کیا ہے۔

معنویت کی اصل و اساس فطرت کی اصالت میں مضمر ہے اور فطرت ایک ایسی چیز ہے جس میں تبدیلی کسی بھی حال میں ممکن نہیں ہے اگرچہ وہ حالات و شرائط کے پیش نظر مہجور اور مستور ہی کیوں نہ ہو جائے، انسان کو ہر حال میں ایک نہ ایک دن اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے اور اس مرحلہ سے گذرنا ہے۔ آیت اللہ جوادی آملی حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

> "اگرچہ وقتی طور پر تبدیلی آسکتی ہے یعنی ظاہری طور پر افکار میں وہم و خیال دخیل ہو جائے، چاہتوں میں شہوت اور غضب حکم فرما ہو جائے اور باطنی طور پر ابلیس کے وسوسے وغیرہ کے ذریعہ عقل انسانی اسیر ہو جائے اور وجود انسانی کا اصلی حاکم اور حکم فرما مہجور و معزول ہو جائے، اس کے جسم و جان پر وہم و گمان اور شہوت و غضب کا قبضہ ہو جائے، اس حالت میں ایک انسان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت جو عقل نظری اور عقل عملی کے سایہ میں انجام پذیر ہونا چاہئے وہ وہم و خیال کی جھوٹی رہنمائی اور شہوت و غضب کی جھوٹی امامت کے ذریعہ آگے بڑھنے لگے تو نقصان اور خسارہ کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے[۳]۔"

۱۔ سورہ مائدہ، آیت ۱۰۵

۲۔ سورہ انبیاء، آیت ۶۴

۳۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر انسان بہ انسان، ص ۴۱

پس یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ فطرت کا دار ومدار معنویت پر ہے اسی لئے جو لوگ معنویت سے منہ چراتے ہیں، وہ خود سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور حقیقت میں ایسے لوگ اپنی حقیقت سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید کی گواہی کے مطابق جو لوگ خدا کو بھلا دیتے ہیں خدا انہیں خود سے بیگانگی میں مبتلا کر دیتا ہے یعنی خدا کو بھولنے کا انجام خود سے بیگانہ ہونا ہے: وَلا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسوا للّٰه فَانساهُم اَنفُسَهُم اُولئِكَ هُمُ الفَاسِقون [۱]۔ مذکورہ آیت کے لب و لہجہ کو ملاحظہ کریں کہ کس طرح خداوند عالم ایسے لوگوں کو فاسق قرار دیتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی حقیقت سے اور توحیدی والٰہی فطرت سے بہت دور ہو چکے ہیں۔

علم غیب کی اصالت

اس کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؛ غیب اور شہادت۔ اس بات کی وضاحت پیش کر دیں کہ یہاں پر کائنات کی دو حصوں میں تقسیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حقیقت میں یہ دونوں الگ الگ ہیں بلکہ اس تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے وجود کے مراتب ہیں جس میں ظاہر و آشکار حقیقتیں نہفتہ ہیں اور ان کے درمیان علت و معلول کا رابطہ پایا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال انسان کے وجود میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے کہ انسان جسم و جان کا مجموعہ ہے۔ استاد شہید مطہری اعلیٰ اللہ مقامہ اس بات کے لئے ایک خوبصورت تعبیر پیش کرتے ہیں: قرآنی تصور کائنات میں یہ پوری دنیا بس انہیں چیزوں میں محصور نہیں ہے جسے ہم مشاہدہ کر رہے بلکہ ہمارے محسوسات اس دنیا کی بہت ہی نازک پرت ہیں اور جو اصلی دنیا ہے وہ اس پرت اور ہمارے محسوسات سے ماوراء ہے، پس جو محسوسات میں قید ہو جائے اسے شہادت کہتے ہیں اور جو نامحسوس ہو اسے غیب کہتے ہیں [۲]۔

جب بھی انسان کے لئے اس کی اصلیت مد نظر ہو گی وہ غیب پر ایمان لائے گا: الذین یومنون بالغیب [۳]۔ اس کی استعداد اور صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں گی۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ غیب پر ایمان،

۱۔ سورہ حشر، آیت ۱۹

۲۔ مطہری، مرتضیٰ، مجموعہ آثار، ص ۱۲۲

۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۳

باطن کی طرف توجہ اور زندگی کی پائدار اور جاوداں حقائق کو اہمیت دینے کے بعد معنویت کی طرف رجحان بڑھتا ہے اور جب انسان غیب پر ایمان لاتا ہے تو اس کے جملہ امور کو دائمی اصالت اور وہ خود جاوداں ہستیوں سے متصل ہو جاتا ہے۔ اسی مرحلہ کے بعد وہ عالم شہادت سے عالم غیب کی جانب کوچ کرتا ہے اور یہ مادی کائنات جو عالم احساس و شہادت ہے اسے اپنی ترقی اور سعادت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ ایک آنکھ سے شہادت اور دوسری آنکھ سے غیب کی رصد کرتا ہے، مادہ پرستی سے دور ہوتا ہے اور معنویت کی جانب ہجرت کرتا ہے اور پھر اس کے لئے غیب پر ایمان لاتا ہے اور عقلی و نقلی اور کشفی و شہودی ادلہ و براہین کے ذریعہ اس کی اصالت کو حاصل کرلیتا ہے۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ انسان کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی اس کے وجود میں معنویت کی جڑیں اتنی ہی گہری اور عمیق ہوں گی اور جب معرفت اور خلق و عمل کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے تو ہمیشہ معرفت کو اصالت حاصل ہوتی ہے[۱]۔ علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: معنوی زندگی، ہمیشہ عالم معنا کی اصالت پر قائم ہوتی ہے[۲]۔

شریعت کی اصالت

قرآن کریم نے معنویت اور پروردگار کے تقرب کو حاصل کرنے کا ذریعہ شریعت کی پابندی میں قرار دیا ہے۔ یہاں پر شریعت سے مراد عقائد، اخلاق اور احکام الٰہی ہیں یعنی اسلام نے اپنی تمام تعلیمات وہ خواہ کسی بھی شعبہ سے متعلق ہوں، عقائد ہوں، یا افکار و نظریات ہوں یا پھر شریعت اپنے خاص معنی میں ہو یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر البتہ یہ بات نظر میں رہے کہ قرآنی معنویت اسلامی عقائد، اخلاق اور احکام سے الگ نہیں ہے۔ اس لئے کہ آیہ شریفہ: ثُمَّ جَعَلناكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الأَمرِ فَاتَّبِعَها وَلَا تَتَّبِع اَهوَاءَ الَّذِين لَا يَعلَمون[۳] یا آیہ شریفہ: مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُم عَنهُ فَانتَهُوا[۴] جب مذکورہ دونوں آیتوں کو ایک دوسرے سے ملایا جاتا ہے تو معنویت کے درمیان شریعت کی اصالت کا موضوع واضح و روشن ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ خدا، وحی، نبوت، رسالت، امامت اور ولایت کے

۱۔ جوادی آملی عبد اللہ، تفسیر تسنیم، ص ۱۷۵
۲۔ طباطبائی محمد حسین، شیعہ، ص ۲۳۷
۳۔ سورہ جاثیہ، آیت ۱۸
۴۔ سورہ حشر، آیت ۷

بغیر معنویت کا کوئی معنی نہیں ہے بلکہ وہ معنویت نہیں ہے اور وہ حقیقی معنویت کی طرح روح افزا نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ نے آیہ شریفہ میں لما یحییکم کے لام کو الیٰ کے معنی تفسیر کی ہے اور لکھا ہے: اس طرح لام کو الیٰ معنی میں استعمال کرنا عربوں کے درمیان رائج ہے، اور پیغمبر اکرمؐ جس امر کی جانب لوگوں کو دعوت دینے کے لئے مبعوث ہوئے تھے وہ دین حق تھا اور حقیقی و برحق دین اسلام ہے اور قرآن مجید نے اسی اسلام کو فطرت کے مطابق قرار دیا اور اس کی تفسیر و تشریح علم اور عمل صالح سے کی ہے[۱]۔

اسی لئے اسلامی معنویت مردہ انسان کو بھی زندہ کر دیتی ہے اور اس کی طبیعی حیات میں حیات طیبہ کی روح پھونک دیتی ہے اور اس کی حیوانی زندگی کو عقلانی اور روحانی زندگی میں بدل دیتی ہے اور اس کے اعمال و افکار جاوداں ہو جاتے ہیں۔ خدا پر ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ اس کا وجود پرنور ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لئے علمی اور عملی نمونہ عمل بن جاتا ہے[۲]۔

قرآن میں معنویت کے معیارات

معنویت کے مباحث میں ایک اہم بحث اس کے معیارات ہیں جن کے ذریعہ اس کی شناخت ہوتی ہے اور وہ خود بھی انہیں معیارات پر قائم ہے، تاکہ ان کی کسوٹی پر واقعی و غیر واقعی، دینی و غیر دینی اور جھوٹی و سچی معنویت کا پتہ لگایا جاسکے اور معنویت کی کھوج لگانے والوں کو معلوم ہو سکے کہ حقیقی معنویت مفید، زندگی میں جان ڈالنے والی، روح افزا، سعادت بخش اور کمال عطا کرنے والی ہوتی ہے اور جس معنویت میں یہ خصوصیات نہ ہوں وہ جھوٹی، غیر واقعی اور تباہ و بربادی کا پیش خیمہ ہے، اس لئے کہ آج کی دنیا میں قسم قسم کی معنویت کا بازار گرم ہے تاکہ ماڈرن معنویت کے نام پر ماڈرن انسان کو سیکولر اور لیبرل معنویت عصر حاضر کے انسانوں کی معنویت کی کمی اور شخصیت کے فقدان کی بیماریوں کا علاج کر سکے۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض لوگوں نے معنویت کو ہتھکنڈہ بناتے ہوئے ایک نئی شکل میں انسانوں کے سامنے پیش کر دیا تاکہ وہ اپنے گمان میں انسانوں کی مشکلات کو حل کر سکیں اسی لئے اس دور میں معنویت کی اصل و اساس اور بنیادوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے تاکہ حقیقی معنویت کو نقلی معنویت سے تشخیص دے سکیں۔

۱۔ طباطبائی محمد حسین، تفسیر المیزان، ج۹، ص ۵۵

۲۔ رودگر محمد جواد، معنویت گرائی در قرآن، فصلنامہ علمی، پژوہشی علوم اسلامی، سال چہارم، شمارہ ۱۴

عقلانیت اور خرد ورزی

قرآنی معنویت عقلانیت پر قائم ہے تاکہ اس کے معیارات بھی عقلانی ہوں اور اسے خرد کی کسوٹی حاصل ہو، اس لئے کہ اگر معنویت کی پشت پناہ عقل نہ ہو تو زندگی میں حقائق کے ٹکراؤ کی وجہ سے انسان میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اسی لئے اسلامی روایتوں میں عقل کو مومن کا بہترین رہنما بتایا گیا ہے العقل لا ینخدع ؛ عقل والے ہر گز دھوکہ نہیں کھاتے۔

علی قدر العقل یکون الدین [۱]؛ انسان کے پاس جتنی عقل ہوتی ہے اتنا ہی دین ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کی بارگاہ میں خضوع و خشوع بھی اسی عقل کی وجہ سے ہے۔ اگر عقل و خرد کی رہنمائی نہ ہو تو خدا کے سامنے بھی انسان گستاخ ہو جاتا ہے۔ انہ لم یخف اللّٰہ من لم یعقل عن اللّٰہ ؛ جس کے پاس عقل نہ ہو وہ اللہ سے خوف نہیں کھاتا [۲]۔ یا ارشاد ہوتا ہے: ماکذب العاقل ، کوئی بھی عقلمند جھوٹ نہیں بولتا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ معنویت جس کی بنیادیں عقلانیت اور خرد ورزی پر قائم نہ ہوں وہ ہمیشہ عقلانیت کے مد مقابل کھڑی ہو گی۔ اسی طرح وہ عشق جسے عقل کے مد مقابل پیش کیا جاتا ہے یعنی غیر معقول عشق میں کوئی معنویت اور روحانیت نہیں ہوتی بلکہ اس نکتہ کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ عقل ہمیشہ ایمان، معنویت، فضیلت اور باطنی چین و سکون کا معیار اور اس کا اصلی راز ہے [۳] اور وہ معنویت جس میں عقلانیت نہ ہو وہ معنویت نہیں ہے۔

اعتدال اور توازن

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معنویت انسان کی روح کی ضرورت کا نام ہے اور روح بھی رشد و کمال کی محتاج ہے تاکہ کمال کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہو سکے لیکن جہاں روح کی تمام ضرورتوں کا پورا ہونا ضروری ہے وہیں کمال کی منزلوں میں مسافت طے کرنے کے دوران تعادل اور توازن بھی ضروری ہے تاکہ اسے مناسب طریقہ سے رشد و کمال حاصل ہو سکے ورنہ روح بعض منزلوں میں کمزور اور بعض میں

۱۔ آمدی عبد الواحد، شرح غرر الحکم و درر الکلم، ج۱، ص ۱۱۶ و ج ۲، ص ۴۲۰، ۲۴۴ و ج ۴، ص ۳۱۳
۲۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج۱، ص ۱۳۹
۳۔ جوادی آملی، عبد اللہ، ادب فنای مقربان، ج ۲، ص ۶۴، ۶۶

قوی ہو جائے گی۔ اسلامی تربیت اور قرآنی تعلیمات میں انسان کی صلاحیت اور قوت وطاقت، تعادل اور توازن پر قائم ہے، تاکہ اس میں خلقت کی وجہ سے کوئی افراط و تفریط نہ ہوسکے بلکہ اس میں انسان کے معنوی ابعاد کے تمام اطراف و جوانب کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے اسی لئے اسے پوری طرح مورد توجہ قرار دینا ضروری ہے لہذا نہ معنویت کو سماجیات کی وجہ سے قربان کرنا ہے اور نہ ہی سماجیات کو معنویت کی بھینٹ چڑھانا ہے، بلکہ دائرہ معنویت میں سماجیات قابل دید ہوں، اسی طرح سماجیات کے دائرہ میں معنویت دکھائی دیتی ہو۔اسی طرح انسان کی معنوی تعلیم و تربیت میں جسم اور روح دونوں کو مد نظر قرار دیا جائے جیسا کہ نماز صبح کی تعقیبات میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ نور چشم کے ساتھ نور دل یا بصر اور بصیرت دونوں کی نورانیت کی درخواست ہوئی ہے: واجعل النور فی بصری والبصیرۃ فی دینی۔

روح اور جسم کی تربیت کے ساتھ شہوت رانی اور نفس پرستی سے مقابلہ بھی دین وایمان کا تقاضہ ہے اس لئے کہ جب تک ایک مسلمان قرآن کی معنویت کے سایہ میں اپنے جسم اور روح کی سلامتی کو حاصل نہیں کرتا، منزل کمال کو طے نہیں کرسکتا اور حقیقت میں رشد و کمال جسم و روح کی پیدائش کا اصلی مقصد ہے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ روح پانچ ابعاد پر مشتمل ہے؛

۱۔ عقلی صلاحیت (یعنی حقیقت کی تلاش اور علم دوستی) ۲۔ اخلاقی صلاحیت (یعنی فطرت کا صحیح و سالم ہونا) ۳۔ دینی صلاحیت ۴۔ ذوق اور ہنری صلاحیت ۵۔ ایجاد اور اختراع کی صلاحیت

انسانی روح کے مذکورہ پانچ ابعاد کو اسلامی اور معنوی تربیت کے زیر سایہ پروان چڑھانا ہوگا تاکہ ان میں تعادل اور توازن پیدا ہو جائے، لہذا علم کی تلاش میں جانا، عقل کی تربیت کرنا، خلوت، سحر خیزی اور تربیت کے تمام مراتب کا خیال رکھنا انسان کی دائمی ضرورت ہے۔ایک انقلابی جستجو اور کمال مطلق کو حاصل کرنے کی راہ میں اس کی سیر ناپذیری کی دلیل ہے اور یہ سب کچھ ایک متعادل معنویت کو حاصل کرنے کیلئے ہے۔

استاد شہید مطہری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ایک سچا مسلمان ہی انسان کامل ہوتا ہے، ہمیشہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اپنے لئے نمونہ عمل بنانا چاہئے، اس لئے کہ مولا اپنی عارفانہ تنہائیوں اور خلوت میں ایسے ہی تھے۔تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے، سماجی مسائل میں حد سے زیادہ دقیق اور حساس تھے پس جو اسلام کا شیدائی ہوتا ہے وہ ایسا ہی ہوتا ہے[1]۔

۱۔ مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ص ۵۵۸، ۶۸۸

عبودیت پسندی

روح معنویت یعنی خدا کی بندگی، الٰہی بن جانااور اس کے اوصاف میں فنا ہو جانا اور اخلاق الٰہی سے آراستہ ہونا ہے اس لئے کہ عبادت کی روح معنویت اور روحانیت کو حاصل کرنے کے لئے ہے۔ استاد شہید مطہری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: عبادت کی روح یاد دہانی اور تذکر ہے یعنی خدا کی یاد اور اس کے ذکر میں مشغول رہنااور خدا کی غفلت سے محفوظ رہنا[1]۔ روایتوں کی روشنی میں ایک عارفانہ عبادت اور حضور قلب کے ساتھ دو رکعت نماز تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ نماز ہی انسان کی معراج اور اس کی روح کی بالیدگی ہے، حقیقت میں عبادت خودی کو توانا بنانا اور اپنی خودی سے ماورا کا سفر کرنا اور ظاہر و باطنی قید و بند سے آزاد ہونا ہے یعنی جب انسان ایک موجود نامحدود سے تعلق پیدا کرتا ہے تو وہ وجودی اعتبار سے وسیع اور نامحدود بن جاتا ہے۔ اسی لئے تمام اسلامی عبادتیں، واجب ہوں یا مستحب ہوں، وہ سب کی سب شرح صدر اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں شگوفائی کا باعث ہوتی ہیں۔

عبودیت جو خدا سے قلبی رابطہ اور جوہری تعلق کا نام ہے، اس وقت متعالی اور قابل رشک ہوتی ہے جب انسان غفلت کی دیواروں کو منہدم کر دیتا ہے اور جملہ روابط خواہ وہ اپنی ذات سے ہو یا سماج سے ہو جب منطق و استدلال اور عقل کی رہنمائی میں ہوتے ہیں تب ان میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی عبادات میں وہ نماز ہو، دعا ہو، حج ہو، یا جہاد ہو امر بالمعروف ہو یا نہی عن المنکر ہو، جملہ حقوق جیسے خدا کے حقوق، سماج کے حقوق بلکہ پوری کائنات کے حقوق کی طرف بھرپور توجہ دی گئی ہے۔

تمام اسلامی عبادتوں میں جو معنویت کی پرچمدار ہیں، مخلوقات خدا اور ان کے لئے خدا کا لطف و کرم شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے اسلامی و قرآنی معنویت میں کوئی بھی کام غیر خدا کے لئے نہیں ہوتا اور نہ ہی عبودیت الٰہی سے عاری ہوتے ہیں بلکہ ان میں سراسر اخلاص اور تسلیم پائی جاتی ہے۔ ایک معنوی انسان ہرگز اپنے سماج اور گھریلو حقوق سے دستبردار اور بے توجہ نہیں ہوتا۔ ایک متعبد انسان اپنی زندگی اور اپنے وجود کے تمام ابعاد کی بھرپور مدیریت اور اس کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے تاکہ اپنے وجود کے ہر عیب و نقص کو دور اور خود کو ہر قسم کے قید و بند سے رہا کر دے، پوری طرح آزاد ہو جائے بلکہ اپنی معنوی آزادی کے بعد ہر

۱۔ مجموعہ آثار، ص ۶۳۶

قسم کی آزادی کو اپنے اختیار میں بھی لے سکتا ہے، البتہ یہ بات یاد رہے کہ ربوبیت اور ولایت کے کچھ مراحل ہیں جنہیں ہم یہاں پر بیان کرتے ہیں:

الف) نفس اور نفس کی طاقت پر قابو پانا یا اپنی جان و روح کی تربیت کو اپنے ہاتھ میں لینا۔

ب) جسم کو اپنی تربیت میں قرار دینا اس طرح کہ بعض سرگرمیوں میں وہ جسم کی خدمت سے بے نیاز ہو جائے۔

ج) بیرونی امور کو قبضہ میں لینا اور تمام خارجی معاملات پر انسانی ارادہ کا حاکم ہو جانا البتہ خدا کی اجازت سے اس لئے کہ مطلق عبودیت انسانی مقامات کو حاصل کرنے اور راہ الٰہی کو طے کرنے کا بے نظیر ذریعہ ہے[۱]۔ علامہ شہید مرتضی مطہری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ماننا ہے کہ ایک معنوی انسان میں درج ذیل تین اصول کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ توحید افعالی، صفاتی اور ذاتی

۲۔ کسی بھی کام کو غیر خدا کے لئے انجام نہ دے بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کے حضور میں محسوس کرتا رہے۔

۳۔ خدا کو اس کائنات کا مالک اور قادر سمجھے جس نے پوری ہستی کو عدالت اور حکمت کے پیمانہ پر خلق کیا ہے۔

قرآنی معنویت کی روح و روان بندگی، خدا کی عبودیت اور خدا کی یاد ہے۔ حقیقت میں عبودیت معنویت کو قدرتمند بنانے اور مترقی بنانے میں نہایت مددگار ہے، عبودیت کے ذریعہ معنویت اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ اس میں عقیدہ، اخلاق اور انسانی کردار شامل ہو جاتے ہیں۔ علامہ شہید مطہری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: عبادت کے معنوی، اخلاقی اور سماجی آثار سب کے سب ایک چیز میں جمع ہوتے ہیں اور وہ حق کی یاد اور اس کے غیر کو بھلا دینا ہے۔

معنویت کے آثار

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج کا انسان اپنی بھرپور ترقی کے ساتھ مشکلات اور مصائب کی گتھیوں میں الجھ کر چین و سکون کو کھو بیٹھا ہے اور اسے طرح طرح کے آلام کا سامنا ہے۔ ابھی تک ہم نے

۱۔ رودگر، محمد، معنویت گرایی در قرآن

معنویت کے جو اصول و قوانین اور پیچ و خم بتائے ہیں، وہ حقیقت میں آج کے انسانوں کے درد والم کی بہترین دوا ہے۔ اگر اس موضوع کو بنیادی طور پر مورد تحقیق قرار دیا جائے تو بڑے بڑے لاینحل مسائل بآسانی حل ہو سکتے ہیں اگرچہ اس مقصد تک رسائی کے لئے مستقل کتاب اور ہمت کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں پر معنویت کے بعض آثار کو فہرست وار بتاتے ہیں:

۱۔ جسم اور جان کی سلامتی: بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے: تمہارے جسمانی آلام اور امراض کی بہترین دوا تقویٰ اور معنویت ہے۔

۲۔ قرآنی معنویت کے ذریعہ خوف ختم ہوتا ہے اور حقیقت میں وہ مومن کی پناہگاہ اور اس کا سکون ہے۔

۳۔ معنویت کے ذریعہ انسان ان تمام چیزوں کے سلسلہ میں معلومات حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لئے مفید یا نقصان دہ ہیں۔

۴۔ انسان کی مادی اور معنوی زندگی کو ہدفمند بناتا ہے اور اس کی زندگی کو غم واندوہ سے عاری چین و سکون سے بھر دیتا ہے۔ اسی طرح معنویت کے ذریعہ اس مادی کائنات میں زندگی کو خوشگوار، پسندیدہ اور عفو و بخشش سے بھرپور بنایا جاسکتا ہے۔

۵۔ انسان کی جسمانی اور نفسیاتی تنہائی کا علاج اور اس کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ عالم و ہستی سے متعلق انسانی ذہن کے متلاطم سوالوں کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

۷۔ فردی و اجتماعی زندگی بلکہ تمام شعبہ ہائے حیات میں اخلاق اور اخلاقیات کی پشت پناہی کرنا۔

۸۔ پیچیدہ اور لاینحل مسائل کو معنویت کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔

۹۔ زندگی اور اس کے پیچ و خم سے راضی اور خوش و خرم رہا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ موت اور موت کے بعد کے مسائل کے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔

۱۱۔ دوستی، محبت اور اپنے جیسے انسانوں سے محبت اور ان کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۱۲۔ ہم عقیدہ لوگوں سے مدد ملتی ہے اور جو لوگ معنویت کے شیدا ہیں ان کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

۱۳۔ عزت نفس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس بات پر ایمان رکھنا کہ خدا قادر مطلق ہے اس غیر خدا کے سامنے ہر گز جھکنے نہیں دیگا۔

۱۴۔ سعادت اور امید کی نعمت سے مالا مال ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں چیزیں صراط مستقیم میں سفر کے لئے زاد راہ ہیں۔

۱۵۔ روحی توازن حاصل ہوتا ہے اس لئے کہ صحیح اور بہترین فیصلہ کے لئے ایک محرک اور عامل ہے۔

۱۶۔ روحانی قید و بند سے آزادی ملتی ہے اور دنیوی و مادی تعلقات سے خلاصی حاصل ہوتی ہے۔

۱۷۔ مادی مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں نفسیاتی اور روحانی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

۱۸۔ انسان کے وجود میں بیٹھے ہوئے باطل اور بے بنیاد عقائد اور رسومات ختم ہو جاتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے جو موارد گنوائے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معنویت کے بس اتنے ہی آثار ہیں اور اس کے علاوہ معنویت کا کوئی فائدہ نہیں ہے یا ان میں شباہت پائی جاتی ہے اور اس لحاظ سے اس کے آثار کم ہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ تمام موارد اپنے اندر طولانی بحثوں کے حامل ہیں اور ہر ایک کو جداگانہ طور پر معرض تفسیر و تشریح میں رکھا جاسکتا ہے، مذکورہ موارد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دین اور معنویت کے ذریعہ سکون واطمینان کی نعمت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اصلی بات یہ ہے کہ دین اور عرفان جس انسان کو جس قدر بھی میسر ہو وہ اسی حد تک اس کے فوائد اور آثار سے بہرہ مند ہوتا ہے اور اسے چین و سکون نصیب ہوتا ہے مگر یہ کہ انسان قلبی طور پر سست عقیدہ کا مالک ہو اور اس کے آثار کو ملاحظہ نہ کرسکے[1]۔

آخری بات

ایک معنوی زندگی کے ذریعہ ایک نئی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے اور انسان کی باطنی زندگی پروان چڑھتی ہے۔ علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: باطنی سیر اور معنوی زندگی اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس لئے کہ معنوی مقامات اور باطنی کمالات اس طبیعت اور ظاہری زندگی سے الگ ایک پوشیدہ اور باطنی حقیقت کا نام ہے اور عالم باطن حیات معنوی کی زیست گاہ ہے جو ایک واقعی کائنات اور مادی کائنات سے کہیں زیادہ وسیع و عریض اور حقیقت کے اعتبار سے بالاترین درجہ کی مالک ہے۔ معنوی مقامات انسان کی واقعی زندگی کی ضامن اور اس کی حامل ہے، اور ہرگز اس کی حقیقت مجازی، وضعی اور سماجی گٹھ بندھن کا نتیجہ نہیں ہے۔

۱۔ کیانی محمد حسین، جایگاہ آرامش در عرفان و معنویت گرایی جدید، کتاب نقد، ش ۴۵، ص ۲۱۱۔ ۲۱۲

انسانی اعمال اور کردار کے درمیان رابطہ، اسی طرح اس کے نفسانی حالات اور ملکات کے درمیان رابطہ، اسی طرح مذکورہ حالات اور ملکات کے درمیان رابطہ، نیز باطنی منازل اور مقامات کے درمیان رابطہ اسی طرح وہ باطنی مقامات اور مراحل اور وہ عوامل جو مذکورہ مراحل میں موجود ہیں، وہ سب کے سب حقیقی وجود کے مالک ہیں۔ ان کا وجود واقعی اور مادی وطبیعت کی حکومت وسلطنت سے باہر ہے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ معنوی زندگی اور قیامت کی معرفت، وہ خواہ جس شکل وصورت میں میسر ہو، عالم معنا کی اصالت پر قائم ودائم ہے[۱]۔

علامہ شہید مرتضی مطہری علیہ الرحمہ کا بھی ماننا ہے کہ انسان ایک ایسے نفس کا مالک ہے جس کے متعدد رخ ہیں۔ اس کی ایک صورت مادی ہے جس کے ذریعہ مادی لذتیں اور ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور اس کی دوسری صورت عالی مرتبت ہے جس کے ذریعہ معنوی لذت اور اہم ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ پس انسان کی مادی اور حیوانی ضروریات اور اس کی مادی صورت پر اکتفا کرنا نیز اس کی حقیقی وعالی صورت اور حقیقت سے غفلت کرنا باعث ہوتا ہے کہ انسان کی محبت اور اس کی معرفت مادیات اور فانی دنیا میں سرگرم ہو جائے اور اس کی الٰہی زندگی معنویت اور معرفت سے خالی ہو جائے۔ ہدف کا نہ ہونا اور معنویت سے خالی ہونا حقیقت میں تمام رنج وغم اور مصائب وآلام کا سرچشمہ ہے اور اسی وجہ سے فردی واجتماعی خرابیاں وجود میں آتی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اسی حقیقت کو بہت ہی خوبصورت پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں: راس کل خطیئۃ حب الدنیا ؛ہر برائی کی جڑ دنیا سے محبت ہے[۲]۔

دین یعنی زندگی کا جامع وکامل دستور العمل جو ایک طرف ہمیں مقصد اور مراد کی طرف رہنمائی کرے اور دوسری طرف ہمیں اس مقصد کو پانے کے لئے صحیح راستہ دکھائے اور ان تمام پیچ وخم اور تنگ وتاریک راہوں میں جہاں عقل ومنطق کو رسائی حاصل نہیں ہے، وہاں بھی انسان کی مددگار ہو۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ دین کے شفابخش نسخہ کے ذریعہ جسے ہم نے معنویت کا نام دیا ہے، نیز انسانی حیات کا مقصد اور اس کی واقعی مراد کی تشخیص، اسی طرح ان راہوں کی کھوج جو اس راہ میں مقصد کی جانب رہنمائی کرسکتے

۱۔ طباطبائی، محمد حسین، معنویت تشیع منقول از مصباح علی، تحقیق مفہومی معنویت پیشین، ص۳۱و۳۲

۲۔ مطہری، مرتضی، امامت ورہبری، ص ۳۲

ہیں ، ہم اپنی خلقت کے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں اور اس راہ میں دین کی اطاعت کامیابی کا راز ہے اسی لئے دین اور معنویت کے درمیان رابطہ اٹوٹ ہے بلکہ دین اور معنویت ایک دوسرے سے اس قدر عجین ہیں کہ دین کے بغیر معنویت اور معنویت کے بغیر دین بے معنی ہیں اور جب دونوں اکٹھا ہوتے ہیں تو اکسیر حیات بنتے ہیں۔

منابع و مآخذ

- ❖ ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ۱۴۰۵
- ❖ آمدی عبدالواحد، شرح غرر الحکم ودرالکلم، ج۱، انتشارات دانشگاہ تہران، تہران
- ❖ جوادی آملی عبداللہ، تفسیر تسنیم، ج۲، نشر اسراء، قم، ۱۳۷۹
- ❖ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر انسان بہ انسان، مرکز نشر اسراء، قم، ۱۳۸۴
- ❖ رود گر محمد جواد، معنویت گرایی در قرآن، فصلنامہ علمی پژوہشی علوم اسلامی، سال چہارم، شمارہ ۱۴، تابستان ۱۳۸۸
- ❖ طباطبائی محمد حسین، تفسیر المیزان، دفتر انتشارات اسلامی، ج۹، قم، ۱۳۸۴
- ❖ طباطبائی محمد حسین، شیعہ، موسسہ پژوہشی حکمت و فلسفہ ایران، تہران، ۱۳۸۲
- ❖ فرہنگستان علوم پزشکی، جستاری در سلامت معنوی، مجموعہ مقالات، ۱۳۸۹
- ❖ کیانی محمد حسین، جایگاہ آرامش در عرفان و معنویت گرایی جدید، کتاب نقد، ش ۴۵
- ❖ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، دار احیاء التراث العربی، ج۱، بیروت
- ❖ مرزبند رحمت اللہ، زکوی علی اصغر، شاخص ہای سلامت معنوی از منظر آموزہ ہای وحیانی، فصلنامہ اخلاق پزشکی، سال ۶، شمارہ ۲۰، تابستان ۱۳۹۱۔
- ❖ مصباح، علی واکاوی مفہومی معنویت و مسئلہ معنا، فصلنامہ اخلاق پزشکی، سال ۴، شمارہ ۱۴، زمستان ۱۳۸۹
- ❖ مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، انتشارات صدرا، تہران، ۱۳۸۳
- ❖ مطہری مرتضی، امامت و رہبری، انتشارات صدرا

روحانیت وسکون،
دکھی دنیا کے لئے ادیان کا تحفہ

مؤلف: ڈاکٹر محمد جواد صاحبی
مترجم: مولانا منہال حسین خیرآبادی

معنویت سے متعلق مختلف آراء و نظریات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا اصل مفہوم دنیا کے ہر انسان کی نظر میں مشترک ہے۔ معنوی نگاہ حقیقت میں ایک ایسے فہم و شعور کا نام ہے جو دنیا کی مادیات کی بندشوں سے پرے اور الفاظ و جملات کی ظاہری اسارت اور قید و بند سے آزاد ہو کر عالم باطن اور اس کائنات کی ناپید اور نظروں سے اوجھل تہ بہ تہ دنیا میں سیر کرتی ہے، کائنات کی ناگفتہ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے جلوؤں کی کھوج کرتی ہے۔ انسان کے ایسے نفسانی حالات جن کی تعداد مخلوقات عالم کی تعداد سے کم نہیں ہے، جو کبھی متعالی امور سے وابستہ ہوتے ہیں اور کبھی اس کائنات کے پیدا کرنے والے سے اپنے بندھن جوڑتے ہیں اور اس کی مدد سے بے نہایت سیر کا آغاز کرتے ہیں۔

پس اب یہ بات بالکل کہی جاسکتی ہے کہ ایک معنوی اور روحانی کائنات حقیقت میں امور قدسی کا ایک نایاب مجموعہ اور عرفانی و باطنی اور اخلاقی اقدار کی حامل ہے جس میں اس مادی اور ظاہری دنیا کی بندشیں نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ حقیقی معنوں میں آزاد ہوتی ہے۔

یہ مادی دنیا اپنے متنوع نقش و نگار کے باوجود تھکا دینے والی ہے۔ اپنی ناموزوں چال ڈھال، اسی طرح اس مادی دنیا کی طبیعی ناخوشگواریوں کے ساتھ انسان کا میل جول، اس پر ستم بالائے ستم انسان کی روحی و روانی اور جسمانی کمزوری، ناتوانی اور درد و رنج اس میں خوف و وحشت کو کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں، اسی لئے اس مادی دنیا کے ایسے نقصانات سے بچنے کے لئے اس کی مادیت کی اسارت سے نجات اور آزادی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

انسان نے اپنے تجربوں کے آئینہ میں اس راز کو معلوم کرلیا ہے کہ ہماری مادی دنیا اپنی تمام مشکلات، مصائب اور نوع بہ نوع قید و بند کے ساتھ ناپائیدار اور ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے۔اس حقیقت کے علم کے بعد وہ دائم اور مسلسل ایک لامحدود اور مشکلات سے عاری کائنات کی تلاش میں سر گرم رہتا ہے۔ اس کی یہ سر گرمی اور نئی دنیا کی کھوج حقیقت میں اسی مادی دنیا کے مادی اسباب و علل کے ذریعہ انجام پاتی ہے پس یہ بات بالکل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ مادی دنیا جاودانی حیات کی کھوج اور ایک بے انتہا کائنات کی تلاش میں ابزار اور وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ دین کے سربراہوں کی تعبیر میں کہا جائے تو اسے الدنیا مزرعة الآخرة کہا جاسکتا ہے۔

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ دین اگر معنویت سے خالی ہو تو گرچہ اس کی حالت مغز کے مقابلے میں چھلکے کی ہے لیکن پھر بھی اسے ایک دین کہا جاسکتا ہے جس کے احکام اور مناسک بے جان اور خشک ہیں، عقیدہ پر جمود طاری ہےاور اس پر ظاہری خد و خال کا چڑھا وا ہوتا ہے۔ایسے دین معقولات سے لاپرواہ اور زیادہ تر خرافات کے دامن میں جنم لیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی مادیت سے ناطہ جوڑ لیتے ہیں جس کے باعث، تعصب، خشونت اور تباہی و بربادی کا باعث بنتے ہیں، ہر طرف شر و فساد پھیلاتے ہیں اور اپنے پیروکاروں کو اس امر کی جانب ترغیب دلاتے ہیں۔

پس وہ زمانہ جس میں مادی علم اور عقل، ٹکنالوجی اور حیرت انگیز ترقی سر چڑھ کر بول رہی ہو، ایسے ماحول میں معنویت سے فرار کے باعث قدرت، دولت، روحی و روانی اور اخلاقی بحران وجود میں آتا ہے اور انسان لاعلاج امراض اور مشکلات کا شکار ہوجاتا ہے، لہٰذا ایسے مصائب و مشکلات سے فرار اور نجات پانے کے لئے ایسے دور میں معنویت کا دامن تھامے بغیر خلاصی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اور اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ادیان عالم کے درمیان معنوی مشترکات کو تلاش کرنا ضروری ہے تاکہ انسان معنویت کا دامن تھامنے کے بعد زیادہ سے زیادہ سکون و اطمینان حاصل کرسکے اور ایک پر سکون زندگی گذار سکے۔

صنعتی دنیا کا بحران

آج کی صنعتی دنیا اور ٹکنالوجی کا دور مادی اور بے جان ہے۔ایسی دنیا میں انسان نشو و نما اور تولید و پیداوار کے لئے کوشاں رہتا ہے تاکہ وہ بھی دور حاضر کے متمدن دنیا کی طاقت و ثروت اور ٹکنالوجی میں اپنا حصہ بنا سکے۔ جن دانشوروں نے ایسے عظیم تمدن اور تہذیب کی سنگ بنیاد ڈالی تھی اور اختراعات اور

ایجادات کی بھرمار کردی تھی وہ اپنی کاوشوں کے ذریعہ بشر کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور اسے چین و سکون پہچانا چاہتے تھے، لیکن اس دنیا کی بڑھتی ہوئی رفتار، مادی ترقیات اور ٹکنالوجی انسانوں کے لئے بے شمار مشکلات اور مصائب کا بھی باعث بنی، جس کے باعث انسانوں کی زندگی میں عظیم مشکلات چیلنج بنی ہوئی ہیں اور انسانی سماج کوان سے شدید خطرہ لاحق ہے[1]۔ معنویت کا بحران ، نفسیاتی بحران ، ماحولیات کا بحران، ناامنی کا بحران، ایسی مشکلات ہیں جو آج کی فردی و اجتماعی زندگی کے لئے چیلنج ہیں اور ان کے چین و سکون کو تباہ و برباد کردیا ہے ۔ آج کے انسانوں کی مادی اور صنعتی نگاہیں حقیقت میں منفعت طلب ہیں جو ہر سو اپنے فائدے کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسی لئے آج کی متمدن زندگی طبیعت سے قداست کو ختم کرنے کے بعد اس کے لئے کسی احترام کی قائل نہیں ہے اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ روئے زمین کے جنگلات، دشت و دریا اور سمندر ہوس ران انسانوں کی تاخت و تاز کا میدان بن چکا ہے، جس کے باعث نہ تنہا طبیعت بے جان اور بے روح ہوچکی ہے بلکہ اس کے فوائد انسانوں کو کم پہنچنے لگے ہیں۔ روز بہ روز زمین کی تہوں میں نئی نئی کھوج ، اختراعات اور صنعتی دنیاکے بڑھتے ہوئے قدم زہریلی گیس (گرین ہاؤس گیس) کی پیدائش کا باعث بن رہی ہے جس کے باعث دنیا کی محافظ اوزون پرت نازک اور نابودی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ زمین کی بڑھتی ہوئی حرارت، جنگلوں میں آگ زنی، سبزہ جات وغیرہ میں کمی، پانی کا گرم ہونا، زیر زمین پانی میں قلّت ، سمندر میں مچھلیوں کی تباہی و بربادی، لاعلاج جسمانی امراض کی بڑھتی ہوئی شرح اور روز بہ روز نت نئے نفسیاتی امراض حقیقت میں انسانوں کی طبیعت کے حق میں زیادتی کی ایک نشانی اور دلیل ہے گویا انسان اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کھلاڑی مار رہا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ موجودہ دور میں انسانوں کی مشکلات خود اسی کی ایجاد ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہوں کہ آج کا انسانی بحران اور المیہ مصنوعی اور بناوٹی ہے جو روز بہ روز سخت اور فراگیر ہوتا جارہا ہے اور پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے اور اس زمین کی حیات داؤں پر لگ چکی ہے، اس کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ اس مشکل کے واقعی اسباب و علل کو تلاش کرنے اور ان سے گلوخلاصی کا راہ حل پیش کرنے سے گریز کرتے ہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مغربی سماج میں طبیعت کی اقدار کشی جو نہایت آہستہ آہستہ انجام پائی ہے، اسے مد نظر قرار دینے ، عقل محوری یا انسان محوری جو مغربی سماج میں علمی انقلاب کے

۱۔ مزید معلومات کے لئے رجوع کریں؛ بحران دنیای متجدد، ترجمہ سید ضیاء الدین، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۴۹ش

رونما ہونے کا باعث ہوا، وہ اس علم کے ذریعہ طبیعت کی مدد کے بدلے اس پر اپنا قبضہ جمانے کی فکر میں پڑ گیا تاکہ اس پر حکمرانی کر سکے، اس کے ساتھ من مانی کر سکے۔ اسے حکمت اور تدبیر الٰہی کو اجاگر کرنے کی کوئی فکر نہ تھی بلکہ اس نے اپنی توانائیوں اور باطنی صلاحیتوں کو اپنی مادی دنیا کو سجانے، مال و دولت کو اکٹھا کرنے اور اپنی قدرت کو اجاگر کرنے کے لئے استعمال کیا تھا[1]۔

موجودہ تہذیب کی بنیاد ڈالنے والوں نے اگر اپنے علمی انقلاب کے ذریعہ انسانوں کی کرامت کو ختم کر دیا ہے اور اسے شان و منزلت کے اعتبار سے دوسری مخلوقات کی صف میں کھڑا کر دیا ہے تو وہیں انہوں نے اپنی ٹکنالوجی اور صنعتی انقلاب کے ذریعہ اپنے اہداف و مقاصد کے حصول کے لئے اسے ایک مہرہ بنا دیا ہے جس کے دوش پر وہ صنعت کی مشین کو چلانا چاہتا ہے۔

طبیعت سے ماورائے طبیعت کی جانب سفر

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کائنات اور طبیعت میں ایک خاص نظم و نسق پایا جاتا ہے اور ان کے درمیان پیچیدہ اور اٹوٹ ہم آہنگی ہے، اس طبیعت کے جنگل، بیابان، دشت و صحرا، دریا اور ندی نالے سبھی ایک عظیم ہستی سے معنوی ناطہ جوڑے ہوئے ہیں جو حقیقت میں اس پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے؛ اسی لئے اگر دیکھا جائے تو اس کائنات کی ہر شے میں معنویت پائی جاتی ہے، کوئی بھی شے اس کائنات کی بیہودہ خلق نہیں ہوئی ہے اور ہماری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں ازلی و ابدی اور واجب الوجود کا ایک معمولی جلوہ اور اس کے جلال و جمال کا مظہر ہے۔ اسی حقیقت کو مشہور اور نامور شاعر باباطاہر ہمدانی اپنے خوبصورت اشعار میں پیش کرتے ہیں:

به دریا بنگرم دریا تو بینم — به صحرا بنگرم صحرا تو بینم
به هر جا بنگرم کوه و در و دشت — نشان از روی زیبای تو بینم

کس نے ایسی خوبصورت اور رنگین کائنات بنائی ہے اور اسے حیرت انگیز نظم و نسق کے ذریعہ آپس میں جوڑا ہے؟ اس کا اس طبیعت سے کیا واسطہ ہے اور کیونکر وہ ان سے رابطہ میں ہے؟ انسان اس طبیعت کا ایک حصہ ہے لہٰذا خالق ہستی نے اس سے اپنا رابطہ کیونکر قائم کیا ہے؟ اس کی تمام مخلوقات پر افضلیت کے پیش

۱۔ سید حسین نصر، انسان و طبیعت، ص ۱۲

نظر خالق کائنات اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے؟ کیا ایک انسان اپنے خالق اور معبود سے معنوی اور ہمیشگی رابطہ جوڑ سکتا ہے؟

انسان کے وجود میں خدا کی تلاش کی نہفتہ فطرت ہمیشہ ایک عالی و متعالی اور ہمیشگی وجود کی جستجو میں سر گرم رہتی ہے۔ انسان کی یہ باطنی کیفیت جو آیہ شریفہ فِطرَتَ اللّٰہِ الّتی فَطَرَ النّاسَ عَلَیہا[1] کی کامل مصداق ہے، اسے ایک ایسی نعمت سے نوازتی ہے جس کی مدد سے وہ ظاہری الفاظ، اشیاء کے قید و بند سے آزاد اور مادی دنیا سے رہا ہو کر ماوراء کی سیر کرتی ہے۔ باطنی کائنات اور اس ہستی کی نہفتہ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے اور اس طرح اس ہستی کے دیدہ زیب مناظر اور پر اسرار باطنی کائنات کا سفر کرتی ہے۔ انسان کی یہ نفسانی کیفیت جس کے درجات خلائق عالم کی تعداد کے برابر ہیں، اس کائنات کی مدبر و حکیم پروردگار سے ناطہ جوڑتی ہے اور اس سے اپنا رشتہ جوڑ کر بے نہایت بن جاتی ہے اور اس طرح بے کرانوں کا سفر شروع کرتی ہے۔

پس اس دنیا میں جو انسان اپنی اصالت سے دور ہو جاتا ہے وہ باطنی طور پر اپنے سرچشمہ اور مبدا سے دوبارہ ملنے اور اسے حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ بے چین اور سر گرداں رہتا ہے، اسی لئے وہ اپنی مادی دنیا میں اس کی تمام تر زیبائیوں، خود آرائیوں، دیدہ زیب مناظر اور انواع واقسام کی سر گرمیوں کے باوجود باطنی طور پر خستگی اور تھکاوٹ کا احساس کرتا ہے۔ وہ اپنی مادی دنیا میں کوشش کرتا ہے اور ہاتھ پیر مارتا ہے اور اس راہ میں مال و دولت اور نام و شہرت بھی کسب کرتا ہے پھر بھی سیر نہیں ہوتا بلکہ شدید تھکاوٹ کا احساس کرتا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے گمشدہ کی تلاش میں در در کی خاک چھانتا ہے فقط اس امید پر کہ شاید اسے کہیں اس کا گمشدہ مل جائے، اسے حقیقی منزل کا راستہ مل جائے، مقصود کی کوئی خبر موصول ہو جائے۔ انسان کو اس مادی دنیا میں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اس کی مادی زندگی تمام تر سہولیات اور انواع واقسام کے مصائب کے باوجود ہر گز باقی رہنے والی نہیں ہے بلکہ اسے ایک دن نابود ہونا ہے، اسی لئے وہ اپنی جاودانی زندگی کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی جستجو میں در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اسے یہ بھی یہ معلوم ہے کہ اس کا گمشدہ انہیں مادی ابزار و وسائل اور طبیعی طریقوں سے قابل دسترسی ہے۔ یہ مادی وسائل اور سہولیات جو اس کے مادی جسم اور ظاہری زندگی کو سجائے اور سنوارے ہوئے ہیں وہی اسے معنوی زندگی سے مالامال کر سکتے ہیں، اسی لئے یہ بات بیان کی گئی ہے: الدنیا مزرعة الآخرة، یہاں پر یہ بات کہی

۱۔ سورہ روم، ۳۰

جا سکتی ہے کہ اس زاویہ نظر سے ہندومذہب میں کارما کا مفہوم مذکورہ حدیث کے مفہوم سے بہت نزدیک ہے لہٰذا یہ محاورہ جو بوئے گے وہی کاٹوگے ایک ایسی تعلیم ہے جسے محنت ومشقت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس راہ میں خدا کے انبیاء، صالح بندے اور اولیاء کی رہنمائی کارفرما ہو جائے تو پھر چشم زدن میں اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور انسان اپنے مبدا سے وصل ہو سکتا ہے۔

البتہ یہ بات دھیان میں بٹھانے والی ہے کہ مادیت اور معنویت کا رابطہ دو طرفہ ہے، جیسا کہ ہماری مادی کائنات نہایت پر سرار اور پیچیدہ رمز وراز کی مالک ہے جو اپنے اندر ایک معنوی کائنات کی خبر دیتی ہے، اس کے دامن میں موجودہ طبیعت دقیق نظم ونسق کی مالک اور ظاہری وباطنی اعتبار سے قرینہ سے سجائی اور سنواری گئی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہندومذہب میں دھرما کے مفہوم سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کائنات کی تمام اشیاء کا آپس میں میل جول اور اٹوٹ بندھن جس کا ایک حصہ خود انسان بھی ہے، جہان کثرت میں یکجہتی کی ایک بہترین نشانی ہے جسے عرفانی تجربے کے بغیر سمجھنا اور اس کی حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ ہندوئیزم میں ادویتا کا مفہوم اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں توحید مطلق کے درمیان جزئی اختلافات کے باوجود باری تعالیٰ کی نسبت مذکورہ دونوں مفاہیم کی قرابت صاف طور پر واضح ہے اس لئے کہ دونوں ایک لامتناہی اور نامحدود وجود کے سلسلہ میں متفق نظریہ کے قائل ہیں۔

عالم معنا کی سیر

عالم باطن میں معنویات کی تجلی مراقبہ، محاسبہ اور سیر وسلوک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان کی کرامت، شرافت اور بزرگی کے مقدمات فراہم ہوتے ہیں۔ معنویت یعنی باطن کو کھنگالنا اور اسے مادی خواہشات سے پاک وصاف کرنا جو انسانی ذہن وشعور پر قبضہ جمائے ہوتے ہیں۔ معنویت یعنی مادہ سے گذر جانا اور کنہ وجود تک سفر کرنا۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ باطن کو اس طرح پاک وصاف کرنا اور روحی کمال کے لئے تگ ودو کرنا سماجی تعلقات کو بہتر بناتا ہے۔

تمام ادیان آسمانی کا فرض اور ان کی رسالت انسانوں کو معنویت سے جوڑنا اور اس کے آثار وبرکات سے انہیں بہرہ مند کرانا ہے۔اگر کوئی دین اپنے ماننے والوں کو ایسا راستہ نہ دکھاسکے تو اس نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی ہے اس لئے کہ جس دین میں معنویت نہیں ہوتی وہ مغز کے مقابلے میں چھلکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے اعمال واحکام خشک وبے جان، اس کا ایمان سست اور حقیقت سے خالی ہوگا اور

ایک وہ ایسا دین ہوگا جس میں معقولات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، ایسے دین اکثر بدعت ہوتے ہیں اور ان کا گہوارہ بھی مادیت ہوا کرتی ہے، ایسے مذاہب شر و فساد، تعصب، جھگڑا لڑائی اور زمین و زمان کو مصیبتوں سے دوچار کرتے ہیں۔

آج کے دور میں اگر ہم مذہب کے نام پر قتل عام، تباہی و بربادی، کینہ و نفرت اور جنگ و خونریزی دیکھ رہے ہیں تو یہ سب کچھ ظاہر پرستی اور دین کی ذمہ داریوں کو نظرانداز کرنے کی بناپر ہے۔ جرمنی کے شہر کولن میں بے پناہ ناامنی اور جرم و جنایت، برما میں بودائیوں کا متعصبانہ رویہ، عراق اور شام میں داعش کی قتل و غارتگری اور دنیا کے دیگر ممالک میں جہاں دین کے نام پر ناروا سلوک کیا جارہا ہے وہ سب کچھ ادیان عالم کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ جیسا کہ ہندو مذہب میں بھگوت گیتا کا پیغام سالک کے لئے ملاحظہ کریں: تو جو اس غم خانہ یعنی دنیا میں آیا ہے، صرف میری عبادت کر اور میرے غیر کی محبت سے اپنے دل کو خالی کرلے، مجھ پر پورا ایمان رکھ، میری تسبیح و تقدیس کر، میرا سجدہ کر اور کمال مطلوب مجھے سمجھ تاکہ تو مجھ تک پہنچ سکے[۱]۔

سالک کا امیدوار رہنا، کسی قید و شرط کے بغیر عشق کرنا، خودی سے آزاد ہونا، خدا پر پورا ایمان رکھنا، ساحل نجات تک پہنچنے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اور عشق کا نہائی مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اس دنیا میں نجات سے ہمکنار ہو۔

راہ خدا کے سالک سے بس توقع یہ ہے کہ وہ اس راستہ کو کسی سزا و عقوبت کے خوف اور کسی جزا سے دلبستگی کے بغیر صرف اور صرف عشق الٰہی میں طے کرے۔ خالق ہستی اور قادر مطلق خدا کی حمد و ثنا اور اس کی عبادت حقیقت میں معنوی کمال ہے، اسی لئے قرآن کریم فرماتا ہے: وما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون ؛ہم نے جن وانس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ ہماری عبادت کریں۔

اس بندگی کی عالی ترین مثال امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نورانی کلام میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ”الھی ما عبدتک خوفا من نارک و لا طمعا فی جنتک بل وجدتک

۱۔ بھگوت گیتا، تا،۹: ۳۴،۲۹، درسنامہ ادیان شرقی، علی موحدیان عطار، محمد علی رستمیان، ص ۲۶

اهلا للعبادة فعبدتك" خدایا! میں تیری عبادت تیری آگ کے خوف سے نہیں کرتا اور نہ ہی تیری جنت کی طمع میں کرتا ہوں بلکہ اس لئے تیری عبادت کرتا ہوں کہ تجھے اس عبادت کے لائق پایا ہے[1]۔

عبادت ایک بے جان اور بے لذت وظیفہ کا نام نہیں ہے اسی طرح کسی تحفہ اور جزا کو حاصل کرنے کے لئے کسی فریضہ کا بھی نام نہیں ہے بلکہ عبادت ایک عشق ہے جو عاشق کی حرارت سے وجود میں آتی ہے اور اسے خالق کردگار کی بارگاہ میں سربسجود ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی لئے ایک مقام پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "ان قوما عبدوا الله رغبة فتلك عبادة التجار و ان قوما عبدوا الله رهبة فتلك عبادة العبيد و ان قوما عبدوا الله شكرا فتلك عبادة الاحرار"؛ کچھ لوگ جزا کی لالچ میں خدا کی عبادت کرتے ہیں، یہ تاجروں کی عبادت ہے، کچھ لوگ اس کی عبادت جہنم کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں یہ غلاموں کی عبادت ہے، کچھ لوگ شکرانہ میں اس کی عبادت کرتے ہیں، یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے[2]۔

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے: "افضل الناس من عشق العبادة"؛ لوگوں میں بہترین وہ ہے جسے عبادت سے عشق ہو۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: "طوبى لمن عشق العبادة"؛ خوش نصیب ہے وہ شخص جسے عبادت سے عشق ہو۔

عبادت حقیقت میں معنوی سیر و سفر کا بہترین راستہ ہے جس کے ذریعہ محبوب اور معشوق تک رسائی میسر ہوتی ہے، اسی لئے عرفاء اور حکماء نے خالق مطلق اور موجود ابدی و سرمدی کی جانب سیر و سفر کے لئے چار قسم کے سفر بیان فرمائے ہیں:

۱۔ سفر من الخلق الی الحق

۲۔ سفر بالحق فی الحق

۳۔ سفر من الحق الی الخلق بالحق

۱۔ بحار الانوار، ج۴۱، ص ۱۴

۲۔ نہج البلاغہ، ص ۵۱۰، حکمت نمبر ۲۳۷

۴۔سفر فی الخلق با لحق

ا۔ سفر من الخلق الی الحق: ایک ایسا سفر ہے جس میں سالک اور خالق ہستی کے درمیان ہر قسم کے ظلمانی ونورانی حجاب برطرف ہوجاتے ہیں۔

۲۔ سفر بالحق فی الحق: یہ ایک ایسا سفر ہے جس میں سالک اپنی ذات سے کمالات کی جانب سیر شروع کرتا ہے، منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہتا ہے اور ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے وہ تمام کمالات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہاں پر وہ ذات وصفات اور افعال کو یکجا حق میں فانی دیکھتا ہے، پس حق کے سوانہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے۔

۳۔ سفر من الحق الی الخلق بالحق: یہ ایک ایسا سفر ہے جس میں سالک حق سے خلق کی جانب اپنی سیر کو شروع کرتا ہے۔ اس کے افعال کو یکے بعد دیگرے دیکھتا ہے۔اس کے جمال کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس راہ میں وہ پوری طرح حق میں فنا ہوجاتا ہے۔اس سفر میں سالک کی حالت زایل ہوجاتی ہے اور حالت صحو پوری طرح اسے حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ اس سفر میں جبروت وملکوت اور ناسوت کے جملہ عوالم کی سیر کرتا ہے ۔اس کی تمام مخلوقات کا بھی شہود کرتا ہے[1]۔

بعض مسلمان عرفاء جنہوں نے مذکورہ سیر انجام دی ہے اور عرفانی سیر و سلوک میں ایک عمر گذاری ہے،انہوں نے حق تعالیٰ کی معرفت کی راہ میں معنوی سیر وسلوک کا عملی طور پر بروئے کارلانا لازم گردانا ہے اور انہوں نے سفارش کی ہے چونکہ سیر و سلوک کی وادی میں اصلی ہدف اور مقصد قرب الٰہی کے مقامات کو حاصل کرنا ہے لہٰذا سالک پر واجب ہے کہ وہ حضرت حق کے جملہ اوامر و نواہی کی پوری طرح پابندی کرے۔

پس یہ بات ذہن میں محفوظ رکھنے والی ہے کہ حضرت حق کے اوامر کی اطاعت جو حقیقت میں ظاہر کی تطہیر ہے، سیر و سلوک کی راہ میں سب سے پہلا قدم مانا جاتا ہے اس لئے کہ اس تطہیر ظاہر کے بغیر ادامہ راہ اور کمال مطلوب تک رسائی غیر ممکن ہے،اصطلاح میں اس مقام کو تجلیہ کہتے ہیں۔

ا۔ صدرالدین، محمد شیرازی، الحکمۃ المتعالیۃ،

جب سالک کے جملہ افعال و کردار شریعت مقدسہ کے احکام سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور وہ پوری طرح شریعت کی پابندی کرنے لگتا ہے تو اس کے بعد نفس کی تربیت کا مرحلہ شروع ہوتا ہے تاکہ حضرت حق کی مرضی کے موافق اس کی تطہیر ہوسکے اور اس کے باطن سے ہر قسم کی اخلاقی آلودگی اور کثافت دور ہو جائے۔ اصطلاح میں اس مقام کو تخلیہ کہتے ہیں۔ سالک جب مذکورہ دو مقامات کو طے کرلیتا ہے تو پوری طرح پاک و صاف اور ہر قسم کی گندگی سے صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔ سالک ظرف وجود کی تطہیر کے بعد اسے نیکیوں سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے، یہیں سے سالک کا سفر حضرت سے لقاء اور اس کے دیدار کی جانب آغاز ہوتا ہے اس لئے کہ اب اس کے راستے سے موانع اور رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں اور نفس سے جہاد میں سرخرو ہو چکا ہے اور اس میں حضرت حق سے ملاقات کی لیاقت پیدا ہو چکی ہے۔ بعض مسلمان عرفاء نے خدا کی جانب سیر اور کمال معنوی تک رسائی کے لئے درج ذیل امور کی رعایت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے:

۱۔ نازیبا عادتوں، غلط رسومات اور تعارفات کو چھوڑنا، تعلق اور وابستگی کو ترک کرنا، بعض سماجی آداب و رسوم سے پرہیز کرنا۔

۲۔ عزم: مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا، سختیوں میں صبر کرنا، خدا پر توکل اور بلاؤں کے مقابلے میں کھڑے ہونا، رکاوٹوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا۔

۳۔ رواداری کرنا: جسمانی طاقت کے مطابق عبادت کے لئے زحمت کرنا اور عبادت کے لئے اس طرح منصوبہ سازی کرنا جس سے نفس کو کراہت محسوس نہ ہوتی ہو۔

۴۔ وفا: خداوند عالم سے جو عہد باندھا ہے اس پر باقی رہنا مخصوصا جب کوئی معصیت جہالت کی بنا پر انجام دیا ہو تو اس پر اظہار پشیمانی کرنا۔

۵۔ ثابت قدم رہنا: سالک پر واجب ہے کہ وہ سلوک کے لئے وہی عبادت اور راستہ اپنائے جسے انجام دینے کی پوری صلاحیت اس میں پائی جاتی ہو، تاکہ اسے انتخاب کرنے کے بعد اس پر باقی رہ سکے۔

۶۔ مراقبہ: راہ سلوک کی حفاظت اور گناہ کی جانب تغییر مسیر سے بچاؤ، نیز وظیفہ کی فراموشی سے حفاظت، غرض کہ سالک پر واجب ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے اعمال کی دیکھ ریکھ کرے۔

۷۔ محاسبہ: چوبیس گھنٹے میں اپنے اعمال و کردار کی حساب رسی کے لئے کوئی وقت معین کرے جیسا کہ بے شمار روایتوں میں ائمہ معصومین علیہم السلام سے وارد ہوا ہے: جو بھی اپنے اعمال کا حساب وکتاب نہ کرتا ہو وہ ہم سے نہیں ہے۔

۸۔ مواخذہ: جب سالک اپنے اعمال میں نفس کی خیانت کو مشاہدہ کرے تو اسے چاہیئے کہ اس کی تادیب کرے اور اسے دوبارہ انجام دینے پر پابندی عائد کرے۔

۹۔ مسارعت: جس کام کو انجام دینے کا عزم کرے اس کو عمل میں لانے کے لئے عجلت کرے اور اسے انجام تک پہنچانے میں عقل وتدبر سے حداکثر کام لے۔

۱۰۔ ارادت: صاحب شریعت سے اپنی ارادت اور محبت کو اس قدر خالص اور پاک و صاف رکھے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی عیب و نقص نہ رہے۔

۱۱۔ آداب اور ادب: ادب کا مطلب ہے اپنے حریم کو سمجھنا اور اس سے تجاوز نہ کرنا، یعنی کسی بھی حال میں سالک سے مزاج عبودیت کے خلاف کوئی عمل سرزد نہ ہو۔

۱۲۔ نیت: سالک کے اعمال کو نیت کے میزان پر تولا جاتا ہے، اسی لئے نیک اعمال کا میزان قلبی خیالات اور باطنی نیت ہے، کمال کے لئے حسن فعلی شرط نہیں ہے بلکہ حسن فاعلی سب سے اہم شرط ہے۔

۱۳۔ صمت: یعنی ایسی خاموشی جو حکمت آمیز ہو پس وہ خاموشی جس میں کوئی حکمت نہ ہو ممدوح نہیں ہے اور اس پرہیز کرنا چاہیئے۔ ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: صمت خدا کے علم وحکمت کا ایک دروازہ ہے[1]۔

صاحب تفسیر المیزان علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: بھوک، کم کھانا، خلوت، سہر، دوام طہارت اور نفی خواطر وہ ابزار اور وسائل ہیں جو کمال کی راہ میں ایک سالک کے لئے بہت ضروری اور لازمی ہیں[2]۔

۱۔ الصمت باب من ابواب الحکمۃ ، ان الصمت یکسب المحبۃ ، انہ دلیل علی کل خیر ۔ (ارشاد القلوب، حسن بن ابی الحسن دیلمی، ج۱، ص ۱۰۲)

۲۔ رسالہ لب اللباب، سید محمد حسین حسینی، تہرانی، ص ۱۰۳

معنوی سلوک میں اسلام اور ہندومذہب کے مشابہ نظریات

انسان کامل کے مقامات تک رسائی کے لئے جو رحمانی فضائل و کمالات سے متصف اور شیطانی و نفسانی رذائل سے مبرا ہوتے ہیں، عرفانی سیر و سلوک اور تہذیب نفس وغیرہ وہ وجہ مشترک ہیں جن میں اسلام اور ہندومذہب کی تعلیمات یکساں نظر آتی ہے اور ان کے درمیان کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی لئے رادھا کرشنا نے ایک معنوی اور سماجی دین کے عنوان سے اسلام کی توصیف کی ہے جس میں ہندومذہب سے کافی مشابہت پائی ہے۔ ان کا کہنا ہے : اسلامی فرقوں کے درمیان تشیع سب سے زیادہ ہندومذہب سے نزدیک ہے۔ ہندومذہب کے عظیم دانشوروں کا ماننا ہے کہ حضرت علیؑ حقیقت میں وشنو کے دسویں اوتار ہیں۔ تصوف "ادویتاویدانتا" سے بہت مشابہ ہے جس میں وحدت الوجود کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور کائنات کو اس کا مظہر سمجھا جاتا ہے جو نور الانوار ہے[۱]۔ داراشکوہ نے ایک کتاب لکھی جس میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ہندومذہب اور اسلام میں فرق صرف اور صرف زبان اور عبارت کا ہے[۲]۔

اگر ہم اس حد تک ہندومذہب اور اسلام کے درمیان مشابہت کو قبول نہ بھی کریں پھر بھی کسی حد تک ان کی مابین مشابہت سے انکار بھی نہیں کرسکتے اور ہر حال میں ان دونوں کے درمیان مشابہت قطعی ہے۔

چار چیزیں یعنی شہود، وحدت، فنا اور بقا ایسی ہیں جن میں اسلام اور ہندومذہب کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ ہندومذہب اور اسلام کے درمیان معنوی مسائل پر بحث و گفتگو اور تفاہم کا راستہ نکالا جاسکتا ہے۔

ہندومذہب میں عرفان کی حقیقت مکاتب عرفانی کی طرح وحدت الوجود اور واجب الوجود کے شہود پر استوار ہے جسے روح مراقبہ اور مکاشفہ کے ذریعہ حاصل کرتی ہے۔ روح اور برہما کا یگانگت ہندومذہب کے عرفان کی بنیاد ہے۔ روح اور برہمن کی یکسانیت عرفان کو انسانیت کا طرفدار پیش کرتی ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق ہندومذہب میں آتما وہی انسانی روح ہے جو اپنی حقیقت یعنی برہما سے وصل ہوتی ہے اور خود اپنی حقیقت میں فانی ہوجاتی ہے[۳]۔

۱۔ ادیان شرق وفکر غرب، رادھا کرشنا، ص ۶۶
۲۔ ایضاً، ص ۶۶ و ۳۶۷
۳۔ تجربہ ھای عرفانی در ادیان، حمید رضا مظاہر سیف، ص ۱۱۰

منابع وماخذ

❖ سید حسین نصر، انسان وطبیعت، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۷۹
❖ سید ضیاء الدین (ترجمہ)، بحران دنیای متجدد، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۴۹ش
❖ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، ج۴۱
❖ نہج البلاغہ، ص ۵۱۰، حکمت نمبر ۲۳۷
❖ صدر الدین، محمد شیرازی، الحکمۃ المتعالیۃ، ،بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۲
❖ حسن بن ابی الحسن دیلمی، ارشاد القلوب، انتشارات رضی، قم، ۱۴۱۲
❖ سید محمد حسین حسینی، تہرانی، رسالہ لب اللباب، نشر علامہ طباطبائی، مشہد، ۱۴۲۶ق
❖ حمید رضا مظاہر سیف، تجربہ ھای عرفانی در ادیان، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۸

ہستی کا تقدس، حکمت اسلامی کے آئینہ میں

مؤلف: ڈاکٹر حمید پارسانیا
مترجم: مولانا منہال حسین خیرآبادی

مقدس ہستی کا تصور حقیقت میں مادی دنیا اور مادی کائنات کے مقابلہ میں مستعمل ہے۔ یہاں پر مادی دنیا سے مراد سیکولرزم پر قائم دنیا ہے جس کے مقابلہ میں جو بھی حقیقت کائنات میں نہفتہ ہے اور ہم اسے مقدس ہستی کا نام دے رہے ہیں، وہ اس مادی کائنات سے قطعی لاتعلق نہیں ہے بلکہ ہر اعتبار سے اس مادی کائنات کی مددگار اور اس کے شانہ بہ شانہ قائم ہے۔

مقدس زاویۂ نظر سے یہ مقدس کائنات حقیقت میں اسی مادی کائنات کے درمیان ہے۔ مقدس کائنات کا وجود کامل و اکمل ہے، ناقص نہیں ہے اور اس کا کمال بھی لامحدود ہے اور اس کی کوئی حد و حصر نہیں ہے۔

اسلامی حکمت کے منابع و مآخذ

مقدس کائنات کے سلسلہ میں عالم اسلام کے مختلف مکاتب کے نظریات مختلف ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی حکمت ایک معرفتی حیثیت کی حامل ہے جس نے اپنی حیات میں مختلف مراحل دیکھے ہیں۔ اسلامی حکمت کی پیدائش اور اس کی تاریخی حیثیت مختلف اسباب و علل کا نتیجہ ہے، ہم یہاں پر ان میں سے صرف بعض امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن کریم اور ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول روایات
۲۔ انسانیت کی عقلی میراث
۳۔ عالم اسلام کے عرفانی مکاشفات
۴۔ متکلمین سے بحث و گفتگو

مسلمان حکماء کے نظریات کو پیش کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ہم یہاں پر سب سے پہلے ہستی اور وجود سے متعلق بعض اصطلاحوں کی توضیح پیش کریں:

لفظ ہستی اور اس کا مفہوم و مصداق: ہستی سے مراد یا لفظ یا مفہوم یا اس کا مصداق ہے۔

اول: لفظ ہستی ایک اعتباری امر ہے جسے مختلف زبانوں میں مختلف لفظوں میں ہستی کے معنی و مفہوم کو بیان کرنے کے لئے وضع کیا جاتا ہے البتہ یہ وہ بات ہے جسے علمی و فلسفی مباحث میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔

دوم: مفہوم ہستی یا مفہوم وجود ایک ذہنی امر کا نام ہے۔

سوم: مصداق ہستی حقیقت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کی حکایت یہ مفہوم کرتا ہے۔

متکلمین کے نزدیک مفہوم ہستی کا لفظی اشتراک

عالم اسلام کے متکلمین کے نزدیک مفہوم ہستی مشترک لفظی ہے یعنی اس مفہوم کے لئے کسی مستقل معنی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی نظر میں وجود اور ہستی جس چیز کے لئے بھی بولا جائے اسی پر دلالت کرتا ہے جیسے کہ جب دروازہ، دیوار، زمین یا آسمان کے موجود ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو پھر ہستی کا اطلاق دروازہ کے علاوہ کسی دوسری چیز پر نہیں ہوتا، دیوار کا اطلاق کسی دوسری چیز پر نہیں ہوتا اسی طرح زمین اور آسمان کا اطلاق ان کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں ہوتا۔

حکمت اسلامی میں مفہوم ہستی کا معنوی اشتراک

اس مسئلہ میں مسلمان متکلمین کا دیگر متکلمین سے بڑا اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک ہستی کے ذہنی معنا و مفہوم ایک ہی ہیں اور یہ معنی ان اشیاء کے مقابلہ میں ہے جن کے لئے موجود ہونے یا نہ ہونے کی خبر دی جاتی ہے۔

ہستی کے اعتباری ہونے کا نظریہ

عالم اسلام کے متکلمین کا مفہوم ہستی کے متعلق ایک نظریہ ہونے کے باوجود وہ لوگ اس کے مصداق کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ بعض اسلامی متکلمین اصالت ماہیت

کے قائل ہیں اور بعض مفہوم وجود کو ایک انتزاعی اور ذہنی مفہوم کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کائنات متکثر ماہیت کی حامل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مفہوم ہستی، متکثر ماہیتوں سے ماخوذ ہوتی ہے۔

اصالت ہستی کے نظریہ کے قائلین

مذکورہ متکلمین کے مقابلہ میں کچھ ایسے بھی متکلمین ہیں جو قائل ہیں کہ وجود صرف اور صرف ایک ذہنی مفہوم نہیں ہے بلکہ حقیقی مصداق کا حامل بھی ہے، یہ لوگ وجود کی اصالت اور ماہیت کے اعتباری ہونے کے معتقد ہیں۔ ان کے نزدیک مفہوم وجود، متکثر عینی ماہیتوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ان کی ہستی اور ان کے وجود سے حاصل ہوتا ہے اور مختلف ماہیتوں کا وجود دراصل اس حقیقت کو کہتے ہیں جن کی حکایت مفہوم ہستی کرتا ہے۔

ہستی کے مصداق کے سلسلہ میں اقوال چہارگانہ

جو متکلمین اصالت وجود کے قائل ہیں، خود ان کی تین قسمیں ہیں:

پہلا گروہ: یہ وہ متکلین ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ وجود کے مصادیق متباین متکثر ہیں، یہ لوگ تباین وجود کے تکثر کے قائل ہیں۔

دوسرا گروہ: یہ وہ متکلمین ہیں جو ان وجود کے متکثر حقائق کے قائل ہیں جو مفہوم وجود کے مصداق ہیں اور وحدت حقیقی کے بھی مالک ہیں۔ یہ لوگ کثرت تشکیکی کے قائل ہیں۔

تیسرا گروہ: یہ وہ لوگ ہیں جو مفہوم وجود کے لئے مصداق واحد کے قائل ہیں۔ یہ لوگ وجود کے لئے وحدت شخصی کے قائل ہیں۔

اس طرح مسلمان متکلمین کے نزدیک مصداق وجود کی چار قسمیں متصور ہیں:

اول: بعض متکلمین وجود کے لئے حقیقی مصداق کے قائل نہیں ہیں۔

دوم: بعض متکلمین وجود کے لئے متکبر اور متباین مصادیق کے قائل ہیں۔

سوم: بعض متکلمین وجود کے متکثر مصادیق کے درمیان تشکیکی وحدت کے قائل ہیں۔

چہارم: بعض متکلمین وجود کے لئے وحدت شخصی کے قائل ہیں۔

پہلے گروہ کے نظریہ کو بہت سے متکلمین نے صحیح مانا ہے اور اسے قبول کیا ہے، اور آخری نظریہ ان لوگوں کا ہے جو فلسفہ کی بنیاد پر ان چیزوں کو ثابت کرتے ہیں جن پر قرآنی آیتیں اور روایتیں دلالت کرتی ہیں

اور مسلمان عرفاء اس کے شہود کا دعویٰ کرتے ہیں۔مذکورہ تمام نظریات حقیقت میں امر یا مقدس ہستی کی تشریح و تفسیر ہیں۔

امر مقدس متکلمین اور اصالت ماہیت کے قائلین کی نظر میں

متکلمین کے نزدیک ہستی ایک ایسی ماہیت ہے جو مجہول الکنہ ہے یعنی اس کی حقیقت مجہول ہے اور اس کی ماہیت دیگر ماہیتوں سے الگ تھلگ ہے۔اس نظریہ کے مطابق مفہوم ہستی امر مقدس یا اس کے علاوہ کسی ایک معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

اصالت ماہیت کے قائلین کی نظر میں مفہوم ہستی اگرچہ مفہوم واحد ہے لیکن یہ مفہوم انہیں متکثر امور واقعی کے لئے بولا جاتا ہے جن کی خبر متکلمین دیتے ہیں۔اس نظریہ کے مطابق ہستی حقیقی مصداق کی مالک نہیں ہے کہ ہم یہاں پر اس کے مصداق کے مقدس ہونے کی بات کریں۔اس نظریہ کے مطابق امر مقدس کا شمار متکثر عینی اشیاء میں ہوتا ہے جس سے ہستی کے لئے مفہوم واحد حاصل ہوتا ہے ۔حکمائے اشراق جو اصالت ماہیت کے قائل ہیں، امر مقدس امر ماہوی نہیں ہے یعنی اس کی کوئی ماہیت بھی نہیں ہے۔

مقدس ہستی کثرت تباینی اور تشکیکی کے آئینہ میں

اصل وجود اور وجودات کے کثرت تباین کے قائلین کی نظر میں ہستی متکثر مصادیق کی حامل ہے۔ہستی کے بعض مصادیق جو غیر طبیعی موجودات عالم ہیں اور اس ہستی پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں وہ ایک طرح سے تقدس کے مالک ہیں البتہ ان میں اصل و اساس خدا کی ہستی مقدس ہے جو مطلق تقدس کا مالک ہے۔

ہستی میں تشکیک کے نظریہ کے مطابق ہستی الٰہی اور اس کے ضمن میں فیض واحد اور مستمر بھی قداست کے مالک ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حق کی ذات ایک ایسا وجود ہے جو ہر قسم کی ماہوی قید و بند اور محدودیت سے منزہ ہے اور اس کا فیض بھی ایک ایسا وجود ہے جو ماہیت میں مقید نہیں ہے بلکہ تمام ماہیات اسی سے کسب فیض کرتی ہیں۔

ہستی کا تقدس وجود کے وحدت شخصی کے آئینہ میں

وحدت شخصی وجود کی بنیاد پر ہستی کا بس ایک ہی حقیقی مصداق ہے اور وہ ہستی نامحدود ہے اور کثرت تباین یا کثرت تشکیکی کے قائل کے نزدیک مورد نظر ہستی مقید اور محدود ہے ، اسی طرح تمام ماہیات، اس کے ظہورات اور تجلیات واحد ہیں۔

وحدت شخصی وجود کی روشنی میں مفہوم ہستی جس طرح ماہیات سے منتزع اور حاصل نہیں ہوتی اس طرح محدود اور مقید ہستی سے بھی نامحدود ہستی سے حاصل اور منتزع ہوتی ہے اور اسی کی عکاسی کرتی ہے۔

ہستی کو مقید امور سے مجاز کے طور پر مستند کرنا

اس نظریہ کے مطابق ہستی کا اطلاق دیگر امور پر جھوٹ نہیں بلکہ مجاز کے طور پر ہے یعنی دیگر امور پر ہستی کا اطلاق بس اس لئے ہے کہ وہ امور بھی کسی نہ کسی طرح اسی نامحدود ہستی کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کا شمار اس کی نشانیوں میں ہوتا ہے۔

وحدت شخصی وجود کی بنیاد پر کثرت ماہوی اور محدود و مقید کثرت کے مصادیق بھی کاذب نہیں ہیں اور امور متکثر کے درمیان رابطہ بھی جھوٹ اور غیر واقعی نہیں ہے بلکہ یہ علامت اور نشانی کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا شمار نامحدود ہستی کے اسماء اور صفات میں ہوتا ہے۔

مقدس ہستی کا غیروں کے مقابلہ میں امتیاز

اس ہستی میں خدا کی تمام آیتیں اور نشانیاں متعین اور مقید ہیں، بس اس کی ہستی جو حقیقی ہے وہ نامحدود ہے اور ہر قسم کے قید و بند سے منزہ ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی نامحدود ہستی جو بے کراں ہے جس کا کوئی ساحل اور کنارہ نہیں ہے ،ظاہر و باطن اور مقید و محدود موجودات کا آغاز و انجام ہے ، اپنی قدرت اور طاقت سے انہیں ظہور کے لباس سے آراستہ کرتی ہے لیکن ان میں سے کسی کی بھی قید و بند سے مقید نہیں، مقید و محدود امور سے اس کا امتیاز نامحدود ہونا ہے، نیز نامحدود ہستی کا محدود ہستی سے فاصلہ بھی نامحدود اور بے کراں ہے، یعنی وہ ہر شے کے ساتھ اور اس کے ہمراہ ہے اور ہر شے ہر اعتبار سے اس کے سامنے اور اس کی نگاہوں میں ہے اور ہر جگہ اس کا حضور محسوس ہے اس کے باوجود اس کی ہستی حد و حصر سے باہر اور غیر قابل تصور ہے۔

قرآن کریم نے کائنات کے پروردگار کے حضور و ظہور کی خبر ایک دو آیتوں نہیں بلکہ اکثر مقامات پر دی ہے، جیسے کہ اس کی تعریف و تمجید میں فرمایا ہے: ھو الاول والاخر والظاھر و الباطن یا فرماتا ہے: ھو معکم اینما کنتم نیز امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے پروردگار کے حضور و ظہور اور ہر شے کے ساتھ اس کی معیت کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: مع کل شی ء لا بمقارنۃ و غیر کل شیء لا بمزایلۃ ۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے لیکن ان میں سے کسی کا بھی قرین نہیں ہے اور ان میں سے ہر شے سے جدا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے حضور کے ساتھ ان کے پاس حاضر نہیں ہے۔

حکمت اور امام علی رضاؑ

پروفیسر سید فرمان حسین

حکمت کیا ہے؟

ارباب لغت نے حکمت کے معنی مندرجہ ذیل بتائے ہیں:

اعلیٰ ترین علوم کے ذریعہ اعلیٰ ترین اشیاء کا علم، دانائی، علم اور معرفت، عدل وانصاف، ایسا کلام جس کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں، اصابت رائے، عدالت، فلسفہ[۱]، طب اسی بناء پر اکثر طبیب کو حکیم اور طب کو علم الحکمۃ بھی کہا جاتا ہے، دانش مندانہ بات، کیمیا، حکمت کا صحیح ترین ترجمہ دانش مندی ہے۔[۲]

اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں کہا گیا ہے کہ حکمت اس کلام کو کہتے ہیں جو انسان کو جہالت سے روکے اور اس سے بچنے میں مدد کرے۔[۳]

حکمت در اصل ایک ایسا عظیم اثاثہ ہے جس کی قدر وقیمت، وزن اور اہمیت کا احساس ہر طبقہ میں ہے چاہے اس طبقہ کا تعلق کسی بھی فرقہ، مذہب، مسلک یا نظریہ سے ہو۔ فلسفہ جس کی اساس فکر و نظر، تعلق وتدبیر، مشاہدات و تجربات، فہم وبصیرت اور عقل و دانش پر ہے وہ بھی حکمت سے وابستہ ہونے کو اپنا طرہ امتیاز سمجھتا ہے اور نہ صرف اس پر فخر کرتا ہے بلکہ اس کی ترویج وتشویق اور تبلیغ میں وہ اپنی پوری توانائی صرف کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نگاہ میں حکمت احوال موجودات کو بقدر طاقت بشری جاننے کی کیفیت کا نام ہے۔

فلسفیانہ پس منظر میں حکمت کی تشریح کے سلسلہ میں کئی مفاہیم سامنے آئے ہیں:

۱۔ جیسے حکمۃ التشریع میں کہا جاتا ہے مالحکمۃ فی ذالک، اس چیز میں کیا حکمت ہے، اس کام کی کیا وجہ ہے؟ اور اس کے پس منظر میں کیا مصلحت ہے؟

۲۔ القاموس الوحید، باب حا

۳۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا، مرتبہ سید قاسم محمود، جلد دوم، ص ۸۷۸

۱۔ اشیاء کی معرفت اور ماہیت کا علم: بعض ارباب نظر کے نزدیک علم اور حکمت میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمت، علم کی ایک شاخ ہے اور حکمت و علم میں ماہیت کا نہیں بلکہ غایت اور نوعیت کا فرق ہے یعنی علم کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کوئی چیز کیا ہے اور حکمت کا ہدف یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود کی غایت اور غرض کیا ہے اور ہم اس کو کس طبقہ میں قرار دے سکتے ہیں۔

۲۔ جرجانی کے مطابق لفظ حکمت سے حقیقت مراد لی جاسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ عمل کا ہونا بھی ضروری ہے یعنی عمل کے بغیر حکمت ایک خیالی مشقت ہے جو بے نتیجہ ہے اور اثر اندازی سے اور فکر انگیزی سے کوسوں دور ہے اور بغیر حکمت کے عمل ایک بے معنی و بے مقصد اور بے سمت پیروی ہے

۴۔ فلسفہ کی مشہور کتاب ہدایت الحکمہ میں بتایا گیا ہے کہ حکمت ان افعال و اعمال کو کہتے ہیں جو ہماری قدرت اور اختیار کے دائرہ میں آتے ہیں۔

۵۔ ابن سینا اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ حکمت علم و عمل کے حدود میں رہ کر روح کے ادراک کمال کا نام ہے یعنی اس میں عدل کی صفت کا کمال ہو اور نفس عاقلہ کی تکمیل بھی ہوتی ہو۔[1]

مذہبی دنیا میں بھی حکمت ایک بیش بہا دوست اور عظیم منزلت صلاحیت کا نام ہے۔ راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں کہ لفظ حکمت جب اللہ کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی معرفت کے ہوتے ہیں اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت دی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل صالح۔[2]

بعض اہل علم اور صاحبان فکر نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن اور سنت ہے اور بعض کے نزدیک اس کے معنی حجت قطعیہ کے ہیں۔[3]

تفسیر بحر محیط میں حکمت کے تیس معانی بتائے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ کہیں اس سے مراد قرآن ہے اور کہیں حدیث، کہیں علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق تو کہیں عقل سلیم، کہیں تفقہ فی الدین، کہیں اصابت رائے اور کہیں خشیۃ اللہ ہے یعنی اصل حکمت خوف خدا ہے۔[1]

۱۔ تفسیر بحر محیط بحوالہ تفسیر معارف قرآن، جلد اول در تفسیر من یوتی الحکمہ

۲۔ مفردات قرآنی، راغب اصفہانی، ذیل لفظ حکمت

۳۔ معارف قرآنی جلد اول

اسی تفسیر میں حکمت کی شناخت اس طرح کرائی گئی ہے:

والحکمة وضع الامور فی محلها علی الصواب وکمال ذالك انما یحصل بالنبوة[۲]۔ حکمت کے اصل معنی ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کے ہیں اور اس کمال کا مکمل حصول صرف نبوت کے درجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

اسی سے تفسیر میں حکمت کی تعبیر نبوت سے کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حکمت کے یہ تمام معانی تقریباً یکساں ہیں کیونکہ لفظ حکمت احکام بالکسر کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی قول یا عمل کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔[۳]

تفسیر روح المعانی میں حکمت کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ انما الکلام الصواب الواقع من النفس احمل موقع۔[۴] حکمت وہ درست کلام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے۔

ابن عباس کے بقول حکمت، عقل، فہم اور ذکاوت کا نام ہے۔

تفسیر روح البیان[۵] میں درج ہے کہ حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کا مقصد مقتضیات احوال کو معلوم کرنا ہے یعنی انسان مقتضائے حالات کے تحت مناسب کلام کرے، وقت اور موقع کی نزاکت پر توجہ رہے۔ کلام کا رنگ و آہنگ ایسا ہو کہ مخاطب پر بار نہ ہو۔ نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کی جائے، جہاں صراحتاً کہنے سے مخاطب کو شرمندگی ہوتی ہو وہاں اشارات سے کام لینا ہی حکمت ہے یا ایسا اندازہ اور عنوان اختیار کرنا عین حکمت ہے کہ سننے والے کو خفت اور ذلت کا احساس نہ ہو اور نہ اس میں اپنے خیال پر جم جانے کا تعصب پیدا ہو جائے۔

۱۔ تفسیر بحر محیط بحوالہ معارف قرآن جلد اول

۲۔ تفسیر بحر محیط

۳۔ تفسیر بحر محیط

۴۔ تفسیر روح البیان، ابوالثناء محمود شہاب الدین ابن عبداللہ صلاح الدین در تشریح لفظ حکمت

۵۔ تفسیر روح البیان

حکمت اور قرآن :

قرآن نے حکمت کو بہت بلند مقام اور مرتبہ عنایت کیا ہے اور کہا ہے کہ ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً [۱] جسے حکمت مل گئی اسے خیر کثیر مل گیا۔

قرآن حکیم میں یہ لفظ بیس مقامات پر وارد ہوا ہے اور کئی معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً علم، عقل، حلم، بردباری، نبوت، اصابت رائے، ایسا کلام جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اور دلوں پر اثر پڑے۔

قرآن میں جن مقامات پر یہ لفظ آیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹، سورۂ بقرہ آیت ۱۵۱، سورۂ بقرہ آیت ۲۳۱، سورۂ بقرہ آیت ۲۵۱، سورۂ بقرہ آیت ۲۶۹ ، سورۂ بقرہ آیت ۲۶، سورۂ آل عمران، آیت ۴۸، سورۂ آل عمران آیت ۶۱ ، سورۂ آل عمران آیت ۱۶۴، سورہ نساء آیت ۵۴، سورۂ آل عمران آیت ۱۱۳، سورۂ مائدہ آیت ۱۱۰، سورۂ نحل آیت ۱۲۵ ، سورۂ اسراء آیت ۳۹، سورۂ لقمان آیت ۱۲، سورۂ احزاب آیت ۳۴، سورۂ ص آیت ۲۰، سورۂ زخرف آیت ۶۳، سورۂ قمر آیت ۵، سورۂ نجم آیت ۲۔

ان بیس مقامات میں سے دس مقامات پر حکمت کے ساتھ کتاب کا بھی تذکرہ ہے اور دس مقامات پر تفسیر کتاب کا ذکر ہے جو واضح اشارہ ہے کہ کتاب اور حکمت ایک نہیں بلکہ دو وجود ہیں۔

حکمت قدرت کا وہ بے بہا عطیہ ہے جو اس نے اپنے خاص منتخب بندوں اور خاص نسلوں کو ان کے بلند کردار اور پاکیزہ نفوس اور اعلیٰ معیار کی زندگی کی وجہ سے عنایت کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں رب العزت کا ارشاد ہے:

فقد اٰتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمة وآتیناھم ملکا عظیماً [۲]، ہم نے ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو ملک عظیم عنایت کیا ہے۔

وآتیناہ الحکمة وفصل الخطاب [۳]، اور انہیں (حضرت داؤد کو) ہم نے حکمت عطا کی اور خطاب

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۶۹

۲۔ سورہ نساء، آیت ۵۴

۳۔ سورہ ص، آیت ۲۰

کا ڈھنگ عطا کیا۔

جناب لقمان جنہیں عام طور پر ان کی حکمت سے گہری وابستگی کی بنا پر حکیم لقمان بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے لئے ارشاد ہوتا ہے: و لقد آتینا لقمان الحکمۃ [۱] ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

واذ علمتك الكتاب والحكمة و التوراة و الانجيل [۲]، جب ہم نے تمہیں کتاب و حکمت سکھائی اور تورات و انجیل سکھایا۔

وانزل الله عليك الكتاب والحكمة وعلمك مالم تكن تعلم [۳]، اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اور تمہیں وہ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

یس والقرآن الحکیم [۴]، یٰس قرآن حکیم کی قسم۔ حکمت کی بلندی اور اہمیت و عظمت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ پروردگار عالم نے خود کو حکیم کہا ہے۔

يسبح لله ما فى السموت وما فى الارض الملك القدوس العزيز الحكيم [۵]، زمین اور آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ اس اللہ کی تسبیح کرتی ہے جو بادشاہ پاک ہے۔ غالب اور حکمتوں والا ہے۔

معلم بشریت، مربیٔ انسانیت، مجسمۂ فضیلت، حضرت ختمی مرتبت حضور سرور کائنات کے فرائض میں سے ایک فریضہ اللہ نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ وہ حکمت کی تعلیم دیتے ہیں:

هو الذى بعث فى الامين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة، اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں رسول بھیجا جو ان ہی میں سے ہے، وہ ان پر آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، ان کے نفوس کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تعلیم حکمت نبوت و رسالت کے فرائض میں شامل ہے تو فطرت شریعت اور عقل و حکمت کا یہ مطالبہ بالکل بجا اور ناقابل تنسیخ ہے کہ بعد وفات رسول ایسے لوگ موجود و قائم رہیں جو امت

۱۔ سورہ لقمان، آیت ۱۲

۲۔ سورہ مائدہ، آیت ۱۱۰

۳۔ سورہ نساء، آیت ۱۱۳

۴۔ سورہ یٰس، آیت 1-2

۵۔ سورہ جمعہ، آیت ۱

کو کتاب کے مضامین سمجھا سکیں اور اس کے مفاہیم کی تشریح کر سکیں اور حکمت کی باریکیوں اور ان کی غرض وغایات کو اجاگر کر سکیں۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی کا نام ہے امام ثامن وضامن ، حکیم امت وملت امام عرب وعجم حضرت علی رضاؑ جن کی پیدائش کی تاریخ اکثر مورخین اور باخبر حضرات کے مطابق ۱۱/ ذی قعدہ ہے مگر سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔

اہل مدینہ کی ایک جماعت کے مطابق ۱۵۳ھ ہے۔ جنابدی کے مطابق بھی یہی آپ کا سنہ ولادت ہے ایک قول کے مطابق ۱۵۱ھ ہے۔ شیخ مفید کے مطابق ۱۴۸ھ ہے اور اصول کافی میں بھی اس قول کی تائید کی گئی ہے۔[1]

نام علی ہے اور مشہور ترین لقب رضا ہے۔ آپ کے اس لقب کا کیا پس منظر، علت اور بنیاد کیا ہے اس پر بھی الگ الگ خیالات اور ارشادات ہیں۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ آپ کے علم وعمل اور حکمت وفضیلت کی بناء پر مامون نے آپ کو بہت پسند کیا اور ولی عہدی کے لئے آپ کا انتخاب کیا اس لئے آپ کا لقب رضا ہوا ہے مگر امام محمد تقیؑ نے اس قول کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ لقب من جانب اللہ ہے کیونکہ آپ اللہ کے نزدیک برگزیدہ اور پسندیدہ تھے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ امام کو حکمت ودانش وری میں بلند درجہ پر ہونے کی وجہ سے سبھی پسند کرتے تھے اس لئے آپ کا لقب رضا ہوا ہے۔

حقیقتوں کا شعور رکھنے والوں ، حکمتوں کا ادراک کرنے والوں اور فلسفہ کی گہرائیوں میں اتر جانے والوں کا نظریہ ہے کہ حکمت کے دو پہلو ہوتے ہیں جنہیں الگ الگ دو ناموں سے پہچانا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہیں۔ حکمت نظری یعنی الہیات، طبیعات اور ریاضیات کو سمجھنا، پرکھنا اور مان لینا، اور دوسری حکمت ہے حکمت عملی یعنی فرد، خانوادہ اور سماج کو مہذب بنانے کا طریقہ اور وسیلہ۔ الہیات کی بنیاد یہ ہے کہ کسی کے قول پر اعتبار کرکے دل سے اسے مان لینا جسے دوسرے لفظوں میں ایمان بھی کہا جاتا ہے۔ تفکر وتدبر، شعور وتعلق کے نتیجہ میں جس حقیقت واقعیہ کی طرف رسائی ہوتی ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہی ایمان ہے۔

۱۔ ارشاد شیخ مفید

اسی ایمان کے بارے میں امامؑ نے اس طرح ذہن انسانی کو درست مقام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ ایمان، اسلام سے ایک درجہ افضل ہے اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ افضل ہے اور بنی آدم کو یقین سے افضل کوئی چیز نہیں دی گئی ہے یعنی ان تمام مدارج میں یقین سب سے زیادہ بلند مقام پر فائز ہے۔

مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کا نام ہے ایمان زبان سے اقرار دل سے معرفت اور اعضاء وجوارح سے عمل کرنے کا نام ہے۔

ایمان کے چار ارکان ہیں۔ التوکل علی الله، الراضی بالقدر والقضا، والتسلیم لامرا الله والتفویض الی الله الامة الساکنه ۔

توحید کے بارے میں امامؑ کی حکمت آمیز گفتگو : محمد بن زید طبری کہتا ہے کہ امام رضاؑ نے فرمایا کہ خدا کی عبادت کا آغاز اس کی معرفت ہے اور معرفت کی بنیاد اس کی توحید کی شناخت ہے اور نظام توحید یہ ہے کہ اس سے ہر حسد کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ ہر مخلوق کا ضرور ایک خالق ہوتا ہے اور وہ خالق ایسا ہے کہ جو خود مخلوق نہیں ہے (ورنہ یا تو دور لازم آئے گا یا تسلسل جو حکماء اور فلاسفہ کے نزدیک باطل ہیں)

وہ ذات جس میں حدوث کی گنجائش نہیں ہے وہ ذات وہی ہے جو ازل سے ہے اور اس کے لئے عدم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ لطیف ہے مگر جسمانی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ موجود ہے مگر اس کا سابقہ کسی موجود سے نہیں۔ وہ فاعل ہے مگر بہ عنوان جبر نہیں۔ وہ اندازہ گیر ہے مگر کسی اندیشے کے تحت تدبیر نہیں کرتا، وہ مدید ہے مگر کسی حرکت کے ساتھ نہیں۔ وہ مرید ہے مگر اسے کسی عزم کی ضرورت نہیں۔ وہ سمیع ہے مگر کانوں کا حاجت مند نہیں۔ بصیر ہے مگر اسے آنکھوں کی ضرورت نہیں۔ وہ زمان ومکان سے ماورا ہے نہ اسے کبھی نیند آتی ہے۔ اسے مخلوق کے اوصاف کے ساتھ موصوف نہیں کیا جاسکتا اور آلات اس کی نہ مدد کرتے ہیں اور نہ کوئی نفع پہنچاتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں کہ وہ ھوھو کی منزل میں ہے۔

اگر مخلوق کے صفات سے اسے متصف کیا جائے تو وہ خود کسی اور کے وجود پر موقوف ہو جائے گا اور یہ بات محال اور خلاف حق ہے[1]۔

۱۔ االدمعۃالساکبہ، جلد سوم، ص۱۱۲، ۱۲، ۱۳۲

حسین بن خالد کا بیان ہے کہ میں نے امام رضاؑ سے پوچھا کہ اے فرزند رسول لوگ رسول خدا کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا ہے۔ امام نے فرمایا کہ انہوں نے حدیث کے پہلے حصہ کو چھوڑ دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ دو آدمیوں کے پاس سے گزر رہے تھے جو آپس میں ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ خدا نے تیری شکل اور تیرے چہرے کو برا بنایا ہے تیری شکل کیسی ہے۔ آن حضرت نے اس موقع پر فرمایا: خدا کے بندے! اپنے بھائی کو ایسا نہ کہو کہ یہ صورت اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔

چونکہ حکمت کی ایک قسم طب بھی ہے اور بدن کی حفاظت اور اصلاح بھی انسانی زندگی کے وجود اور بقاء کے لئے انتہائی ناگزیر ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کا جسم بیمار ہوتا ہے تو اس کا اثر اس کی روح اور روحانی کیفیتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ امام رضاؑ جیسا حکیم امت اس پہلو سے چشم پوشی کرلیتا۔ اس لیے آپ نے مامون سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

... خدا نے بندوں کو امراض سے دوچار نہیں فرمایا مگر ان کی دوا کا علم بھی دے دیا۔ ہر درد کی دوا موجود ہے، انسان کا جسم ایک ملک کی مانند ہے۔ اس کا بادشاہ اس کا دل ہے اور رگیں، پاؤں، ہاتھ، ناک رعایا ہیں۔ بادشاہ کا محل اور زمین اس کے ہاتھ پاؤں، پیشانی، کان اور زبان ہیں۔ بادشاہ کے فرمان پر ہاتھ اشیاء کو نزدیک اور دور کرتے ہیں، پاؤں ادھر جاتے ہیں جدھر وہ انہیں لے جانا چاہتا ہے۔ بادشاہ سے جو چیز پنہاں ہے آنکھیں اس کی طرف رہ نمائی کرتی ہیں کیونکہ بادشاہ پردے کے اندر ہے، دو آنکھوں کے چراغ روشن ہیں۔ کان دو محافظ ہیں بادشاہ کے حکم کے بغیر نہ کسی چیز کو داخل کرتے ہیں نہ خارج، زبان بادشاہ کی ترجمان ہے۔ جو بادشاہ چاہتا ہے اس کے مقصد کی ترجمانی کرتی ہے۔

کھانے پینے کی اشیاء میں پاکیزگی کا خیال رکھا جائے اس سے بدن سلامت رہے گا۔ بدن کو میزان اعتدال پر برقرار رکھو۔ وہ غذا استعمال کرو جو ضرورت کے مطابق ہے ہر گز زیادہ نہ کھاؤ۔ جس نے ضروری غذا بدن کو نہیں فراہم کی اس نے غلط کیا اور بدن کو نقصان پہنچایا۔ جس نے بدن کی ضرورت کے مطابق کھانا کھایا اس نے بدن کی صحیح خدمت کی۔ خواہش رہتے ہوئے یعنی تھوڑی سی بھوک جب باقی رہ جائے تو کھانے سے ہاتھ اٹھالو۔ یہ بدن کے لئے درست اور معدہ کے لئے اچھا ہے۔ جسم درست اور ہلکا ہے، عقل بھی پاک رہتی ہے، ٹھنڈی اور سرد چیزوں کو گرمیوں میں اور گرم چیزوں کو ٹھنڈک میں استعمال کرو،

معتدل چیزوں کو موسم بہار اور موسم خزاں میں استعمال کرو۔ جس چیز کی طرف میلان ہے کھانے میں اسی چیز سے ابتدا کرو۔ ہلکی پھلکی غذا سے شروع کرو۔ ایک غذا اور دوسری غذا کے درمیان آٹھ گھنٹے کا وقفہ رکھو تو کھانا نقصان نہیں پہنچائے گا۔

امامؑ فرماتے ہیں کہ نیند انسان کے اعصاب پر مسلط ہوتی ہے اور جسم کو توانائی بخشتی ہے۔ سونے کا ارادہ کرو تو دائیں پہلو سوؤ پھر بائیں کروٹ لو کیونکہ دائیں پہلو سونے سے غذا ہضم ہوتی ہے۔ بائیں طرف کروٹ لینے سے معدے کے اوپر آ جاتا ہے اور سانس لینے میں آسانی کا باعث ہے۔[1]

۱۔ ماخوذ از ارشاد شیخ مفید الدمعۃ الساکبہ محمد باقر دہدشتی بہبہانی منتہی الامال شیخ عباس قمی۔

حکمت اور گفتگو۔ امام رضاؑ کی نظر میں

مؤلف: پروفیسر غلام یحییٰ انجم

بندگان حق کی رشد وہدایت کے لئے اللہ رب العزت نے انبیاء ومرسلین کو مبعوث فرمایا جنہوں نے تمام مصائب وآلام برداشت کرکے پیغام حق بندگان حق تک پہنچا کرکے ہی دم لیا۔اس زریں سلسلہ کے اختتام کے بعد کار نبوت کو آگے بڑھانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولیاء، بزرگان دین، شہداء وصالحین اور ائمہ دین کا انتخاب فرمایا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے زمانے میں اس نبوی مشن کی نشرواشاعت اور اس کی تکمیل میں اپنی عمر کا گراں مایہ حصہ بسر کیا۔اس طرح جن بندگان حق نے تبلیغ دین اور اسلام کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا ان کی طویل فہرست ہے، مگر ان میں ایک نمایاں نام حضرت سیدنا امام ابو الحسن علی رضا بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی اولاد پاک میں حضرت امام علیؑ اور امام زین العابدینؑ کے بعد آپ تیسری شخصیت ہیں جن کا اسم گرامی علی ہے[1]۔

آپ کی ولادت کے سلسلہ میں مورخین مختلف الخیال ہیں۔ کسی نے ۱۴۳ھ کسی نے ۱۴۸ھ کسی نے ۱۵۱ھ اور کسی نے ۱۵۲ھ کا اقرار کیا ہے۔ مدینہ منورہ میں امام جعفر صادقؑ کے بیت الشرف میں آپ کی ولادت ہوئی جو تقویٰ، تدین اور پرہیز گاری کا مرکز اور سرچشمہ تھا۔ اسی بیت الشرف میں آپ کی پرورش ہوئی اور پدر بزرگوار کی تربیت اور خاندانی آداب ورسوم سے آراستہ ہوئے۔ آپ کا ہر عمل قابل تقلید تھا۔ آپ کی عادت تھی کہ جب آپ دستر خوان پر کھانے کے لئے بیٹھتے تو اپنے غلاموں یہاں تک کہ اصطبل کے رکھوالوں اور دربانوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔

۱۔ مطالب اصول فی مناقب آل رسول، ص ۲۹۵

بلاشبہ آپ پیدائشی ولی تھے جس کا اظہار آپ کی والدہ ماجدہ (جن کا نام نجمہ خاتون تھا ولادت کے بعد انہیں طاہرہ کے لقب سے یاد کیا گیا) کے ان الفاظ سے ہوتا ہے۔آپ فرماتی ہیں:

"دوران حمل میں نے قطعاً کوئی بوجھ نہیں محسوس کیا اور سوتے وقت میں اپنے بیٹے کی تسبیح و تہلیل کی آوازیں سنتی تھی اور جب آپ دنیا میں تشریف لائے تو پہلے انہوں نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھا، سر مبارک کو آسمان کی طرف بلند فرمایا، آپ کے لبوں پر حرکت تھی۔ محسوس یوں ہوتا تھا کہ گویا خداوند عالم سے مناجات کر رہے ہوں۔ اتنے میں آپ کے والد ماجد حضرت موسیٰ کاظم تشریف لائے اور فرمایا: هنيا لک کرامة ربک عزوجل۔آپ کو پروردگار عالم کی جانب سے یہ کرامت مبارک ہو۔اس وقت میں نے اپنے بیٹے کو حضرت کے سپرد کیا۔انہوں نے آپ کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت پڑھی پھر آپ کا دہن مبارک آب فرات سے دھویا۔"[۱]

شعور بالغ ہوتے ہی ظاہری طور پر آپ نے اپنے والد بزرگوار و چچا اور خاندان کے دیگر بزرگوں سے احادیث کی سماعت کی اور اکتساب علم کیا، علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔حدیث و تفسیر علوم سے اہل بصرہ کو ایک زمانہ تک سیراب کیا۔ ۲۴ سال کی عمر میں مسجد نبوی میں بیٹھ کر ۱۵ ہزار استفتا کے جوابات دیئے اور ایک عالم کو اپنی فقہی مہارت سے مستفید کیا۔آپ ادب و حلم اور فہم کے اعتبار سے بہت زیادہ باریک بین اور نکتہ سنج تھے۔بہت زیادہ حدیث نقل فرماتے اور بہت انہماک کے ساتھ افہام و تفہیم فرماتے۔

مامون کے حکم سے آپ نے مدینہ سے مرو کے لئے ہجرت کی اس سفر میں آپ کے فرزند حضرت محمد تقی آپ کے ہمراہ تھے، پہلے مکہ معظّمہ تشریف لے گئے پھر وہاں سے نیشاپور تشریف لے گئے جہاں آپ کا پر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔اکابر علماء نے آپ کا استقبال کیا۔علماء وفقہاء آپ کے چاروں طرف جمع ہو گئے جن میں پیش پیش یحییٰ، اسحاق بن راہویہ، محمد بن رافع اور احمد بن حرب تھے۔جب اس عظیم مجمع نے آپ کو دیکھا تو تکبیر و تہلیل کی آوازیں بلند کرنے لگے۔لوگ آپ کے چہرہ کی زیارت اور آپ کی زبان مبارک سے

۱۔تاریخ روضۃ الصفا، جلد ۳، ص ۴۲

حدیث کی سماعت کے لئے بے قرار تھے۔ کوئی آپ کی سواری کے قدموں اور کوئی آپ کے کجاوہ کو بوسہ دے رہا ہے۔ آپ کجاوہ کے اندر تھے جب لوگوں کے اصرار پر چہرہ مبارک کو باہر نکالا تو فرط محبت سے لوگ چیخ مار مار کر رونے لگے، علماء وحفاظ کہہ رہے تھے کہ خاموش ہو جاؤ اور فرزند رسول کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ جب لوگ خاموش ہوگئے تو لوگوں نے امامؑ سے عرض کیا کہ اے فرزند رسول خدا آپ کے آباء واجداد کا واسطہ! ہمارے لئے کوئی ایسی حدیث نقل فرمایئے جو آپ نے اپنے والد گرامی اور انہوں نے اپنے آباء واجداد سے سنی ہو۔ لوگوں کے اصرار پر آپ نے یہ حدیث بیان فرمائی:

قال علی بن موسیٰ الرضا حدثنی ابی موسیٰ کاظم عن ابیه جعفر الصادق عن ابیه محمد بن باقر عن ابیه علی زین العابدین عن ابیه الحسین الشهید کربلا عن ابیه علی ابن ابی طالب قال حدثنی حبیبی وقرة عینی رسول الله قال حدثنی جبرئیل قال سمعت رب العزه سبحانه تعالیٰ یقول کلمة لا اله الا الله حصنی فمن قالها دخل حصنی ومن دخل حصنی امن من عذابی[1]۔

ترجمہ: امام علی رضا نے فرمایا میں نے موسیٰ بن جعفر سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار جعفر بن محمد سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار محمد بن علی سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار علی بن الحسین سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار حسین بن علی سے انہوں نے اپنے والد بزرگوار علی بن ابی طالب سے اور انہوں نے نبی اکرمؐ سے اور انہوں نے جبرئیل سے نقل کیا ہے کہ خداوند عالم حدیث قدسی میں فرماتا ہے: لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ میرے قلعہ میں داخل ہوگیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگیا۔

روایت ہے کہ آپ نے حدیث مبارک میں جن اسناد کا ذکر کیا اس کے بارے میں اکثر علماء کا بیان ہے: لو قرأت هذا الاسناد علی مجنون لبری من جنته[2]۔ اگر ان اسناد کو کسی دیوانہ پر پڑھ کر دم کر دیا جائے تو وہ دیوانگی سے افاقہ پا کر عقلمند ہو جائے گا۔

۱۔ الفصول المهمة فی معرفة احوال الائمة، ص ۲۴۲

۲۔ الصواعق المحرقة ج ۲ ص ۵۹۵

اس حدیث کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ جب یہ حدیث کسی سامانی بادشاہ تک پہنچی تو اس نے عمائد سلطنت کو حکم دیا کہ اس حدیث کو سونے سے تحریر کیا جائے اور وصیت کی کہ مرنے کے بعد اسے میری قبر میں دفن کر دیا جائے۔ اس کے مرنے کے بعد کسی نے اسے خواب میں دیکھا اور سوال کیا کہ آپ کے ساتھ کیا گذری تو اس نے جواب دیا کہ خداوند عالم نے مجھ کو کلمہ لا الہ الا اللہ کہنے اور محمد رسول اللہ کی تصدیق کرنے کی وجہ سے بخش دیا[1]۔

نیشاپور میں آپ کی تاریخی آمد سے درج ذیل باتوں کا علم ہوتا ہے:

۱۔ حضرت امام رضاؑ سے اہل نیشاپور کا والہانہ لگاؤ۔

۲۔ حضرت امام رضا کا علماء کے ذریعہ پرجوش اور والہانہ استقبال۔

۳۔ آپ کی زیارت کے لئے بے قراری اور نالہ وفریاد۔

۴۔ محبت امام میں مرکب کی پابوسی۔

۵۔ حضرت امام رضا سے علماء وفقہاء کا استفادہ۔

۶۔ امام وقت سے سماعت حدیث کی التجا۔

۷۔ حضرت امام رضاؑ کی سواری پکڑنے میں علماء کا ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں جدوجہد۔

جن علماء نے یہ حدیث سنی اور اسے نقل کیا ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔ جن میں درج ذیل حضرات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آدم بن ابی ایاس عسقلانی (وفات ۲۲۹ھ)، ابوزکریا یحییٰ بن یحییٰ تمیمی نیشاپوری (وفات ۲۲۶ھ)، ابو عبد اللہ احمد بن حرب بن فیروز نیشاپوری (وفات ۲۴۱ھ)، ابو یعقوب بن اسحاق راہویہ مروزی (وفات ۲۳۸ھ)، ابوالحسن محمد بن اسلام کندی طوسی (وفات ۲۴۲ھ)، ابوعبداللہ محمد بن رافع قشیری حنبلی (وفات ۲۴۵ھ)، نصر بن علی الجھنی (وفات ۲۵۰ھ)، محمد بن اسحاق بن خزیمہ شافعی (وفات ۳۱۱ھ)۔

اس طرح ہزاروں علماء ومحدثین نے آپ سے روایات نقل کی اور اسے تحریر کیا۔ احادیث بیان کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سی دانائی اور حکمت سے لبریز آپ کی گفتگو اور نصیحتیں ہیں جنہیں اگر اپنی زندگی

۱۔ الفصول المهمه فی معرفة احوال الائمة، ص ۲۴۳

میں داخل کرلیا جائے تو اس سے انتہائی عافیت اور سکون کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ ان کی وسعت علم کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے اعلم روزگار علماء میں سے تھے۔ جب بھی علماء کو کوئی مشکل درپیش آتی تو وہ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ دور مناظروں اور مباحثوں کا تھا آپ جس مناظرہ اور مباحثہ کی محفل میں جاتے آپ ہی کو سربلندی حاصل رہتی۔ آپ کی حاضر جوابی سے علما حیران ودنگ رہ جاتے۔ افاضل روزگار علماء نے بھی آپ کی عبقری اور تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے، آپ سے فرماتے ہوئے سنا گیا کہ میں ایک مجلس میں موجود تھا اور مدینہ کے متعدد علماء بھی موجود تھے۔ جب کوئی ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ علماء اس مسئلہ کو میری طرف منتقل کردیتے اور میں اس کے سوال کا شافی جواب دیتا۔

دنیا میں کوئی ایسا اہل علم نہیں جس نے آپ سے ملاقات نہ کی ہو اور آپ کی علمی عظمت کا اس نے اعتراف نہ کیا ہو۔ بلاشبہ سرزمین عرب میں وہ اللہ تعالیٰ کی حجت تھے اور ایک خاص بات یہ تھی کہ جو جس زبان میں سوال کرتا آپ اسی کی زبان میں اس کے سوالوں کا جواب مرحمت فرماتے تھے۔ متعدد زبانوں پر عبور کی وجہ سے ہی کسی شاعر نے آپ کے بارے میں کہا تھا:

وعلمه بجملة اللغات من اوضح الاعجاز والايات

ترجمہ: تمام زبانوں سے آپ کی آشنائی آپ کا واضح معجزہ اور نشانی ہے۔

نہ صرف امام رضاؑ بلکہ آپ کا پورا گھرانہ علم کا پیکر تھا۔ مولا علی خود شہر علم کے باب العلم تھے۔ شہر علم میں جانے کے لئے دوبار باب العلم سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ شہر علم میں جانے کے لئے اور دوسری مرتبہ شہر علم سے واپس آنے کے لئے اس سے پتا چلا کہ جب تک کوئی باب العلم حضرت علیؑ سے گہری وابستگی نہیں رکھے گا، دولت علم سے وہ کبھی مالامال نہیں ہوسکتا ہے۔ جو علم وفضل کا خزانہ مولا علیؑ کے پاس تھا ایسا لگتا ہے اللہ رب العزت نے سب کچھ وراثت کے طور پر امام رضاؑ میں منتقل کردیا تھا۔ ذیل میں کچھ ایسی ہی ارشادات کی نشاندہی کی جارہی ہے:

آج بہت سے لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسمت کے فیصلہ کا انتظار کرتے ہیں محنت ومشقت کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ جب تک بندہ کاروبار کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے رحمت الٰہی کا حق دار نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کاروبار کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے امام رضا فرماتے ہیں:

"اپنے اہل وعیال کے لئے کوئی کام کرنا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے مانند ہے اور یہ وہ شرف ہے جسے انسان کسب کرتا ہے اور یہ ایسی کوشش ہے جس پر انسان فخر کرتا ہے۔"

اچھے برے انسان ہر دور میں رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اچھائی اور برائی کا پیمانہ ہر دور میں بدلتا رہا ہے۔ امام رضاؑ کی نظر میں اچھے اور برے انسانوں کا پیمانہ کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اچھے کام انجام دیتے ہیں تو ان کو بشارت دی جاتی ہے اور جب ان سے برے کام ہو جاتے ہیں تو وہ استغفار کرتے ہیں۔ جب ان کو عطا کیا جاتا ہے تو شکر ادا کرتے ہیں اور جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو صبر کرتے ہیں اور جب غضب ناک ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔"[۱]

امام رضاؑ کی طویل گفتگو ہو یا چھوٹے چھوٹے جملے، آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ حکمت و دانائی سے پر ہوتا تھا۔ ان جملوں کی گہرائی میں جتنا فکر کریں اتنا ہی حکمت و دانائی کے موتی ملتے ہیں۔ درج ذیل کچھ مختصر ارشادات کی نشاندہی کی جارہی ہے:

۱۔ اگر کوئی شخص ظالم وجابر بادشاہ کے پاس جائے اور وہ بادشاہ اس کو اذیت وتکلیف دے تو اس کو کوئی اجر نہیں ملے گا اور نہ ہی صبر کرنے سے اس کو رزق دیا جائے گا[۲]۔

۲۔ امام رضا ایک دوسرے مقام پر محبت کی عظمت کا اظہار ان لفظوں میں فرماتے ہیں۔

"لوگوں سے محبت کرنا نصف عقل ہے"۔ [۳]

۳۔ آج کل سماج جن حالات سے دوچار ہے انٹرنیٹ، واٹس اپ، ٹی وی، اسمارٹ فون، موبائیل نے انسانوں کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لیا ہے کہ اسے ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ اس رنگارنگی مصروفیات میں اسے سکون کا کوئی لمحہ میسر نہیں بقول امام رضا:

۱۔ تحف العقول، ص ۴۴۵
۲۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۳، ص ۱۸۱
۳۔ بحار الانوار، جلد ۷۸، ص ۳۳۵

"ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں عافیت کے دس جز ہوں گے جن میں نو حصے لوگوں سے الگ رہنے میں ہوں گے اور ایک حصہ خاموشی میں ہوگا"[۱]۔

صوفیائے کرام نے اسی وجہ سے شاید : الصمت سید الاخلاق کہا ہے یعنی خاموشی اخلاق کا اعلیٰ درجہ ہے۔

۴۔امام رضاؑ فرماتے ہیں جس نے مومن کو خوش کیا خداوند عالم قیامت کے دن اس کو خوش حال کرے گا۔

۵۔آج جو صورت حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ایک دوسرے کو دھوکہ دینا عام سی بات ہے ۔جب کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے "المومن للمومن کالمراۃ "مومن کو مومن کے سامنے آئینہ کی طرح ہونا چاہئے مگر اس زمانہ میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ایک مومن بھائی کی دوسرے مومن بھائی کے دل میں کس طرح عزت وعظمت ہونی چاہئے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام رضا فرماتے ہیں :

"مومن مومن کا حقیقی بھائی ہے۔ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جس نے اپنے بھائی پر الزام لگایا۔ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جس نے اپنے بھائی کو دھوکہ دیا۔ملعون ہے وہ شخص جس نے اپنے بھائی کو نصیحت نہیں کی۔ملعون ہے وہ شخص جس نے اپنے بھائی کے اسرار سے پردہ ہٹایا۔ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جس نے اپنے بھائی کی غیبت کی۔"[۲]

۶۔امام رضا نے اپنے اصحاب کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"جس نے اپنے مومن بھائی کو خوش کیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے نیکیاں لکھتا ہے اور جس کے لئے اللہ نیکیاں لکھ دے اس پر عذاب نہیں کرے گا۔"

۷۔امام رضا کا فرمان ہے کہ :

"ہر انسان کا دوست اس کی عقل ہے اور جہالت اس کی دشمن ہے۔"

۱۔تحف العقول، ص ۴۴۶

۲۔وسائل الشیعہ، ص ۵۶۳

۸۔ محاسبہ نفس کے تعلق سے امام رضاؑ فرماتے ہیں:

"جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اس نے فائدہ اٹھایا اور جو اپنے نفس سے غافل رہا اس نے نقصان اٹھایا۔"

آپ کے دیگر اقوال میں خاص طور سے طب و حکمت اور حفظان صحت کے اصول کی بہت مفید اور واضح نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں کچھ ایسے اقوال کی نشاندہی کی جا رہی ہے:

۱۔ بچوں کے لئے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی دودھ نہیں۔

۲۔ سرکہ بہترین سالن ہے۔ جس گھر میں سرکہ ہوگا وہ کبھی محتاج نہ ہوگا۔

۳۔ ہر انار میں ایک دانہ جنت کا ہوتا ہے۔

۴۔ منقی صفرا اور بلغم کو دور کرتا ہے، پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے، نفس کو پاکیزہ بناتا ہے اور رنج و غم دور کرتا ہے۔

۵۔ شہد میں شفا ہے اگر کوئی ہدیہ کرے تو واپس نہ کرو۔

۶۔ گلاب جنت کے پھولوں کا سردار ہے۔

۷۔ بنفشہ کا تیل سر میں لگانا چاہئے اس کی تاثیر گرمیوں میں سرد سردیوں میں گرم ہوتی ہے۔

۸۔ جو زیتوں کا تیل سر میں لگائے یا کھائے اس کے پاس ۴۰ دن تک شیطان نہ آئے گا۔

۹۔ اپنے بچوں کا ساتویں دن عقیقہ اور ختنہ کر دیا کرو اس سے صحت ٹھیک رہتی ہے اور جسم میں گوشت چڑھتا ہے۔

۱۰۔ قرآن پڑھنے، شہد کھانے اور دودھ پینے سے حافظہ بڑھتا ہے۔

۱۱۔ گوشت کھانے سے شفا ہوتی ہے اور مرض دور ہوتا ہے۔

۱۲۔ کھانے کی ابتدا نمک سے کرنی چاہئے کیوں کہ اس سے ستر بیماریوں سے حفاظت ہوتی ہے جن میں ایک جذام بھی ہے۔

۱۳۔ مسور ستر انبیاء کی پسندیدہ خوراک ہے اس سے دل نرم ہوتا ہے اور آنسو بہتے ہیں۔

۱۴۔ کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہئے اور پیالے کے کنارے سے کھانا چاہئے۔

۱۵۔خدائے متعال کی عبادت وبندگی کثرت نماز وروزہ میں نہیں ہے بلکہ خداوند متعال کے امر میں تفکر اور غور وفکر کرنا عبادت ہے[۱]۔

مامون مذہبی اعتبار سے معتزلی تھامگر وہ آپ سے بے حد متاثر تھا اور خاندان عباس وخاندان علوی کے درمیان اختلاف دور کرکے اتحاد پیدا کرنا چاہتا تھا۔اسماعیلی فرقہ کے خطرات مامون کے سرپر منڈلا رہے تھے، لہٰذا ان کا خاتمہ مامون، امام رضا کو اپنا ولی عہد بناکے کرنا چاہتا تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جو بنی عباس کے خلاف تھے اور امین ومامون کی جنگ میں امین کے ساتھ تھے ان کے دلوں کو بھی وہ رام کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے ہر طرح امام کو خوش کرنے کی کوشش کی۔آپ کے نام سے درہم ودینار کے سکے رائج کئے۔ اس نے اپنے زمانہ میں آپ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حق دار نہیں سمجھا اس لئے پہلے تو اس نے آپ سے بیعت کی پھر ولیعہدی کی پیش کش کردی اور اپنی بیٹی ام حبیبہ کی شادی بھی ان سے ۲۰۲ھ میں کردی۔

مامون کی اس ساری سیاسی بازی گری سے حضرت امام رضاؑ اچھی طرح واقف تھے۔آپ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ کیوں وہ اپنے کو خلافت سے دست بردار کررہاہے جب کہ اسی خلافت کے حصول کے لئے اس نے اپنے بھائی امین کا قتل کیا تھا اسی وجہ سے جب اس نے خلافت کی پیش کش کی تو آپ نے فرمایا:

"اگر خلافت تیرے لئے ہے تو تیرے لئے اس لباس کو اتار کر جسے اللہ نے تجھے پہنایا ہے کسی دوسرے کو پہنانا جائز نہیں ہے اور اگر خلافت تیرے لئے نہیں ہے تو تیرے لئے اس خلافت کو میرے لئے قرار دینا جائز نہیں ہے"۔

امام کے اس جواب سے مامون برہم ہوگیا اور دھمکی بھرے لہجہ میں کہا کہ آپ کو خلافت ضرور قبول کرنا ہوگی تو اس کے جواب میں امام نے فرمایا: میں اس منصب کو خوشی سے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ جب خلافت کی عدم قبولیت سے مامون کو مایوسی ہوئی تو اس نے امام سے ولی عہدی کی پیش کش کی اور اس پر راضی کرنے کے لئے تمام سیاسی حربے استعمال کئے مگر امام اس پر بھی راضی نہ ہوئے، عدم رضا مندی پر مامون نے قتل تک کی دھمکی دے ڈالی، تو امام رضا نے طوعا وکرھاً اس کی یہ پیش کش قبول فرمالی اور بارگاہ الٰہی میں تضرع کرتے ہوئے فرمایا: "خدایا تو نے مجھے خودکشی کرنے سے منع فرمایا ہے جب کہ

۱۔ سید نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے، ص ۴۵۳

میں اس وقت مجبور ولاچار ہو چکا ہوں کیوں کہ عبد اللہ مامون نے مجھے ولی عہدی قبول نہ کرنے کی صورت میں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے میں اس طرح مجبور ہو گیا ہوں جس طرح جناب یوسف اور جناب دانیال مجبور ہوئے تھے کہ ان کو اپنے زمانہ کے جابر حاکم کی ولی عہدی قبول کرنی پڑی تھی۔"

لیکن بنو عباس مامون کے اس فعل سے راضی نہ ہوئے اور اس کے خلاف دھرنا دینے لگے۔ مامون نے جب حالات ناگوار دیکھے تو اس نے دنیائے فانی کو آخرت پر ترجیح دی اور کچھ ایسے اصول بنائے جس سے امام کی زندگی اجیرن ہو گئی اور ایک دن وہ آیا کہ اس نے انگور میں زہر دے کر آپ کو شہید کر دیا۔ یہ ہولناک اور رنج والم سے بھرا ہوا واقعہ ۲۰۳ھ میں پیش آیا۔ آپ کے دنیا سے چلے جانے سے دنیائے اسلام رشد وہدایت اور فضل وکمال کے اس روشن چراغ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

امام علی رضاؑ سناباد جو طوس کا بڑا شہر ہے میں مدفون ہوئے اسی شہر کو آج مشہد مقدس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہت روحانی جگہ ہے جو شخص ایک بار وہاں حاضری دیتا ہے بار بار وہاں حاضری دینے کی تمنا سینے میں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ راقم الحروف کو تین بار اس مقدس بارگاہ میں باریابی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ گھنٹوں وہاں معتکف رہا مگر سیرابی نہ حاصل ہو سکی اب تو صورت حال یہ ہے:

کچھ لمحے گذار آیا ہوں مشہد کی زمیں پر
اب دل مرا لگتا نہیں ہے اور کہیں پر
اندازہ ہوا مجھ کو یہ مشہد میں پہنچ کر
یوں لگتا ہے کہ جنت اتر آئی زمیں پر

خواتین کے حقوق عامہ

ڈاکٹر طیب رضا

چھٹی صدی عیسوی میں آنحضرتؐ کا اعلان رسالت انسانی تاریخ کا سب سے عظیم واقعہ تھا جس کے نتیجہ میں فکر و نظر کی دنیا ہی بدل گئی اور لوگوں کی سیرت و کردار میں انقلاب آ گیا۔ انسان نے نئے طرز اور ڈھنگ سے سوچنا شروع کیا اور اس کی زندگی نے نیا رخ اختیار کیا۔ اسی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ عورت کے بارے میں اس کا پورا نقطۂ نظر اور عملی رویہ بدل گیا۔ اس طرح عورت و مرد کے تعلقات نئی بنیادوں پر استوار ہوئے۔

اسلام سے قبل عورت کی تاریخ مظلومی اور محکومی کی تاریخ تھی جسے معمولی اور حقیر چیز اور فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ بازاروں میں جانوروں کے مانند اس کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ مرد کے تابع سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اسلام نے عورت کے وجود کو تسلیم کرانے اور اس کی حیثیت کو قائم وثابت کرنے کے لئے ان الفاظ میں اعلان کیا:

> ”اے لوگو! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑا بھی اسی کی جنس سے پیدا کیا ہے اور پھر دونوں سے بکثرت مرد و عورت دنیا میں پھیلادئے ہیں اور اس خدا سے بھی ڈرو جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتداروں کی بے تعلّقی سے بھی، اللہ تم سب کے اعمال کا نگراں ہے۔“[1]

آیت میں اس بات کا اعلان ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان دنیا نے جو جھوٹے اور بیہودہ امتیازات قائم کر رکھے ہیں وہ باطل اور بے بنیاد ہیں۔ تمام انسانوں کی خلقت ایک ہی نفس سے ہوئی ہے۔ سب کی اصل ایک ہے، پیدائشی طور پر نہ تو کوئی شریف ہے اور نہ رذیل، نہ کوئی اونچی ذات کا ہے نہ ہی

۱۔ سورہ نساء، آیت ۱

نیچی ذات کا، سب برابر اور مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ خاندان، قبیلہ رنگ نسل، ملک و قوم، زبان اور پیشہ کی بنیاد پر ان کے درمیان کسی بھی قسم کی تفریق غلط اور ناروا ہے۔

اسلام مرد عورت کی مساوات کا پہلا علمبردار

زمانہ قدیم قدیم سے مرد اور عورت کے درمیان جو فرق اور امتیاز چلا آرہا تھا، اسلام نے اس کی بھی تردید کی ہے بلکہ وہ اسی سے نکالی گئی ہے اور اسی سے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان رشتے اور تعلقات قائم ہوئے اور پوری نسل انسانی پھیلی۔ اسی کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ تمام انسان ایک خدا کے بندے اور ایک ماں کی اولاد ہیں۔ دوسری جانب جو رشتے اور تعلقات ان کے درمیان ہیں ان کا احترام کرنا چاہئے۔ اس میں مرد کے احترام کے ساتھ عورت کے احترام کی تاکید ہے۔ اسلام نے اس تصور کی جڑ کاٹ دی کہ مرد اس لئے باعزت اور سربلند ہے کہ وہ مرد ہے اور عورت محض عورت ہونے کی وجہ سے پست تر اور ذلیل ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

> "جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انہیں ان اعمال سے بہتر جزا عطا کریں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔"[1]

زمانہ جاہلیت میں لڑکوں کو بہت بڑا سرمایہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی پیدائش اور تعداد پر فخر و مباہات کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ ان کے وجود سے قبیلہ کی قوت میں اضافہ ہوتا اور معاشی امور میں وہ معاون ومددگار ہوتے لیکن لڑکیاں عربوں کے لئے بوجھ ہوتی تھیں جنہیں وہ ننگ و عار سمجھتے تھے اور ان کے ذکر سے ہی ان کے سر شرم سے جھک جاتے تھے۔ قرآن کریم میں ان کی اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "اور جب خود ان میں سے کسی کو لڑکی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ خون کے گھونٹ پینے لگتا ہے، قوم سے منھ چھپاتا ہے کہ بہت بری خبر سنائی گئی

۱۔ سورہ نحل، آیت ۹۷

ہے۔ اب اس کو ذلت سمیت زندہ رکھے یا خاک میں ملادے۔ یقیناً یہ لوگ بہت برا فیصلہ کر رہے ہیں۔"[۱]

دور جاہلیت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان سے لڑکیوں کا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کوئی انہیں زندہ دفن کر دیتا تھا۔ کوئی بلندی سے پھینک دیتا تھا۔ کوئی پانی میں غرق کر دیتا تھا اور کوئی ذبح کر دیتا تھا اور اس کا نام حیا وغیرت رکھ لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی لڑکی کو دفن کرنا چاہا تو اس نے فریاد کی کہ بابا میری خطا کیا ہے لیکن اس نے دفن کر دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ مسلمان ہو گیا تو بقول خود اسے اسلام میں کوئی مزہ نہیں آیا اور کسی طرح کا سکون نصیب نہیں ہوا[۲]۔

جب کہ اسلام نے بیٹی کو باپ کی زندگی کے لئے سامان سکون اور اس کے جنازہ کے لئے رونق وزینت قرار دیا ہے اور سرکار دو عالم کی تو نسل ہی آپ کی دختر گرامی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے قائم ہوئی ہے۔

تجزیاتی طور پر عورت کی زندگی کے تین دور ہوتے ہیں۔ عورت کبھی بیٹی ہوتی ہے، کبھی زوجہ اور کبھی ماں۔ قرآن واحادیث پیغمبرؐ میں عورت کے ان تینوں ادوار پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے جن سے اس کی اہمیت اور شرف ظاہر ہوتا ہے۔ اس بارے میں ہم سب سے پہلے قرآنی آیات سے استشہاد کریں گے اور بعد میں احادیث پیغمبرؐ کی روشنی میں بھی جائزہ لیں گے۔

ارشاد ہوتا ہے:

> "اس وقت کو یاد کرو جب عمران کی زوجہ نے کہا کہ پروردگار میں نے اپنے شکم کے بچے کو تیرے گھر کی خدمت کے لئے نذر کر دیا ہے اب تو قبول فرمالے کہ تو ہر ایک کی سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔ اس کے بعد جب ولادت ہوئی تو انہوں نے کہا پروردگار یہ تو لڑکی ہے حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا ہے اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں[۳]"

۱۔ سورہ نحل، آیت ۵۸۔۵۹
۲۔ ترجمہ وتفسیر قرآن علامہ جوادی، سورۂ نحل، آیت ۵۸۔ ص ۵۷۹
۳۔ سورہ آل عمران، آیت ۳۵۔۳۶

حضرت عمران کی بیوی جناب حنہ نے یہ منت مانی کہ ان کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو وہ اللہ کی راہ میں نذر کرتی ہیں لیکن جب لڑکی پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا یہ تو لڑکی ہے جبکہ جناب حنہ بیٹا چاہتی تھیں کیونکہ اس وقت کے رواج کے مطابق لڑکی نذر نہیں کی جاتی تھی لیکن اللہ تعالی لڑکی کی فضیلت کو دنیا کے سامنے آشکار کر دینا چاہتا تھا کہ لڑکی کسی طرح سے بھی شرف فضیلت میں لڑکے سے کم نہیں ہے۔ اس کی نظر میں دونوں کی اہمیت یکساں ہے بشر طیکہ دونوں متقی اور پرہیزگار ہوں[1]۔

ایک عام قانون کے اعتبار سے اللہ سورۂ نور میں فرماتا ہے:

> "بری عورتیں برے مردوں کے لئے (مناسب) ہیں اور برے مرد بری عورتوں کے لئے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے موزوں ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے۔"

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ عورت پاک اور اچھے کردار کی ہو تو اس کا نکاح برے اور بدکردار مرد سے کر دیا جائے اور پاک اور نیک مرد کا نکاح بدکردار عورت سے کر دیا جائے بلکہ شرط یہی ہے بیوی اور شوہر نیک، مومن، پاک، باعزت، متقی اور پرہیزگار ہوں۔

حقوق زوجین

اسلام نے شوہر وزوجہ کے تعلقات اور ان کے حقوق سے متعلق بہت سے قوانین مقرر کئے ہیں۔ ان کے لئے اخلاقی اور قانونی بنیادیں قرار دی ہیں۔ شوہر وزوجہ کا تعلق الفت و محبت کا تعلق ہے۔ اللہ نے دونوں کے درمیان فطری طور پر جو محبت، کشش اور جاذبیت رکھی ہے، قرآن اس کا ذکر اس انداز میں فرماتا ہے:

> "اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں۔"[2]

۱۔ سورہ نور، آیت ۲۶

۲۔ سورہ روم، آیت ۲۱

آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان الفت و محبت اور ہمدردی و غم خواری کا تعلق ہونا چاہئے۔ یہی اس کی فطرت کا تقاضا ہے، اگر محبت کی جگہ عداوت نے لے لی ہے تو یہ اس فطرت کے خلاف ہے جس پر اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔

ہر ادارہ کا ایک سربراہ ہوتا ہے جو اسے چلاتا ہے۔ خاندان کے تعلقات اور اس کے مسائل دیگر بہت سے اداروں کے مسائل سے زیادہ پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں۔ کسی سربراہ کے بغیر اس کا نظم باقی رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کا کوئی سربراہ اور سرپرست نہیں ہوگا تو اس کا شیرازہ بکھر جائے گا، اتحاد مفقود ہو جائے گا۔ اسلام میں مختلف اسباب کی بناپر مرد کو خاندان کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شوہروں کو اپنی بیویوں پر مطلق طور پر اقتدار دے دیا گیا ہے اور بیوی اس کی محکوم محض ہے بلکہ عورت پر جہاں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مرد کو اپنا سرپرست اور نگراں مان کر جائز مطالبات میں اس کی اطاعت کرے اور گھر کے نظم کو ٹھیک رکھے، وہیں اس کے اپنے حقوق بھی ہیں ان حقوق کی ادائیگی مرد کے لئے لازمی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

> "مرد عورتوں کے حاکم اور نگراں ہیں ان فضیلتوں کی بناپر جو خدا نے بعض کو بعض پر دی ہیں اور اس بناپر کہ انہوں نے عورتوں پر اپنا مال خرچ کیا ہے، پس نیک عورتیں وہی ہیں جو شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں ان چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہیں جن کی خدا نے حفاظت چاہی ہے اور جن عورتوں کی نافرمانی کا خطرہ ہے انہیں موعظہ کرو اور انہیں خوابگاہ سے الگ کردو[۱]۔"

یہی بات ایک دوسری آیت میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

> "اور عورتوں کے لئے ویسے ہی حقوق بھی ہیں جیسی ذمہ داریاں اور مردوں کو ان پر ایک امتیاز حاصل ہے اور خدا صاحب عزت و حکمت ہے[۲]۔"

اسلام نے مرد و عورت میں توازن قائم کرنے کے بعد کہ ایک کو مہر و نفقہ کا پابند بنایا اور دوسرے کو اطاعت کا یہ اعلان کیا کہ مرد کو ایک امتیاز حاصل ہے اور وہ ہے حق طلاق جو درحقیقت اس کی نگرانی، کفالت

۱۔ سورہ نسا، آیت ۳۴

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۲۸

اور ذمہ داریوں کا نتیجہ ہے، الگ سے کوئی بات نہیں ہے۔ خاندانی زندگی میں مرد کی برتری کو تسلیم کر کے عورت نان ونفقہ، رہائش، مہر، حفاظت وصیانت اور تعلیم وتربیت وغیرہ بہت سے حقوق سے بہرہ مند ہوتی ہے۔ ان حقوق کی ادائیگی میں مرد کوتاہی کرے تو از روئے قانون وہ انہیں حاصل کر سکتی ہے بلکہ اسلام نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ مرد نہ صرف اپنی بیوی کے قانونی حقوق ادا کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک اختیار کرے۔ بعض اوقات بیوی کی شکل وصورت مزاج اور عادات انسان کو ناپسند ہوتے ہیں جس کا اثر شوہر کے روابط وتعلقات پر پڑ سکتا ہے اس طرح کے مواقع پر شوہر کو بیوی کے اچھے پہلوؤں کو بھی دیکھنا چاہئے، اس کی ایک بات ناپسندیدہ ہو تو دس باتیں قابل تعریف ہو سکتی ہے۔ اس کی شرافت ہی کا نہیں حکمت ودانائی کا بھی تقاضا یہ ہے کہ گھر کے وسیع مفادات کو پیش نظر رکھے اور تعلقات کو خراب نہ کرے کہ باہمی روابط میں مٹھاس کی جگہ تلخی پیدا ہو جائے اور گھر کا ماحول فساد کی آماجگاہ بن جائے۔ بعض اوقات انسان کو ایک چیز ناگوار ہوتی ہے لیکن اسی میں خیر کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں اسلام نے جس اعلیٰ اور مثالی رویہ کی تلقین کی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی۔ ارشاد ہوتا ہے:

> "اے ایمان والو! تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جبراً عورتوں کے وارث بن جاؤ اور خبردار انہیں منع بھی نہ کرو کہ جو کچھ ان کو دیدیا ہے اس کا کچھ حصہ لے لو مگر یہ کہ واضح طور پر بدکاری کریں اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرو اب اگر تم انہیں ناپسند بھی کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اسی میں خیر کثیر دیدے[۱]۔"

زمانہ جاہلیت میں چند ظالمانہ طریقے رائج تھے جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے اور انہیں کا اسلام نے سدباب کیا ہے۔ مثلاً سوتیلی اولاد باپ کی منکوحہ کے سر پر کپڑا ڈال کر اسے میراث بنا لیتی تھی۔ سوتیلی ماں کے تمام ترکہ پر قبضہ کر لیا جاتا تھا اور اسے خود اس کے شوہر کے ترکہ سے بھی محروم کر دیا جاتا تھا۔ اسے عقد ثانی بھی نہیں کرنے دیتے تھے کہ اس طرح اپنا مال بھی لیکر چلی جائے گی۔ عقد ثانی کی اجازت اس شرط کے ساتھ دیتے تھے کہ وہ مال چھوڑ دے اور چلی جائے۔ عورتوں پر اس غرض سے سختی کرتے تھے کہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے کل مہر یا کچھ مہر وغیرہ واپس کر دیں۔

۱۔ سورہ نساء، آیت ۱۹

اسلام نے مذکورہ تمام صورتوں پر عورت کے احترام اور اس کے حقوق کے تحفظ کی غرض سے پابندی لگادی اور یہ طے کردیا کہ دولت وثروت کی خاطر کسی طرح کا جبر واکراہ جائز نہیں ہے اور اگر وہ بدکاری بھی کریں تو بھی ان کے ساتھ معاشرت کا برتاؤ صحیح اور مناسب اور اصول کے دائرہ میں ہونا چاہئے جس میں کس طرح کا جبر اور ظلم نہیں ہونا چاہئے۔ اسلام کے نزدیک زوجین کے باہمی تعلقات کی معیاری شکل یہ ہے کہ وہ کش مکش اور تنازعات سے پاک ہو، بیوی شوہر کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرے، جائز امور میں اس کی اطاعت کرے اور اس کی عزت وناموس اور مال وجائداد کی حفاظت کرے۔ دوسری جانب شوہر اس طرح کی نیک اور صالح بیوی کو بہترین متاع حیات اور حاصل زندگی سمجھے اور اس کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے۔ آنحضرت سے راوی نے عرض کیا نیک اور صالح عورت کے کیا صفات ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جب شوہر اسے دیکھے تو خوش ہوجائے، جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور اپنے ناموس اور اس کے مال (کی حفاظت کرے اور ان) میں اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔

اس بات سے بخوبی اندازہ لگاجاسکتا ہے کہ اسلام شوہر اور زوجہ کے درمیان کس طرح کے تعلقات دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ تعلقات وجود میں آجائیں تو دونوں ایک دوسرے کے بہی خواہ ہوجائیں گے۔ ان کی باہمی زندگی خوشگوار اور مثالی ہوگی اور حقوق واختیارات کے وہ ناپسندیدہ مسائل جن کے باعث خانگی زندگی تباہ وبرباد ہوجاتی ہے وہ پیش ہی نہیں آئیں گے۔

نان ونفقہ شوہر کی ذمہ داری ہے

اسلام کے نزدیک ازدواجی تعلقات فقط جنسی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق ہیں جو انہیں حاصل ہوں گے۔ اسی طرح دونوں کی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کے وہ پابند ہوں گے۔ اسلام نے آدمی کی حیثیت کے مطابق بیوی کے نان ونفقہ رہائش اور دیگر ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری مرد ہی پر ڈالی ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

> "جس شخص کو وسعت حاصل ہے وہ اپنی وسعت کے مطابق (بیوی پر) خرچ کرے اور جس کو نپی تلی روزی ملی ہے وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے دیا ہے۔ اللہ

نے جس کسی کو جتنا دیا ہے اس سے زائد کی وہ اس پر ذمہ داری نہیں ڈالتا۔اللہ مشکل کے بعد جلد آسان (بھی) فرمائے گا۔"[۱]

مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشی تگ ودو کرے، بیوی کا نان ونفقہ برداشت کرے، گھر اور اس کا ضروری ساز وسامان فراہم کرے اور عورت گھر کا نظم ونسق سنبھالے اور اسے بہترین گھر بنائے۔

مہر کے متعلق شہید مطہری نے " نظام حقوق زن در اسلام " عنوان کے تحت حسب ذیل افادہ فرمایا ہے جسے ہم تلخیص کے طور پر تحریر کر رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

اس موقع پر مرد عورت کی خدمت میں پیش کش کرتا ہے جس میں والدین میں سے کسی کا حق نہیں ہوتا۔ جیسے ہی عورت مرد سے پیش کش کو حاصل کرتی ہے اپنے اقتصادی استقلال کی نگراں ومحافظ بن جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اپنے ارادہ واختیار سے شوہر کا انتخاب کرتی ہے نہ کہ اپنے والد اور برادر کے ارادے سے دوسرے یہ کہ جب تک وہ والد کے گھر میں ہوتی ہے اسی طرح جب تک وہ اپنے شوہر کے گھر میں ہوتی ہے کسی کو اس سے خدمت لینے کا حق نہیں ہے۔[۲]

طلاق

اسلام طلاق کا سخت مخالف ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ جس قدر ممکن ہوسکے شوہر و زوجہ کے درمیان خوشگوار تعلقات وروابط برقرار رہیں البتہ اگر دونوں کے حالات اس مرحلہ کو پہونچ جائیں جہاں روابط کا باقی رہنا ناممکن ومشکل ہوجائے تو اس صورت میں اسلام نے دونوں کی علیحدگی کو تجویز کیا ہے اور اس علیحدگی کو مقررہ حدود وقیود اور تمام تر اخلاقیات کے ساتھ انجام پانا چاہئے۔

اسلام سے قبل طلاق کی کوئی حد نہیں تھی۔آدمی جتنی مرتبہ چاہتا اور جتنی مدت کے لئے چاہتا طلاق دیتا اور جتنی مدت بعد چاہتا عورت سے رجوع کرلیتا۔ اسلام نے اس پورے مسئلہ کو خاص رخ سے دیکھا اور ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا اور اس کا نیا راستہ نکالا۔اختلافات ہوں تو انہیں دور کرنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا اس کے باوجود اگر طلاق دینا ہی ضروری ہو تو دو مرتبہ وقفہ وقفہ سے طلاق دی جاسکتی ہے چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ سورہ طلاق، آیت ۷

۲۔ مرتضیٰ مطہری، نظام حقوق زن در اسلام، انتشارات صدرا تہران

”طلاق دو مرتبہ دی جائیگی اس کے بعد یا نیکی کے ساتھ روک لیا جائے گا یا حسن سلوک کے ساتھ آزاد کر دیا جائے گا اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ انہیں دیدیا ہے اس میں سے کچھ واپس لو مگر یہ کہ اندیشہ ہو کہ دونوں حدود الٰہی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو جب تمہیں یہ خوف پیدا ہو جائے کہ وہ دونوں حدود الٰہی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں کے لئے آزادی ہے۔ اس فدیہ کے بارے میں جو عورت مرد کو دے لیکن یہ حدود الٰہیہ ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا اور جو حدود الٰہی سے تجاوز کرے گا وہ ظالمین میں شمار ہوگا۔ پھر اگر تیسری مرتبہ طلاق دیدی تو عورت مرد کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ دوسرا شوہر کرے پھر اگر وہ طلاق دیدے تو دونوں کے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ آپس میں میل کریں۔ اگر یہ خیال ہے کہ حدود الٰہیہ کو قائم رکھ سکیں گے یہ حدود الٰہیہ ہیں جنہیں خدا صاحبان علم واطلاع کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے۔[1]

اسلام نے طلاق کو ان حالات میں جائز وقرار دیا ہے جہاں اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ اسلام نے ایسے شخص کو جو مسلسل ازدواج کرتا ہے اور پھر طلاق دیدیتا ہے خدا کا دشمن قرار دیا ہے۔ اس مقام پر شہید مطہری نے پیغمبر اور ائمہ علیہم السلام سے متعدد روایات نقل کی ہیں جن کا خلاصہ ہم نقل کر رہے ہیں۔

اصول کافی کی روایت ہے ایک شخص سے آنحضرت نے دریافت کیا تم نے اپنی زوجہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے عرض کی طلاق دیدی۔ آنحضرت نے دریافت کیا کیا تم نے اس سے کوئی بدی اور برائی دیکھی۔ عرض کی نہیں۔ اس شخص نے پھر سے ایک اور عقد کیا۔ آنحضرت نے پھر سوال کیا۔ اس عورت کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس نے عرض کی میں نے طلاق دیدی۔ اسی طرح تین مرتبہ اس شخص نے مختلف عورتوں سے عقد کیا اور انہیں طلاق دیدی۔ جب آخری مرتبہ آپ نے اس سے یہی سوال کیا کہ آیا تم نے اس میں کوئی برائی دیکھی تھی اور اس نے کہا نہیں تو آنحضرتؐ نے فرمایا خداوند عالم ایسے مرد اور عورت پر لعنت کرتا ہے اور انہیں دشمن رکھتا ہے جو مرد مسلسل عورت اور جو عورت مسلسل شوہر تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۲۹۔۲۳۰

دوسری روایت میں آنحضرتؐ کو خبر دی گئی کہ ابو ایوب انصاری نے اپنی زوجہ کو طلاق دینے کا مستحکم ارادہ کرلیا ہے جب کہ آنحضرت جانتے تھے کہ ان کا طلاق دینا کسی درست دلیل کی بنیاد پر نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا (ان طلاق ام ایوب لحوب) یعنی ام ایوب کی طلاق عظیم گناہ ہے۔

تیسری روایت کو شہید مطہری نے شیعہ اور سنی دونوں حضرات کی جانب سے تحریر کیا ہے کہ ما احل اللہ شیئاً ابغض الیہ من الطلاق، خداوند عالم نے کسی چیز کو طلاق کے مانند حلال قرار نہیں دیا کہ ساتھ ہی اس کا دشمن بھی ہے۔[۱]

عورت صنف نازک ہے۔ اسلام کی جانب سے تسلیم شدہ حقوق بھی بعض اوقات اسے پورے طور پر حاصل نہیں ہو پاتے۔ مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے اس پر پہلے بھی زیادتیاں ہوتی تھیں اور آج وہ کہیں آزادی کے نام پر تو کہیں پابندی کے نام پر مظالم کی زد پر ہے جبکہ اسلام نے اس کے کسی بھی پہلو کو تشنہ تشریح نہیں چھوڑا ہے اور اس سے متعلق تمام تر حقوق کی تشریح کر دی ہے، چاہے وہ بیٹی کی صورت میں ہو یا زوجہ کی شکل میں یا اپنے خانوادہ کے ہمراہ ہو، جس کے سپرد اس کی ذمہ داریاں ہیں۔ خداوند عالم تمام عالم اسلام کو خواتین کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق عنایت فرمائے۔ والسلام۔

۱۔ نظام حقوق زن در اسلام ص ۳۰۴۔۳۰۵

نظم

انکسار حیدر کا

احمد شہریار

کبھی حریف پہ ہوتا ہے وار حیدر کا
تو ہاتھ چومتی ہے ذوالفقار حیدر کا

امیر، حضرت سجاد اور رضا و نقی
علی کے نام میں ہے لطف چار حیدر کا

یہ کہہ کے بنتِ اسد نے رکھا حرم میں قدم
ہے منتظر کوئی دیوار پار حیدر کا

میں بار بار پکاروں گا: یا علی مددی !
ارادہ میرا ہے اور اختیار حیدر کا

یہ چاند ٹھیک وسط سے ہوا ہے دو ٹکڑے
یہ معجزہ ہے نبی کا کہ وار حیدر کا

بچھی ہوئی ہے زمیں اب بھی اس امید کے ساتھ
کبھی تو آئے گا دلدل سوار حیدر کا

ابوتراب لقب پا کے عرش پر پہنچے
بڑے عروج پہ ہے انکسار حیدر کا

کہا کہ: کون ہے یہ شہریار نامی شخص
کہا: غلام ہے یہ خاکسار حیدر کا

نبی کی خو ہیں علی

شاہد کمال

نبیؐ ہیں جسم تو اُس جسم میں لہو ہیں علیؑ — اگر نماز محمدؐ تو پھر وضو ہیں علیؑ
جو رقص میں تھی ازل سے لب مشیت پر — نبیؐ کے دل کی وہ دیرینہ آرزو ہیں علیؑ
وہ گونجتا ہے لہو بن کے دل کی دھڑکن میں — قسم خدا کی قریب رگ گلو ہیں علیؑ
نگاہ ڈال ہر اک کم نسب کے چہرے پر — کہ آج پھر مرا موضوع گفتگو ہیں علیؑ
ہے اس کا نقش قدم تیرے ارتقا کا جواز — اے کائنات تری قوت نمو ہیں علیؑ
کھلی کتاب ہیں سمجھو اگر اسے ورنہ — خود اہل حق کے لئے حرف جستجو ہیں علیؑ
علیؑ کچھ ایسے محمدؐ کی ذات میں ضم ہیں — نبیؐ کو دیکھ کے لگتا ہے ہُو بہو ہیں علیؑ
جو اک زمانے کو سیراب کر، تا رہتا ہے — خود اپنی ذات میں اک ایسا آبجو ہیں علیؑ
اسی کے دم سے ہے انسانیت کو حرف دوام — قبائِ فکر دریدہ ترا رفو ہیں علیؑ
بدن کا جس کے پسینہ گلوں کا زیور ہے — بجا نہیں ہے یہ کہنا کہ مُشک و بُو ہیں علیؑ
خدا کی ذات پہ آیات وبینات ہیں یہ — علیؑ کا طرز محمدؐ نبیؐ کی خُو ہیں علیؑ
نجابتوں کے سبھی سلسلے اسی سے ہیں — اے شہزادئ عصمت ترا "کفو" ہیں علیؑ
یہی نجات دہندہ ہیں آدمیت کے — خدا نے جس کو کہا ہے وہ "تفلحو" ہیں علی
ہر ایک بوند سے جس کے اُبل رہی ہے حیات — "مئے الست" ہے جس میں وہی سبو ہیں علی

یہ پستیوں کا تصور علیؑ کی ذات کے ساتھ !
علیؑ عُلا ہیں ، علیؑ ہیں علیؑ ، عُلو ہیں علیؑ

قیام عدل پہ کرتے ہیں دشمنوں سے نَبرد
دم مصاف بھی اک ایسے جنگجو ہیں علیؑ

پلا رہے ہیں وہ شربت خود اپنے قاتل کو
بھلا کب اپنے عدو کے لئے عدو ہیں علیؑ

یہ تذکرے ہیں اُسی کی حکاتیں اُس کی
کہ آج سینہ بہ سنہ ہیں "کو بکو" ہیں علیؑ

بتا رہا ہے یہی دعویٰ "سلونی" خود
یہ "اہل ذکر" ہیں معنیٔ "فسئلو" ہیں علیؑ

منافقوں کو یہی تو گراں گزرتا ہے
ہر اک محاذ پر دیکھو تو سرخرو ہیں علیؑ

ہر ایک بات کا اک اختتام ہوتا ہے
کبھی جو ختم نہ ہوگی وہ گفتگو ہیں علیؑ

کرو سوال نکیرین اب اجازت ہے
کہ میری قبر میں اب میرے روبرو ہیں علیؑ

مرے سخن کو وہی اعتبار دیتے ہیں
میرے حریف سخن میری آبرو ہیں علیؑ

غدیر میں

مہدی باقر معراجؔ

ارشادِ حق، ارادۂ یزداں غدیر میں
پورے ہوئے رسول کے ارماں غدیر میں

دستار و کج کلاہی کا طوفان تھم گیا
ہے تاج پوش، فخر سلیماں غدیر میں

صبح امید ہے پئے اربابِ ولایت
ہے دشمنوں کی شام غریباں غدیر میں

بعد رسول، دین خدا کو ہوا نصیب
اک کربلا میں ایک نگہباں غدیر میں

قرآں کو محافظ ملا اسلام کو وارث
ایمان ہوا صاحب ایماں غدیر میں

دستِ علی کے لطف و کرم سے نبی کے
سلجھی ہے تیری زلف پریشاں غدیر میں

بدر و حنین میں نہ کسی اور جنگ میں
تبلیغ دین حق ہے نمایاں غدیر میں